کردار ساز

بریگیڈیئر محمد رفیق کی داستان حیات

(کردار کے حوالے سے)

سعید راشد

کردار ساز بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

انتساب

ان تمام رفیقوں کے نام جو بیرکوں، درسگاہوں، دفتروں............

غرض کارزارحیات کی ہرمنزل............میں کردار کی جنگ لڑ رہے ہیں

بغیر حوصلہ ہارے، اپنے اپنے حصے کی ہزار رکاوٹوں اور چیلنجوں کے باوجود

............گویا آندھیوں میں چراغ جلا رہے ہیں۔ یہ باہمت باضمیر لوگ

یاحیّ یاقیوّم

ان کے دلوں کو طمانیت، قدموں کو استقامت اور ان کے عزائم کو صلابت عطا فرما۔

ان سب کو میرا سلام پہنچے۔ رفیق صاحب ایسے باکردار انسان کی یاد میں یہ

کتاب میں ان سے منسوب کرتا ہوں۔

سعید راشد

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

فہرست عنوانات

باب دوم

شخصیت و کردار

احباب و رفقاء کار کی نظر میں

۱۔ اک گوہر شب چراغ تھا نہ رہا

کلاس فیلو..........مسٹر ابو النصر کی یادیں

۲۔ ایک قابل فخر شاگرد

استاد..........مسٹر عبد الحمید قریشی کے تاثرات

۳۔ مائیں ایسے بچے کبھی کبھی جنتی ہیں

یار غار..........لیفٹینینٹ کرنل (ر) محمد علی انصاری کے احساسات

۴۔ نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

پہلے کمپنی کمانڈر..........میجر جنرل (ر) مظفر الدین کا تبصرہ

۵۔ کیسے کیسے لوگ اٹھتے جاتے ہیں

ہمدم و ہم مشرب..........لیفٹینینٹ کرنل (ر) نذیر احمد کی آہ سرد

۶۔ کلاسیکی افسر کا جیتا جاگتا نمونہ

رزمک کے ایک ساتھی افسر..........میجر (ر) مولا بخش کا تاثر

پی ایم اے کی میٹھڑ افسری کی صدائے بازگشت؟

۷۔ جنزل (ر) محمد اقبال خان نشان امتیاز، ستارۂ بسالت

۸۔ کرنل (ر) مسعود قمر

۹۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) سلطان بادشاہ

۱۰۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) توقیر حسین

۹ پنجاب کی نائب کمانداری

۱۱۔ بریگیڈیئر (ر) اقبال شفیع

جے، ایس، پی، سی، ٹی، ایس کوئٹہ کی چیف انسٹرکٹری

۱۲۔ بریگیڈیئر (ر) اے کیو شیر ہلال جرأت

۱۳۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد شعیب اخوندزادہ ایف ایف آر

ملٹری کالج جہلم کی سربراہی کی داستان

(رفقاءکار کی زبانی)

یادوں کے دریچے

عالمگیرنز کی یادیں

۱۔ ۸۷۸ لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد اصغر راجہ

۲۔ ۱۳۹۴ میجر (ر) عمر حیات

۳۔ ۱۴۶۹ بریگیڈیئر منظور حسین، امتیازی سند

۴۔ ۱۴۷۷ کرنل (ر) محمد افضل

۵۔ ۱۵۰۰ میجر محمد صفدر

۶۔ ۱۵۰۵ تنویر احمد سید انجینئر

۷۔ ۱۵۱۹ لیفٹیننٹ کرنل (ر) رب نواز

۸۔ ۱۵۲۰ راجہ محمد اعظم، ٹیکنیکل مینجر پی ٹی سی جہلم

۹۔ ۱۵۵۲ بریگیڈیئر محمد مشتاق

۱۰۔ ۱۵۵۹ اللہ داد خان، ڈپٹی سیکرٹری منسٹری آف ایجوکیشن

۱۱۔ ۱۵۸۰ کرنل محمد گلستان

۱۲۔ ۱۵۸۹ میجر محمد صادق

۱۳۔ ۱۶۰۶ کرنل (ر) محمد یونس

۱۴۔ ۱۶۲۲ نذیر احمد۔ حیدرآباد

۱۵۔ ۱۶۲۳ لیفٹیننٹ کرنل (ر) اختر حسین

۱۶۔ ۱۶۲۸ بریگیڈیئر (ر) محمد اکرم

۱۷۔ ۱۶۴۰ عبدالحفیظ۔ صنعت کار، کراچی

۱۸۔ ۱۶۵۶ منصور احمد۔اسلام آباد

۱۹۔ ۱۶۸۵ عبدالقدوس۔واہ

۲۰۔ ۱۶۹۰ میجر (ریٹائرڈ) محمد ریاض

۲۱۔ ۱۶۹۲ لیفٹیننٹ کرنل (ر) مہدی حسن

۲۲۔ ۱۷۰۰ راجہ محمد افضل۔اسلام آباد

۲۳۔ ۱۷۱۰ محمد یونس کیانی۔واہ

۲۴۔ ۱۷۳۳ وارنٹ آفیسر اورنگ زیب خان

۲۵۔ ۱۷۳۸ بریگیڈیئر (ر) سلطان احمد ستارۂ جرأت دوبار

۲۶۔ ۱۷۳۹ لیفٹیننٹ جنرل پیرداد خان۔ستارۂ جرأت۔ستارۂ بسالت

۲۷۔ ۱۸۰۸ صوبیدار محمد اکرم اے ای سی

۲۸۔ ۱۸۰۹ بریگیڈیئر محمد عالم

۲۹۔ ۱۸۲۱ شوکت جنجوعہ

۳۰۔ ۱۸۲۶ میجر جنرل محمد اکرم

۳۱۔ ۱۸۴۹ لیفٹیننٹ کرنل اللہ داد خان

۳۲۔ ۱۸۵۱ میجر محمد اختر

۳۳۔ ۱۸۵۶ عنایت خان بھٹی انجینئر

۳۴۔ ۱۸۵۹ ونگ کمانڈر مسعود احمد خان

۳۵۔ ۱۸۶۲ لیفٹیننٹ جنرل رحم دل بھٹی

۳۶۔ ۱۸۶۶ لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد قربان فارن سروس

۳۷۔ ۱۸۷۰ بریگیڈئیر سلطان جہانگیر

۳۸۔ ۱۸۷۱ کموڈور (ر) سجاد حیدر بخاری

۳۹۔ ۱۸۷۳ عزیز احمد۔ بینکر کویت

۴۰۔ ۱۸۷۷ کرنل محمد اقبال

۴۱۔ ۱۸۸۸ بریگیڈئیر عبدالرؤف

۴۲۔ ۱۸۹۴ لیفٹیننٹ کرنل (ر) احمد جان

۴۳۔ ۱۹۱۲ بریگیڈیئر محمد ایوب ملک

۴۴۔ ۱۹۳۱ لیفٹیننٹ کرنل (ر) عطا محمد

۴۵۔ ۱۹۶۸ میجر (ر) محمد نواز

۴۶۔ ۱۹۸۱ عبدالحکیم۔ انسپکٹر پولیس

۴۷۔ ۱۹۸۲ لیفٹیننٹ کرنل ولی احمد خان

۴۸۔ ۱۹۸۳ رشید گل۔ اسلام آباد

۴۹۔ ۲۰۰۰ ڈاکٹر سرفراز مرزا۔ پی ایچ ڈی

۵۰۔ ۲۰۱۵ میجر جنرل (ریٹائرڈ) طارق نظامی

۵۱۔ ۲۰۴۸ بریگیڈئیر محمد اقبال

۵۲۔ ۲۰۵۳ شربت خان محسود۔ ایس وی پی (اے بی ایل)

۵۳۔ ۲۰۶۷ لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر

۵۴۔ ۲۰۷۹ لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف

۵۵۔ ۲۰۸۳ راجہ حامد نواز ڈی ایس پی

۷۵۔ ۲۲۴۴ لیفٹیننٹ کرنل محمد اسحاق

۷۶۔ ۲۲۵۹ لیفٹیننٹ کرنل عبدالجلیل

۷۷۔ ۲۲۶۲ لیفٹیننٹ کرنل منیر احمد افضل امتیازی سند

۷۸۔ ۲۲۹۰ کیپٹن (نیوی) گل زمان۔ستارۂ جرات

۷۹۔ ۲۳۱۵ کیپٹن (نیوی) سکندر حیات ستارہ جرات

۸۰۔ڈی ایس ۳ جاوید حسن علی سول سروس

۸۱۔ ۲۳۱۹ سلیم اختر کیانی سول سروس

۸۲۔ ۲۳۴۵ کرنل اخلاق احمد

۸۳۔ ۲۳۵۳ نثار کیانی (پی آئی اے)

۸۴۔ ۲۳۵۸ لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد

۸۵۔ ۲۳۶۵ لیفٹیننٹ کرنل غلام سرور

۸۶۔ ۲۳۶۷ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) اقبال شاہین

۸۷۔ ۲۳۸۰ ضمیر حسین۔چیف انجینئر واپڈا

۸۸۔ ۲۳۸۱ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) وکیل خان آفریدی سول سروس

۸۹۔ ۲۳۸۸ جمیل اختر راجہ۔صنعت کار

۹۰۔ ۲۴۰۲ وائس ایڈمرل (نیوی) محمود علی ڈوگر

۹۱۔ ۲۴۱۱ میجر (ریٹائرڈ) محمود اختر شاہین

۹۲۔ ۲۴۱۲ اصغر علی خان چیف سائنٹسٹ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن

۹۳۔ ۲۴۱۵ محمد یونس۔صنعت کار کراچی

۹۴۔ ۲۴۲۵ لیفٹیننٹ کرنل نصیر عابد

۹۵۔ ۲۴۲۶ لیفٹیننٹ جنرل نعیم اکبر خان۔امتیازی سند

۹۶۔ ۲۴۲۸ بریگیڈیئر مقصود الحسن تمغہ امتیاز (ملٹری)

۹۷۔ ۲۴۳۳ ممتاز اختر۔چیف انجینئر واپڈا

۹۸۔ ۲۴۳۹ نصیر پرچہ انجینئر

۹۹۔ ۲۴۵۳ میجر (ریٹائرڈ) سلیم اصغر

۱۰۰۔ ۲۴۶۶ محمد تاج خٹک سول سروس

۱۰۱۔ ۲۴۶۹ بریگیڈیئر ذولفقار علی شاہ بخاری

۱۰۲۔ ۲۴۷۶ لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

۱۰۳۔ ۲۴۷۹ بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

۱۰۴۔ ۲۴۸۴ بریگیڈیئر سعید بیگ

۱۰۵۔ ۲۴۹۴ میجر (ریٹائرڈ) احسان قادر

۱۰۶۔ ۲۴۹۵ میجر یار افضل آفریدی

۱۰۷۔ ۲۵۰۱ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) اقتدار علی

۱۰۸۔ ۲۵۲۲ کیپٹن (ریٹائرڈ) مشتاق فرید کیانی

۱۰۹۔ ۲۵۳۵ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سرفراز انور

۱۱۰۔ ۲۵۴۵ بریگیڈیئر خالد مسعود

۱۹ پنجاب کی کمانداری اور دیر باجوڑ آپریشن

۱............ بریگیڈیئر عبدالقیوم چوہدری کا تبصرہ

۲............ آنریری کیپٹن لال خان کی یادیں

۳............ لیفٹیننٹ کرنل نصیر محمود۔ پنجاب رجمنٹ

۴............ لیفٹیننٹ کرنل محمد مسعود خان۔ پنجاب رجمنٹ

۵............ دیر باجوڑ آپریشن کا پہلا مرحلہ

۶............ دیر باجوڑ آپریشن کا معرکہ

بریگیڈیئر رب نواز خان

میجر جنرل ممتاز علی ستارۂ جرأت (دو بار)

۷............ دیر باجوڑ آپریشن کے دور کے شب و روز

بریگیڈیئر رب نواز خان

میدان کارزار میں

۱۶ اے کے بریگیڈ کی کمانداری

گورنرز انسپکشن ٹیم کی سربراہی اور شیخ مجیب الرحمٰن کا مقدمہ

۲............میجر جنرل محمد جمشید۔ستارۂ جرأت،ایم سی (دوبار)

۳........۲۱۹۶ لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر

۴........لیفٹیننٹ کرنل عبدالحئی ۔سگنلز

....

لارنس کالج گھوڑاگلی کی پرنسپلی

۱........لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) عبدالمجید ملک

۲.......پروفیسر محمد موجود کیانی

۳............خورشید وارسل جنجوعہ

۴............جناب اقبال احمد خان

۵............جناب نعیم فریدی

۶............جناب محمد مغیث

۷............جناب محمد رشید چیف اکاؤنٹنٹ

۸............رضوان اکبر

۹............کیپٹن ڈاکٹر مظہر اسحاق

۱۰............جامہ صاحب (ہیڈ سوئیپر)

ڈوبتے سورج کا منظر

۱ ۲۴۱۲ اصغر علی خان

۲.........................صوبیدار محمد اکبر

۳ ۲۰۹۲ بریگیڈیئر رب نواز خان

۴ ۱۸۲۱ شوکت جنجوعہ

۵..................موجود کیانی

۶ ....لیفٹیننٹ کرنل توقیر حسین

۷...........کرنل ڈاکٹر ارشد حسین

باب سوم

کاروان زندگی

پیش لفظ

لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال ہلال امتیاز (ملٹری) ستارۂ بسالت

یہ کتاب ایک غیر معمولی انسان کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک ایسا انسان جس سے ملنے اور جس کے ساتھ کام کرنے کے بعد کوئی شخص اسے فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے کردار میں چند ایسی خوبیاں تھیں جو دوسروں کے لئے مثال بن گئی ہیں۔ جس کی زندگی ایک روشنی بھی ہے اور ایک چیلنج بھی۔ بڑے آدمی اور معمولی آدمی میں ایک فرق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بڑے آدمی کی شخصیت کی تعمیر میں اس کی اپنی جدوجہد کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے میلانات اور جذبات پر عام لوگوں سے زیادہ قابو رکھتا ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے اپنی ذات کو فنا کر ڈالا ہو تو کبھی کبھی اس کی ذات بیرونی اثرات کے سامنے چٹان کی طرح اٹل بن جاتی ہے۔ بریگیڈیئر رفیق کی شخصیت بھی ایک مسلسل جدوجہد کی علامت تھی۔ اگر ایک لفظ سے ان کا تعارف کرانا ممکن ہو تو میرے خیال میں وہ ایک لفظ ''معلم'' ہوگا۔ معلم سے میری مراد اس کا لفظی مفہوم نہیں بلکہ ایک ایسا شخص ہے جو لوگوں کے ''اندر کی روشنی'' کو باہر لاتا ہے جو لوگوں کو بلندیوں کی راہیں دکھاتا ہے، جو دلوں کو (اقبال کے الفاظ میں) سوز و ساز آرزو اور ذوق و شوق کی حرارت سے بھر دیتا ہے۔ جو خود کسی مقصد کا دیوانہ ہوتا ہے اور دوسروں میں بھی ایسی ہی خوبصورت دیوانگی پیدا کرتا ہے۔ سماجی مقام کے اعتبار سے رفیق صاحب ایک فوجی افسر تھے۔ لیکن ان کی زندگی عام انسانوں کے لئے اسی طرح ایک انسپائریشن ہے جیسے کسی بڑے قائد، سیاستداں'' معلم اخلاق یا ماہر تعلیم کی زندگی۔ عموماً ایک فوجی کمانڈر کے حالات زندگی کا مطالعہ اس کی پیشہ ورانہ مہارت اور اس کے جنگی کارناموں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ اگر اس کے کردار میں اسکے علاوہ بھی کچھ خوبیاں قابل ذکر سمجھی جاتی ہیں تو عموماً وہی جن کا تعلق فوجی قیادت اور سپاہ سے اپنے منصوبوں کی تکمیل کرانے کی صلاحیت سے ہو۔ لیکن رفیق مرحوم ایک کامیاب فوجی قائد ہی نہیں ایک بڑے انسان بھی تھے۔ وہ صاحب کردار

ہی نہیں بلکہ کردار ساز بھی تھے۔ جنہیں ان کے زیر قیادت رہنے کا موقع نصیب ہوا، ان کے کردار اور شخصیت پر رفیق صاحب کا زبردست اثر ہوا۔ اس بات میں مبالغہ نہیں کہ رفیق صاحب کے ہزاروں پرستار ہیں۔ وہ جہاں بھی رہے دلوں پر حکومت کی۔ وہ "قہاری وغفاری" کا ایک عجیب امتزاج تھے۔ میر کے الفاظ میں

فلک برسوں پھرتا ہے۔ تب کہیں ایک ایسا انسان جنم لیتا ہے۔

یقیناً عام قارئین بھی ایسی شخصیت سے آشنا ہونے کا حق رکھتے ہیں جس کے حالات زندگی میں روشنی اور ولولے کا اتنا سامان موجود ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں پروفیسر سعید راشد صاحب نے جتنی کاوش کی ہے اور جس سرگرمی کے ساتھ تمام ماخذوں سے فائدہ اٹھایا ہے اسے کوہ کنی ہی کہنا چاہئے۔ مرحوم کی زندگی کے ہر دور سے متعلق جتنے بھی اشخاص اور احباب کے تاثرات انہیں حاصل ہو سکے اس کتاب میں جمع کر دیئے۔ پروفیسر سعید راشد صاحب کی ثابت قدمی اور لگن کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ ایسے حضرات نے بھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جن سے کچھ تحریر کرانا اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا کسی نادہندہ سے قرض واپس لینا۔ چند الفاظ اس کتاب کی ہیئت اور تکنیک کے بارے میں بھی عرض کرنا ضروری ہیں۔ اس میں پروفیسر راشد نے وہی تکنیک اختیار کی ہے جو ان کی دوسری سوانحی کتابوں میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ یعنی مختلف اشخاص سے ملاقاتیں کر کے یا سوالنامے بھیج کر بریگیڈیئر رفیق مرحوم کے بارے میں نہایت مفید اور اہم تفصیلات اخذ کی گئی ہیں۔ اردو سوانح عمریوں میں یہ تکنیک کہیں اور میری نظر سے نہیں گزری۔ سوانح نگاری کا یہ اسلوب تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہے۔ اس کی تکنیک میں ایک خوبی تو اس کا تنوع اور رنگا رنگی ہے جس نے اسے خاصا دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس طرح کا اظہار قاری کی توجہ اور تجسس کو گرفت میں لے لیتا ہے، دوسرا وصف یہ ہے کہ ممدوح کی ہر خصوصیت کو ٹھوس واقعات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا تجزیہ اس قدر مختلف سطحوں اور زاویوں سے

سامنے آتا ہے کہ ان کی ایک جامع، بھرپور اور جاندار تصویر ابھر آئی ہے۔ اسے تین سطحوں والا منظر کہا جاسکتا ہے۔ مختلف افراد کے زاویہ نظر الگ الگ ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ رفیق صاحب کی عظمت اور خلوص نیت پر سب متفق ہیں۔ ان تاثرات کو موضوعی تو کہا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے تاثرات تو ہوتے ہی ذاتی اور موضوعی ہیں۔ لیکن ان پر جانبداری کا الزام لگانا مشکل ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اگرچہ ان تاثرات کا انداز تحسین اور اعتراف عظمت کا ہے تاہم ان میں ممدوح کی بشری کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کتاب میں فطری طور پر ملٹری کالج کے سابق طلبہ اور اساتذہ کے تاثرات کا حصہ نسبتاً زیادہ ضخیم ہے۔ کیونکہ جتنی وضاحت، گہرائی اور خلوص سے ان کے زیر تربیت پروان چڑھنے والی یہ نسل ان کی ذات پر روشنی ڈال سکتی ہے وہ دوسروں کے لئے شاید ہی ممکن ہو۔ آخری حصے میں مرحوم کے اہل خاندان سے گفتگو کر کے انکی گھریلو زندگی کے بارے میں قیمتی معلومات اکٹھی کی گئی ہیں جن سے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جس خلوص، محنت اور لگن سے مرتب کی گئی ہے۔ اتنی ہی گرم جوشی اور دلچسپی سے اس کی پذیرائی ہوگی اور اس سے نئی نسل ہمارے اندازے سے زیادہ فیض اٹھائے گی۔

محمد اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

عام لوگ بعض صفات کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن کے حوالے سے صفات اور اقدار پہچانی جاتی ہیں اور جو ان صفات اور اقدار کی علامت بن جاتے ہیں۔ بریگیڈئیر محمد رفیق کو بھی یہ امتیاز حاصل تھا۔ وہ بعض اخلاقی اقدار اور قیادتی رویوں کی پہچان بن گئے تھے۔ جو شخص ان کو تھوڑا بہت بھی جانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ دیانت کسے کہتے ہیں۔ اور جرأت کردار کیا چیز ہوتی ہے اور جس نے انہیں کمان کرتے دیکھا ہے وہ ان کے حوالے سے جانتا ہے کہ قیادت کا جوہر کیا ہے اور قیادت کیسے کی جاتی ہے اور جس نے ان کی سربراہی میں کام کیا ہے اس نے ان سے یہ بھی سیکھا ہے کہ اصولوں کا اطلاق، حالات اور اشخاص پر کس طرح کرتے ہیں اور قہاری کو غفاری سے کیسے شیر و شکر کرتے ہیں۔ کسی کاز سے وفاداری کیا معنی رکھتی ہے اور سینئرز سے وفاداری کی حدود کیا ہوتی ہیں اور جونیئرز سے وفاداری کا مفہوم کیا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان سے محبت کی سعادت سے ذاتی اور منصبی زندگی میں کیسے عہدہ برآ ہوا جاتا ہے۔ کسی فانی انسان کا سب سے بڑا اعزاز یہی ہے کہ وہ ایک ادارہ، ایک روایت، ایک علامت بن جائے۔ رفیق صاحب کی شخصیت و کردار کا کمال یہی ہے کہ وہ قیادت و کردار کی ایک علامت و روایت بن گئے ہیں۔ ان کے حوالے سے ان کے شاگردوں اور رفقاء کار نے بہت انسپائریشن حاصل کیا۔ قیادت کے اسرار و رموز کو سمجھا اور ان کے کردار سے بہت روشنی حاصل کی۔

یہ کتاب کردار ساز، ان کی سوانح حیات سے زیادہ ان بنیادی قدروں اور قیادتی رویوں کی داستان ہے جو ان کی شخصیت میں مرتکز ہو گئے تھے اور جن کو ابھارنا، مستحکم کرنا اور ترویج دینا ایک مقصد وحید ہے۔ اسی لئے اس کتاب میں ان کی کمزوریوں کو فوکس میں نہیں لایا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے بھی کہ وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ وہ خود ان سے بلند ہوتے گئے اور آخر میں جو شخصیت نکھر کر سامنے آئی وہ اس سے بالکل مختلف تھی جس کی جھلک ان کی ابتدائی زندگی کے شب و روز میں نظر آتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمیں اس شخصیت و کردار سے غرض ہے جو عملی طور پر ہمارے لئے اور آئندہ نسلوں کے لئے انسپائریشن کا سرچشمہ ہوسکتی ہے۔ یہ کتاب مجلس یادگار رفیق، جس کے چیرمین ایک قابل فخر عالمگیرین، ۱۳۳۲ لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال ہیں، کے ایماء پر مرتب کی گئی ہے اور یہی مجلس اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کر رہی ہے۔ میں اس مجلس کے اراکین کو اور ان تمام لوگوں کو جنہوں نے قدمے۔ درمے۔ سخنے اس قومی اہمیت کے کام کو فروغ دینے میں حصہ لیا، تہہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ دیئے جلاتے رہنا ایک اہم انسانی اور قومی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی سعادت جس کو بھی ملے یہ اس کی خوش بختی ہے۔ اللہ تعالی کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مجھے بھی اس کارخیر میں اپنے حصے کی خدمت کا موقعہ ملا ہے۔ الحمد اللہ! اس کتاب میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے اس کی وجہ سے خاص طور سے بے شمار لوگوں سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ ان سب نے بڑے خلوص اور جذبے سے اس کام میں مجھ سے تعاون کیا۔ فرداً فرداً اور نام بہ نام تو ان تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں۔ سب اس محفل میں شریک ہیں ...... میں ان سب کا اجتماعی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کسی اچھے کام میں تعاون کرنا خود اپنی جگہ ایک اچھائی ہے۔ اللہ تعالی ان سب کو جزا دے۔ پھر بھی بریگیڈئیر محمد رفیق کے صاجزادے کرنل ریاض الحق کا میں بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔ کرنل ریاض نے نہ صرف اپنے گھر والوں سے انٹرویو کا اہتمام کیا بلکہ بڑی تگ و دو کے بعد میجر جنرل مظفرالدین، کرنل انصاری، مسٹر ابوالنصر، کرنل عبدالحئ، بریگیڈئیر قیوم شیراز اور حاجی محمد حسین صاحب سے ملاقات اور انٹرویو کا انتظام بھی کیا جس کے نتیجے میں ان اصحاب سے بہت قیمتی سوانحی مواد حاصل ہوا۔ اسی سلسلہ میں، پروفیسر عین الدین علوی کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے نہ صرف "میرِ کارواں کی یاد میں" کے عنوان سے اس کتاب کے لئے ایک سیر حاصل مقالہ لکھا

بلکہ کتاب کے مسودہ کو بھی دیکھا اور اس کی تالیف وترتیب میں قیمتی مشورے دیئے۔ (جزاک اللہ)
دل نہیں مانتا کہ آخر میں، میں اپنی اہلیہ کا شکر گزاری اور حسرت کے گہرے احساس کے ساتھ تذکرہ نہ کروں۔ ان کی رفاقت کی مہربان چھاؤں میں، میں نے اس کتاب پر کام شروع کیا تھا۔ اور جب میں اپنی سلسلہ میں کراچی، لاہور گیا وہ میری ادبی معاون کے طور پر میرے ساتھ تھیں۔ لاہور میں رفیق صاحب کی والدہ، بیگم، بیٹیوں اور بہو کے انٹرویو انہوں نے ہی ریکارڈ کیئے۔ اس کے بعد جس زمانے میں وہ پنڈی سی ایم ایچ میں زیر علاج تھیں تو ان کے اصرار پر میں نے انٹرویو کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ اس کتاب کا ایک تہائی حصہ ان کی طویل علالت کے دوران ٹرانزٹ کیمپ راولپنڈی میں لکھا گیا۔ جہاں میں ان دنوں ٹھہرا ہوا تھا۔ اب جب کہ ہم دونوں کی مشترکہ کاوشوں سے یہ کتاب طباعت کی منزل تک پہنچی ہے تو وہ خود اپنی زندگی کے سفر کی آخری منزل سے ہمکنار ہوگئی ہیں۔ خدائے رحمان ورحیم ان کی مٹی کو ٹھنڈا رکھے اور ان کے روح کو ابدی آسودگی عطا فرمائے۔ آمین۔ ان اوراق کے پڑھنے والوں سے استدعا ہے کہ وہ ان ہاتھوں کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں جنہوں نے بڑی محبت سے لیکن نہایت مشکل حالات میں یہ دیا جلایا۔ یہ کتاب نومبر ۱۹۸۵ء میں پہلی بار چھپی تھی۔ یہ دوسرا ایڈیشن بغیر کسی ترمیم اور اضافہ کے تبرک کے طور پر کردار ساز بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے اہتمام سے شائع کیا جارہا ہے تاکہ آندھیوں میں یہ چراغ جلتا رہے۔

سعید راشد

۲۱۔ اپریل ۱۹۸۵ء

باب اول

کردار کی جھلکیاں
واقعات کے آئینہ میں

روشنی کی طرف پہلا قدم

یہ ایک اعلیٰ اسکول کی پہلی جماعت کا وسیع وعریض کمرہ ہے۔دیواروں پر بہت سے تصویری چارٹ لگے ہوئے ہیں۔جن میں بچوں کو صحیح اور غلط کام کرتے دکھایا گیا ہے۔صحیح کام کے نیچے ٹک کا نشان لگا ہے اور غلط کام کے نیچے x کراس کا نشان لگا ہے۔مثلاً اس پہلے چارٹ میں ایک ہنس مکھ صاف ستھرا لڑکا کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال رہا ہے، اس کے نیچے ٹک کا نشان لگا ہے۔دوسری تصویر میں بچہ دیوار پر لکیریں کھینچ رہا ہے،اس کے نیچے کراس کا نشان لگا ہے۔تیسری تصویر میں ایک لڑکا فرش پر ٹافی کا ''ریپر'' اور پھلوں کے چھلکے پھینک رہا ہے،اس کے نیچے بھی کراس کا نشان لگا ہے۔چوتھی تصویر میں بچے ایک قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں،اس پر ٹک کا نشان ہے۔اس سے آگے جو چارٹ ہے اس میں ایک لڑکا ایک دوسرے لڑکے کے بستے سے پنسل

نکالتے دکھایا گیا ہے، اس پر کراس لگا ہے۔ سفید قمیض اور نیلے نیکر میں ملبوس اس کلاس میں داخل ہونے والا نہایت ہی اسمارٹ نیا لڑکا ان تصاویر کو نہایت انہماک سے دیکھ رہا ہے۔ سارے بچے جا چکے ہیں لیکن وہ تصویروں کو دیکھنے میں محو ہے۔ یہ کوالا لمپور (ملائشیا) کا مشہور انٹرنیشنل اسکول وکٹوریہ ہائی اسکول ہے اور جو بچہ ان تصاویر کو اتنے غور سے دیکھ رہا ہے وہ کوالا لمپور کے چیف پولیس افسر میاں چراغدین کا چھوٹا بیٹا ہے، جسے اسکول میں داخل ہوئے دوسرا ہی دن ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۵ء کا ہے۔

ماں جی۔ میاں جی کو نہ بتانا

"ماں جی۔ میاں جی کو نہ بتانا"۔

" کیا ہوا"۔

"میں اپنی پلٹن کو پریڈ کرار ہا تھا اس طرح جیسے میاں جی کرواتے ہیں اور سلامی لیتے ہیں"۔

" پھر"

پھر میں اپنے ساتھیوں کو میاں جی کے دفتر لے گیا میں اپنے سپاہیوں کو ایک تماشا دکھا رہا تھا کہ میاں جی کے گودام کے کاغذوں کو آگ لگ گئی،۔

" کیسے لگی"

"مجھ سے لگی"۔

بیٹے تم نے سچ بتا دیا اچھا کیا لیکن بیٹے ایسی شرارتیں نہیں کرتے۔ کل تم سائیکل توڑ لائے تھے اور اپنے چوٹ بھی مار لی تھی۔ اب تمہاری چوٹ کا کیا حال ہے۔

ماں جی۔ چوٹ کا کیا ہے چوٹیں تو لگتی ہی رہتی ہیں۔ آپ ایک روپیہ اور دیں تا کہ سائیکل ٹھیک کرا لاؤں"

تم اس وقت یہاں کہاں؟

یہ واقعہ ۱۹۳۵ء کا ہے۔ رندھیر ہائی سکول کپور تھلے کے ایک استاد مسٹر عبدالحمید قریشی چھٹی ہونے کے کوئی دو گھنٹے بعد اسکول کے جوبلی ہال کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ کوئی لڑکا برآمدے کے فرش پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔

قریب پہنچے تو پہنچانا۔

رفیق تم اس وقت یہاں کہاں؟"

"سر، شام کو فٹ بال کا میچ ہے اب کھیل کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔ سوچا تھوڑا سا ہوم ورک ہی کرلوں۔

صاحب! کہاں ہے

۱۹۳۶ء کا یہ واقعہ بھی رندھیر ہائی سکول کپور تھلے کا ہے۔ اسکول کا کسی دوسرے اسکول سے فٹ بال کا میچ تھا اور ٹیم کا سنٹر فارورڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"صاحب کدھر ہے"۔

صاحب کدھر ہے"۔

میں نے سائیکل پر آتے دیکھا ہے"۔

"بادشاہ پور سے آتے یا جاتے"۔

یہ لڑکے اور استاد دسویں درجے کے جس لڑکے کو "صاحب" کے نک نیم سے تلاش کر رہے تھے۔ اس کا اصل نام رفیق تھا۔

اس کے بعد شکار چھوڑ دیا

"چچا جان سنا ہے کہ دادا جان کو شکار کا بہت شوق تھا۔ کیا کبھی آپ کو بھی شکار کا شوق رہا ہے؟"

"شکار کا شوق کبھی بہت تھا۔ پھر یکا یک چھوڑ دیا۔

"آخر کیوں"۔

"اکثر شکار پر جایا کرتا تھا۔ایک روز دریا کے کنارے راج ہنس کا جوڑا دیکھا۔ میں نے فوراً فائر کر دیا۔ جس کے گولی لگی وہ نر تھا۔ پھر میں نے اس کی مادہ کو جس بے چینی سے اس کے اوپر چکر لگاتے دیکھا وہ منظر دیکھ کر شکار سے دل اچاٹ ہو گیا۔ یہ میرے کمیشن لینے سے کچھ پہلے کی بات ہے"۔

ایک قدم اور بھی آگے بڑھو

اگست ۱۹۴۲ء میں کلکتہ کے قریب دیولا کیمپ میں کمپنی کمانڈر کیپٹن (بعد کو میجر جنرل) مظفرالدین کو ایک نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ نے کمپنی آفیسر کی حیثیت سے رپورٹ کی۔ یہ نیا افسر کپورتھلے کا تھا اور کمپنی کمانڈر صاحب ہوشیار پور کے۔اس تعلق سے اور اس رشتے سے کہ اتنے بہت سے غیر مسلم افسروں میں یہی دو مسلمان تھے کچھ دنوں میں دونوں میں قدرے بے تکلفی ہو گئی تو نو وارد افسر کا انگریزی بولنے کا انداز ہی نہیں لائف اسٹائل بھی برٹش افسروں جیسا تھا اور اشغال بھی وہی۔ کچھ دنوں کے بعد ماہ رمضان آ گیا۔ کیپٹن مظفرالدین نے تو روزے رکھے ہی۔ اس افسر نے بھی رکھنا شروع کئے تو مظفرالدین کو حیرت ہوئی۔

"حیرت ہے۔تم روزے رکھتے ہو۔"

"سر۔اس میں حیرت کی کیا بات ہے"

"تمہاری کلب کی عادت تو کچھ اور ہے"۔

آپکا اشارہ جس عادت کی طرف ہے وہ میری اپنی ہے۔ روزہ داری میرے خاندان کی روایت ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں بادشاہ پور کپورتھلے کے میاں چراغ دین کا بیٹا ہوں۔ میرے دادا میاں غلام قادر اور ان کے بڑے بھائی میاں غلام رسول عربی فارسی کے عالم اور طبیب تھے۔میاں غلام رسول طبیب ہونے کے ساتھ کپورتھلے کے ایک مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے اور بڑے اچھے خوش نویس بھی تھے۔ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ ہمارے گھر میں اب بھی موجود ہے۔اس وقعہ کے راوی

جنرل مظفر الدین اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں بھی اپنی آزاد مشربی کے باوجود رفیق میں مذہبی عصبیت موجود تھی۔ اور وہ کام کا اور بات کا کھرا افسر تھا۔ اسی گہرے تاثر کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۹ء میں جب بحیثیت ایسٹ پاکستان کے گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجھے گورنرز انسپکشن ٹیم کے چیئرمین کی ضرورت ہوئی تو میں نے فوراً رفیق کو چن لیا۔ پھر شیخ مجیب الرحمان کیس میں استغاثہ کی قیادت بھی میں نے ان کے سپرد کی۔

کیا توہین تمہیں گوارا ہے؟

یہ واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے، ۹ پنجاب رجمنٹ ایبٹ آباد میں فروکش تھی کہ یکا یک ایک سگنل آیا، جو یونٹ کے ایجوٹینٹ کیپٹن (اب ریٹائرڈ) بریگیڈیئر اقبال شفیع لے کر یونٹ کے ایکٹنگ سی او اور ٹو، آئی، سی میجر محمد رفیق کے پاس پہنچے۔

"سر یہ سگنل آیا ہے۔ بٹالین کو فوری طور پر اٹک فورٹ جانا ہے۔ضروری ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جارہا ہے۔

(سگنل پڑھکر) اقبال۔ بٹالین کا جانا برحق لیکن یہ ٹرانسپورٹ کا کیا قصہ ہے؟"

"ٹرانسپورٹ بٹالین کی موومنٹ ہی کے لئے ہے"۔

" کیا یہ شرم کی بات نہیں؟"

"سر۔کون سی بات"؟

"یہی کہ ایک انفنٹری بٹالین اور وہ بھی ۹ پنجاب سوسوا سو میل کے فاصلے پر موو کرے اور گاڑیوں پر سوار ہو کر جائے۔تمہارا کیا خیال ہے"

"سر"" آپ بہتر سمجھتے ہیں"

"اچھا تم پلٹن کو جمع کرو۔ میں خود جوانوں سے بات کرتا ہوں" (چنانچہ ٹو آئی سی نے اپنے مخصوص لب

ولہجہ میں یونٹ کو خطاب کیا)

"پاکستان میں ایندھن کی کمی ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک انفٹری بٹالین ہے۔سوسوا سو میل کا فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہے کہ ہم ٹرانسپورٹ پر سوار ہو کر جانے کی بے عزتی برداشت کرلیں۔(ہر طرف سے آواز آئی۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم روٹ مارچ کریں گے)۔شاباش، ۹ پنجاب کے یہی شایان شان ہے، میں تمہارے ساتھ چلوں گا"۔اس واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہوئے بریگیڈیئر اقبال شفیع اپنے انٹرویو میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ طے پایا کہ ساری پلٹن روٹ مارچ کرے۔صرف عورتوں، بچوں، بیماروں اور کیمپ کے خدمت گاروں کے لئے گاڑیوں کا انتظام کیا گیا۔ پھر دوسرے دن پلٹن اس شان سے روٹ مارچ پر روانہ ہوئی کہ سب سے اگلے کالم کی قیادت ٹو آئی سی خود کر رہے تھے۔ پورے ایف ایس ایم او کے ساتھ۔ان کے پیچھے یونٹ کا بینڈ تھا، اس کے پیچھے ساری پلٹن تھی۔ پہلا ہالٹ ہری پور ہزارہ کی گراؤنڈ میں ہوا تھا۔دوسرا ہالٹ اس جگہ ہوا جہاں اب کیڈٹ کالج حسن ابدال ہے۔تیسرے دن اٹک فورٹ پہنچے۔فورٹ میں داخل ہونے کی الگ شان تھی۔فورٹ سے آدھ میل ادھر پھر ہالٹ ہوا۔ جوانوں سے کہا گیا اپنی وردی وغیرہ ٹھیک کرلیں اور تازہ دم ہو جائیں۔تو وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا جب ۹ پنجاب اٹک فورٹ میں داخل ہوئی۔سب سے آگے شیر ببر کی طرح ٹو آئی سی تھے۔ بینڈ کی تیز دھنیں بج رہی تھیں اور جوان قدم ملائے دمکتے چہروں کے ساتھ بڑی آن بان سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

باقی دو قدم آگے آجائیں

یہ واقعہ جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ اسکول کوئٹہ کا ہے۔ایک روز پی ٹی کے پریڈ میں چیف انسٹرکٹر میجر رفیق نے نوٹ کیا کہ ایک کیڈٹ نے انڈرویئر نہیں پہنا ہوا۔ بجائے اس کہ کہ وہ اس کیلئے کیڈٹ سے باز پرس کرتے انہوں نے پورے کورس کے پی ٹی اسکوائر میں فال ان کروالیا۔انہیں شبہ تھا کہ دو چار اور بھی ایسے ہونگے جنہوں نے انڈرویئر نہیں پہنا ہوا۔اور وہ گرجے۔

''آپ میں سے جن لوگوں نے انڈ ویئر نہیں پہنا ہوا وہ ہاتھ کھڑے کریں''۔

اب ہوا یہ کہ اس ایک لڑکے کے علاوہ جس کو شروع میں چیک کیا گیا تھا صرف ایک دو اور نے ہاتھ کھڑے کیئے۔ چیف انسٹرکٹر کی آواز پھر گونجی۔

''باقی لوگ دو قدم آگے آجائیں،

(اور سب کھٹاک سے دو قدم آگے آگئے۔ پھر حکم ہوا)

"اب اپنے اپنے شارٹس اتار دیجیئے"۔

نتیجتاً وہ جنھوں نے چیٹ کیا تھا اسی روز اسکول سے فارغ کر دیئے گئے۔

دوسری طرف بھی تو دیکھئے

جے ایس پی سی ٹی ایس کے اسی کورس کا قصہ ہے کہ انٹر کمپنی باکسنگ ہو رہی تھی۔ چیف انسٹرکٹر میجر رفیق جج تھے۔ انھوں نے نوٹ کیا کہ ایک باکسر مد مقابل کا سامنا نہیں کر رہا۔ کبھی ''ڈک ان'' کرتا ہے کبھی کچھ۔ گویا قصداً "ڈاج" کر رہا ہے۔ ریفری نے ایک وارننگ دی، دوسری اور تیسری کے بعد اسے چیف جج کے اشارہ پر رنگ سے باہر کر دیا۔ جب اسے اسکول سے نکالنے کی کاروائی شروع ہوئی تو ایک جہاندیدہ نے کہا:

"یہ دیکھئے جسے آپ نکال رہے ہیں کون ہے"۔

" کون ہے"

"یہ اس کورس کا اسمارٹ ترین، کیڈٹ ہے اور......... اور"۔

"اور کیا"۔

"اور یہ ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس کا باپ مرکزی حکومت میں ایک با اختیار منسٹر ہے"۔

"یہ سب کچھ صحیح سہی لیکن دوسری طرف تو دیکھئے۔ دوسری طرف ملک کا مفاد ہے۔ پوری قوم کا تحفظ ہے۔ کیا میں ایک اسمارٹ اور ذہین بزدل کے ہاتھوں میں اس ملک کا دفاع جانے دوں؟ فرد کے مفاد کی وکالت تو سب کرتے ہیں ملک کے مفاد کا لحاظ کون کرے گا۔ رہی یہ بات کہ وہ کس کا خاندان ہے اور اس کا باپ کون ہے ان باتوں کو خاطر میں لانے کی ضرورت میں نہیں سمجھتا"۔

جہلم کلب کی ایک رات

یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کی ایک شب کا ہے۔ جہلم کلب میں بڑی رونق تھی۔ ایک طرف انگریز اسٹیشن کمانڈر محفل سجائے بیٹھا تھا اور دور چل رہا تھا۔ دوسری طرف اس کی میم نوجوان افسروں میں گھری مخمور بیٹھی چہک رہی تھی۔ افسروں کے موڈ سے ظاہر ہوتا تھا کہ لائٹ ٹاک ہو رہی ہے، سب ہنس بول رہے تھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور دو حضرات اندر آ گئے۔ ایک ادھیڑ عمر کے سنہری کمانیوں کا چشمہ لگائے وجیہہ اور طویل القامت صاحب تھے۔ دوسرے کے پر رعب چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑی آن بان کا افسر ہے۔ یہ دونوں قریب کی ایک میز پر بیٹھ گئے اور بیرے کا انتظار کرنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد میم کی آواز بلند ہوئی اور اس نے کہا "یو بلڈی پاکستانیز"۔ یہ سننا تھا کہ اس نووارد افسر نے بڑے غصے سے پاؤں زمین پر مارا اور اپنی مخصوص گرج دار آواز میں کہا:

"حضرات! اس خاتون نے اس ملک کی اور اس سرزمین کی توہین کی ہے۔ میرا مطالبہ ہے کہ یہ معافی مانگے"۔

ان کے اس طرح سنجیدگی سے دھاڑنے سے ہر شخص سناٹے میں آ گیا۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کیا جائے جب انہوں نے دوبارہ اپنا فقرہ اسی شدت سے دہرایا تو دو ایک سینئر افسر جو انہیں جانتے تھے آگے بڑھے اور کہا:

"رفیق چھوڑو اس بات کو یہ کلب ہے"۔

وہ انگریز عورت بھی کہنے لگی۔ میرا منشا تمہارے ملک کی توہین نہ تھا''۔ یہ نوجوان بھی میرے سامنے کئی بار بلڈی برٹشرز کہہ چکے ہیں۔ میں نے تو برا نہیں مانا۔ اب اور لوگ بھی رفیق صاحب سے معاملہ رفع دفع کرنے کو کہنے لگے۔ لیکن انہوں نے پھر کہا'' میں پاکستان کی توہین مذاقاً بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ فی الحال واقعہ یہ ہے کہ اس خاتون نے توہین آمیز الفاظ کہے ہیں۔ اس لئے یہ خاتون آگے آئے سب کے سامنے معافی مانگے یا پھر اٹھ کر چلی جائے''۔ اس عرصے میں اس میم کا نشہ بھی ہرن ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ معافی مانگے اور جان چھڑائے۔ کلب کے رنگ میں بھنگ پڑ چکا تھا۔ لوگ ایک ایک کر کے اٹھنے لگے تھوڑی دیر میں سارا کلب خالی ہو گیا۔ آخر میں یہ دورہ گئے۔ رفیق صاحب نے کلب کے موسیقار عمانویل کو آواز دی اور اس سے کوئی ساز بجانے کی فرمائش کی۔ پھر وہ دیر تک ملائی گانے گاتے رہے۔ ان کی بھاری آواز جس میں ہیجان تھا، کلب کے در و دیوار سے ٹکراتی رہی۔ اسی طرح خاصی رات گزر گئی۔ گاتے گاتے وہ خاموش ہو گئے۔ گھڑی تین بجا رہی تھی۔ "حیدری صاحب ! آج پہلا روزہ ہے، دیکھئے سحری کا کچھ انتظام ہو سکتا ہے''۔ حیدری صاحب کچن کی طرف گئے۔ وہاں سناٹا تھا۔ آ کر انہیں بتایا کہ یہاں تو معاملہ صاف ہے۔

''تو شہر چلتے ہیں''۔

چنانچہ دونوں موٹر بائک پر شہر آئے۔ ریلوے روڈ کے ایک تھرڈ کلاس نانبائی کے تنور کے پاس بیٹھ کر دونوں نے سحری کھائی اور پھر کالج پلٹے۔

تمہاری منزل کہاں ہے۔

۱۹۵۲ء میں پنجاب سنٹر کے زیر اہتمام بوائز کمپنیز کے باکسنگ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ کالج کی ٹیم بھی حسب روایت حصہ لے رہی تھی۔ باکسنگ شروع ہونے سے پہلے دونوں طرف سے نعرہ بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ ادھر سے آواز آتی '' کے جی دریاؤں پار'' ادھر سے اس کا تیز نکیلا جواب جاتا۔ خوب نوک

جھونک چل رہی تھی۔ تک کی نہیں۔ بوجھوں مارنے والی بات تھی کہ کمانڈنٹ آئے تو انہوں نے ہیڈ بوائے کو اشارہ کیا۔

یہ سب نعرے بند، صرف ''پلے اپ دی گیم کافی ہے''۔ ہیڈ بوائے نے آکر بتا دیا کہ کرنل صاحب کا یہ حکم ہے۔ اسے سنتے ہی سب پر اوس پڑ گئی اب کیا کریں۔ ہیڈ بوائے نے گلہ کیا۔ سر، آپ نے تو ہمارے منہ بند کر دیئے۔ ہم ان کی چوٹوں کا کیسے جواب دیں۔ تم میں اور ان میں کچھ فرق ہے۔ یہ سوچو تمہاری منزل کہاں ہے۔

تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟

یہ واقعہ نومبر ۱۹۵۲ء کا ہے۔ نذیر، رفیع اور پیر داد تین لڑکے برڈ ووڈ ہاؤس میں شام کو کچن ڈیوٹی پر تھے اور مٹر کی پھلیوں سے مٹر نکال رہے ہیں کہ گیمز ڈریس میں کمانڈنٹ آن پہنچے۔

''لڑکو کیا ہو رہا ہے''

''سر، مٹر نکال رہے ہیں''۔

کمانڈنٹ وہیں بنچ پر بیٹھ گئے۔ لڑکوں کے ساتھ دو چار پھلیوں سے دانے نکالے۔ ایک دانا میز کے نیچے گر پڑا تھا، اسے احتیاط سے اٹھا کر تھالی میں رکھا اور پھر ''ویل ڈن'' کہہ کر باہر نکل گئے۔

یہ کسی سسٹم کا آخری امتحان ہے

اواخر ۱۹۵۲ء میں کالج کے سالانہ کنسرٹ کی تیاری ہو رہی تھی۔ خاصی رات بیت چکی تھی۔ کچھ بارش کے آثار بھی تھے۔ اس لئے حیدری صاحب نے علوی صاحب سے کہا اب چلیے موسم بھی خراب ہو رہا ہے۔ چنانچہ پہلے انہوں نے لڑکوں کو فارغ کیا اور خود اسکرپٹ وغیرہ سمیٹ کر باہر نکلے تو انہوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔

وہ چند لڑکے جو اسکین ہاؤس اور برڈ ووڈ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ کمانڈنٹ کے دفتر کے

سامنے پہنچے تو انہوں نے کھٹاک سے ایک بڑا اسمارٹ سیلوٹ مارا اور پھر آگے بڑھے۔

''علوی صاحب یہ ہے آنر سسٹم''۔

''یہ کون لڑکے ہیں''۔

''جو بھی ہیں۔ گاڈ بلیس دیم''۔

سر، یہ اس کا قصور نہیں، میرا حکم یہی تھا

۱۹۵۲ء کی کالج کی تقریب انعامات کی سالانہ تقریب پر جنرل محمد ایوب خان کی تشریف آوری تھی۔ یہ فنکشن اس پریڈ گراؤنڈ میں منعقد ہو رہا تھا جہاں اب موسیٰ ہال ہے۔ انتظام ایسا کیا گیا تھا کہ صرف مہمان خصوصی سی این سی کی کار پریڈ گراؤنڈ تک جائے۔ باقی کاریں بشمول فلیگ کاریں اس پارک کی طرف بھیجی جائیں جو کمانڈنٹ کے دفتر کے پیچھے اس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ کاروں کے کنٹرول اور رہنمائی کے لئے ایم پی افسر کا کام آ کنلک ہاؤس کا ہاؤس پریفیکٹ ۱۵۲۰ء محمد اعظم کر رہا تھا۔ باقی کاریں تو آرام سے کار پارک تک چلی گئیں۔ لیکن جب اے جی میجر جنرل شیر علی کی کار آئی تو اعظم نے معمول کے مطابق اس کو بھی روکا اور کار پارک کی طرف جانے کا سگنل دیا۔ وہ سمجھے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اشارے سے اعظم کو بلایا۔

''کیا بات ہے''۔

''سر آپ کی کار کو اس طرف کے کار پارک میں جانا ہے''۔

''تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں''۔

''سر آپ اے جی ہیں، جنرل شیر علی''۔

''تو پھر''

''سر حکم یہ ہے کہ گراؤنڈ میں صرف سی ان سی کی کار کو جانا ہے''۔

''تمہارا نام کیا ہے''۔

''کیڈٹ آفیسر محمد اعظم''۔

اے جی صاحب نے اپنی کار تو عام کار پارک میں کھڑی کروادی لیکن نہایت برہمی کے عالم میں گراؤنڈ میں پہنچے۔ کرنل رفیق نے ان کا معمول کے مطابق خیر مقدم کیا۔ لیکن انہوں نے چھوٹتے ہی کیا۔

''رفیق راستے کے ٹرن پر کوئی کیڈٹ آفیسر محمد اعظم کھڑا ہے۔ بڑا گستاخ ہے۔ اس نے میری کار کو ادھر نہیں آنے دیا''۔

''سر، یہ اس کا قصور نہیں۔ اس کو یہ حکم میں نے ہی دیا تھا کہ سی این سی کی کار کے علاوہ کسی اور کار کو پریڈ گراؤنڈ میں نہ جانے دیا جائے''۔

تم نے اچھا کیا کہ سچ سچ بتا دیا

کالج میں کبھی ایک کچا ہاؤس تھا آ کنلک ہاؤس جو شیش محل کے نام سے معروف تھا۔ اس کا محل وقوع.......... دائیں طرف سرائے اور پیچھے کھیت ہی کھیت.......... ایسا تھا جو لڑکوں کو ایڈونچر کی دعوت دیتا تھا۔ کچھ لڑکے اس دعوت کو ذرا زیادہ فراخ دلی سے قبول کرتے تھے۔ اس طرح اس ہاؤس کی ایک روایت سی بن گئی تھی۔ ایک رات کچھ لڑکوں نے جن میں ۲۰۳۳ محمد یعقوب بھی شامل تھے، پیچھے کے کھیتوں پر دھاوا بولا اور مال غنیمت میں گنے توڑ لائے جو وہ ہاؤس کے تنور کے پاس بیٹھے بڑے مزے سے اڑا رہے تھے کہ وہاں کرنل رفیق آ گئے۔ رات کے پچھلے پہر ان کا آنا اتنا غیر متوقع تھا کہ یہ لڑکے حیرت زدہ سے رہ گئے۔ ایک آدھ نے بھاگنے کی کوشش کی تو ان کی گرج دار آواز ''کم ہیر'' سے منجمد ہو کر رہ گئے۔ یعقوب اپنا گنا ہاتھ میں لئے وہیں کھڑے تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے''

''سر، سر کھیتوں سے گنے توڑ کر لائے تھے، وہ بیٹھے کھا رہے تھے''

’’تم نے اچھا کیا کہ سچ سچ بتا دیا ابھی میں نے چارج نہیں لیا ہے۔کل سے یہ سلسلہ بند ..... اب جاؤ سو جاؤ‘‘۔

پیسے بڑھوانے کے لئے روز یہ ڈرامہ کرتے ہو۔

کمانڈنٹ کو پتہ چلا کہ بعض سینئر لڑکے صبح سویرے سوتے میں باربر منظور سے شیو بنواتے ہیں۔ دوسرے دن حکم آیا جو لڑکے شیو کرتے ہیں وہ خود شیو کیا کریں۔لڑکوں کو بھی معلوم تھا کہ نئے کمانڈنٹ حکم دے کر اس کی تعمیل کی نگرانی ضرور کیا کرتے ہیں۔ اس لئے ذرا احتیاط برتتے ہوئے آ کنلک ہاؤس کے پریفیکٹ نے باربر منظور سے کہا کل صبح پانچ کے بجائے ساڑھے چار بجے آنا۔دوسرے روز صبح ابھی آدھا شیو ہی ہوا تھا کہ کرنل صاحب ذرا دروازے پر نظر آئے۔منظور کا استرا چلتے چلتے رک گیا اور سرگوشی کی۔ ’’کرنل صاحب‘‘ پریفیکٹ صاحب کی جوانی کی نیند ان کو ہوش کہاں۔منظور نے ٹھوکا دے کر صاحب بہادر کو اٹھایا اور بتایا کہ یہ حادثہ گزر گیا ہے۔’’کوئی بات نہیں۔کل سے چار بجے آنا اور تمہارے الاؤنس میں ایک روپے کا اضافہ‘‘ دوسرے روز چار بجے آ کر منظور نے اپنی کاروائی شروع کردی۔ابھی برش سے صابن لگایا ہی تھا کہ کرنل صاحب کی آواز گونجی ’’منظور‘‘ اور منظور کے ہاتھ سے برش گرتے گرتے بچا۔ لیکن جب مڑ کے دیکھا تو وہ جا چکے تھے۔اس نے پریفیکٹ کو جھنجوڑا۔’’ملک صاحب ملک صاحب‘‘ لیکن ملک صاحب نے انگڑائی لے کر کہا۔’’منظور پیسے بڑھوانے کے لئے روز روز یہ ڈرامہ کرتے ہو۔ اچھا کل سے ساڑھے تین بجے آنا اور الاؤنس میں مزید دو روپے اضافہ‘‘۔تیسرے دن منظور نے اپنی خدمت ساڑھے تین بجے شروع کی ہی تھی کہ اوپر سے کرنل صاحب نازل ہو گئے اور پھر کرنل صاحب کی چھڑی کے تین ٹکڑے ہوئے تو صاحب بہادر کی جان چھوٹی۔

آئی ایم ساری افسر!

کالج میں جمعہ اور مغرب کی نماز کالج کی مسجد میں پڑھنا ہمیشہ سے لازمی رہا ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کے

اواخر کا ہے۔ کہ ایک روز مسجد کے اندر مغرب کی نماز ہو رہی تھی اور چار پانچ لڑکے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں اوپر سے کمانڈنٹ آ گئے۔ انہوں نے ہر ایک سے فرداً فرداً باز پرس کی ہر ایک نے کپڑوں کی ناپا کی کا بہانہ بنایا۔ سوائے ۱۲۱۳۴ افسر کے۔ افسر نے کہا۔

''سر آئی ڈونٹ فیل لائک پرے انگ''۔

یہ سنتے ہی انہوں نے افسر کو مارنا شروع کر دیا اور کافی پٹائی کی۔ دوسرے روز تاج اردلی کلاس میں آیا اور کہا کرنل صاحب افسر کو دفتر میں بلاتے ہیں۔

افسر حاضر ہوا۔

''سر آپ نے بلایا ہے''

''آئی ایم ساری، افسر میں نے تمہیں سچ بولنے پر مارا۔ میں تمام رات پریشان رہا۔ آئی ایم ویری ساری افسر، سچ بڑی چیز ہے۔ جب آدمی سچ بولتا ہے تو دوسری برائیاں از خود دور ہو جاتی ہیں۔''

کوئی چیک کرے تو یہ کارڈ دے دینا

کمانڈنٹ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ فون آیا فلاں کک کی بیوی گزر گئی ہے۔ انہوں نے اسے فوراً بلوایا۔

''کچھ پیسے بھی پاس ہیں''۔

''جی نہیں''۔

''اچھا فی الحال یہ رقم رکھو تمہارا گاؤں مری سے کتنا دور ہے؟''

''خاصی دور ہے۔ راجہ بازار پنڈی سے پہلی بس صبح پانچ بجے چلتی ہے۔ اب ایک بجا ہے ابھی انتظام کرتے ہیں۔ تم کوارٹر سے کچھ لانا چاہتے ہو تو لے آؤ۔ پندرہ منٹ میں گاڑی آ جائے گی۔ سردار خان۔ جیپ ڈرائیور کو بلاؤ۔ اسے یہ کارڈ دے دینا۔ اگر راستے میں ایم پی چیک کرے تو یہ کارڈ دکھا

دے کہ کرنل صاحب نے بھیجا ہے"۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رات کو بسیں نہیں چلتی تھیں اور شام کے بعد جہلم تک جانے کے لئے بھی ٹرانسپورٹ نہیں ملتی تھی۔

یہ دیکھو کہ وفاداری کا تقاضا کیا ہے

پنڈی جی ٹی ایس کے اڈہ کے قریب اچانک ۱۳۹۴ء عمر حیات کی مڈ بھیڑ کمانڈنٹ سے ہوگئی۔

"ہیلو عمر حیات، کیسے ہو"

"فائن سر"

"کورس کیسا جا رہا ہے"۔

"سر اب فائنل ٹرم کے آخری چند ہفتے ہیں۔ سر، آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کس آرم میں جاؤں" "تمہیں کالج میں کس آرم نے نامزد کیا تھا تمہارا خرچہ کس نے اٹھایا" "سر، مجھے نامزد تو میرے آبائی آرم آرمر نے کیا تھا۔ لیکن سر سنا ہے کہ آرمر میں خرچہ زیادہ ہے"۔

"خرچہ کا انحصار آرم پر نہیں آدمی پر ہوتا ہے۔ یہ دیکھو وفاداری کا تقاضا کیا ہے"۔

میں تمہیں پالش کر کے دکھاتا ہوں

یہ واقعہ اواخر ۱۹۵۵ء کا ہے۔ اسکین ہاؤس میں ایک چھوٹا لڑکا اپنے بوٹوں کو پالش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمانڈنٹ صاحب آئے اور لڑکے کے ہاتھ سے برش اور پالش کی ڈبیہ لے لی۔

"میں تمہیں پالش کرنا سکھاتا ہوں۔ ذرا سا پانی لے آؤ"۔

۲۲۱۸ لیفٹیننٹ کرنل زمان لکھتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ میں پالش کی ڈبیہ کے ڈھکن ہی میں پانی لایا تھا۔ انہوں نے سیکشن کے باقی لڑکوں کے سامنے ڈیمانسٹریٹ کیا کہ پالش کس طرح کرتے ہیں۔ واقعی جب بوٹوں میں چہرہ نظر آنے لگا تو انہوں نے بوٹوں کو چھوڑا۔

میرے اللہ اس کرنل کو عزت اور زندگی دے۔

ڈرائنگ ماسٹر احمد دین صاحب نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۱ء تک کوئی پچیس برس سے اوپر کالج کی بڑے خلوص اور لگن سے خدمت کی۔ پھر جب وہ ٹی بی کا شکار ہوئے تو کالج سے انہیں فوری طور پر فارغ کردیا گیا۔اس کے بعد چند سال انہوں نے بڑی کسمپرسی میں گزارے۔اکتوبر ۱۹۵۵ء میں کرنل رفیق کے کالج میں دوبارہ پوسٹ ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ماسٹر احمد دین کے کچھ پرانے رفیق کار مسٹر ایوب، مسٹر شمسی، مسٹر حمید وغیرہ ان کے گاؤں چواکڑیالہ ان کی مزاج پرسی کے لئے گئے۔ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئے تھے۔ پرانے ساتھیوں نے مزاج پرسی کی تو ان کا دل کچھ بہلا۔پھر یکا یک بولے۔

''ایوب صاحب یہ کرنل رفیق کون ہیں''

''یہ کالج کے نئے کمانڈنٹ ہیں''۔

''اچھا'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہاتھ کوشش سے اوپر اٹھایا اور ایوب صاحب سے کہا۔

''خان صاحب ذرا میرا دوسرا ہاتھ اوپر اٹھا کر تھام لیجئے مجھے ایک دعا مانگنی ہے''۔ جب ایوب صاحب نے ان کا کپکپاتا اور سوکھا ہوا ہاتھ اوپر اٹھا کر پکڑ لیا تو احمد دین صاحب نے نہایت کمزور اور بھرائی آواز میں یہ دعا مانگی۔

''یا اللہ اس کرنل کو عزت دے، زندگی دے''۔عجیب منظر تھا۔ایک قریب المرگ شخص اتنے خلوص سے کسی اور کے لئے زندگی کی دعا مانگ رہا تھا۔ان کی آواز کی رقت نے سب ہی کو متاثر کیا۔ پھر شمسی صاحب نے پوچھا۔''احمد دین صاحب یہ کیا قصہ ہے۔کرنل صاحب تو اب آئے ہیں''۔ یہ سن کر انہوں نے اشارہ سے کہا''بتاتا ہوں۔سانس لے لوں''۔ جذبات کی شدت نے انہیں نڈھال کردیا تھا۔جب ذرا سنبھلے تو بولے۔''میں ان کرنل رفیق صاحب کو بالکل نہیں جانتا۔کسی نے ان کو میرے بارے میں

بتایا ہوگا۔ کل ہی انہوں نے میرے لئے تین سو روپے بھیجے ہیں اور دواؤں کے لئے پوچھا ہے۔ اللہ بھلا کرے اس بندۂ خدا کا، میں بالکل خالی ہو چکا تھا۔ یہ انسان نہیں میرے حق میں تو فرشتہ ہے''۔

دوسرے روز جب یہ واقعہ ایوب صاحب، شمسی صاحب وغیرہ نے رفیق صاحب کو سنایا تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''ملک اور قوم کے ایسے مخلص خدمت گزاروں کی اس سے زیادہ خدمت کرنی چاہیئے''۔

سر، آج کوئی اردو سانگ سنایئے

یہ واقعہ ۱۹۵۶ء کا ہے۔ اسکین ہاؤس میں کمانڈنٹ کو نئے بچے گھیرے ہوئے تھے۔ ۲۲۴۴اسحاق نے کہا۔ ''سر انگلش سانگ بہت سن چکے آج کوئی اردو سانگ سنایئے''۔

''مجھے اردو سانگ نہیں آتا''۔

ایک اور لڑکے نے بھی اصرار کیا ''سر آج سنیں گے تو اردو ہی سنیں گے''۔ ۲۴۲۸مقصود کہتے ہیں کہ پھر کرنل صاحب نے ہمارے اصرار پر بڑھے چلو، بڑھے چلو مجاہدو، رکنا نہیں تمہارا کام'' یہ نغمہ اپنی بھرپور گونجتی آواز اور انگریزی لب ولہجہ میں سنایا۔

بی، اے مین

سرائے عالمگیر میں ایک تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ سڑک کے اس پار تھانے کے قریب اس نے اپنا منڈوہ بنایا تھا۔ کمانڈنٹ نے ایک روز سارا تھیٹر کالج کے لئے مخصوص کروالیا۔ لڑکے اپنی اپنی کرسیاں اپنے ساتھ لے کر گئے۔ واپسی پر بہت سے لڑکے اپنی کرسیاں ادھر ادھر اور راستے میں چھوڑ آئے۔ اندھیرا تھا پتہ ہی نہ چلا کہ کون لایا کون چھوڑ آیا۔ دوسرے روز کرنل صاحب نے سارے کالج کو دفتر کے پیچھے فال ان کروالیا۔ بہت غصے میں تھے۔ بہت سخت سست کہا۔ آخر میں وارننگ دی۔ ''جو لڑکے کرسیاں چھوڑ کر آئے تھے از خود ہاتھ اٹھا دیں گے تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بصورت دیگر سب لڑکوں کو سخت سزا ملے گی''۔ اور کہا ''کم آن۔ بی اے مین'' سب چپ رہے۔ دوسری بار بھی کسی نے ہاتھ نہیں

اٹھایا ان کا غصہ اور بڑھا۔ تیسری بار ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا۔ ان کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ اس کی بڑی تعریف کی۔ اب اور بہت سے ہاتھ اٹھے لیکن میدان یہ مرد میدان مار چکا تھا۔ ان حضرت کا ''نک نیم تھا جنگی''۔

''تم ایک دن افسر بنو گے انشاءاللہ جراءت بڑی چیز ہے''۔

قدوس صاحب اس سودی چکر کو ختم کروایئے

کالج ہی کا ایک پرانا باورچی تھا شفیع نام کا۔ کالج کے سامنے ہی اس کا گھر تھا۔ اس نے سودی قرض دینے کا چکر چلا رکھا تھا۔ کالج کے اکثر کلاس فور اس کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ بڑا چالاک تھا۔ سود در سود سے اس کے مقروضوں کی جان عذاب میں تھی۔ ایک دربار میں رفیق صاحب کو صورت حال کا علم ہوا تو اکاؤنٹنٹ صاحب کو بلایا ''قدوس صاحب مجھے معلوم ہوا ہے شفیع لانگری نے سود کا بڑا چکر چلایا ہے۔ آپ اسے بلا کر کالج فنڈ سے اس کی اصل رقم تو واپس کر دیجئے اور وارننگ دیجئے کہ آئندہ اس نے کالج کے کسی ملازم سے اس قسم کا لین دین کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ پھر آپ یہ روپیہ آسان قسطوں میں مقروضوں کی تنخواہ سے کاٹ لیجئے گا''۔

''سر، قرض کی تو ان لوگوں کو ضرورت ہوتی رہے گی''۔

''جی ہاں، اس کا حل یہ ہے کہ آپ ہر ایک کلاس فور ملازم کی تنخواہ سے دو روپے ماہانہ کاٹیئے اور پھر پانچ سو کالج فنڈ سے شامل کر لیجئے۔ اس طرح کام چل سکتا ہے۔ لیکن پھر جو شفیع سے قرض لے اس کی رپورٹ کیجئے گا''۔

نہیں مجھے یہ آفر منظور نہیں

سی ایس ڈی جہلم سے کالج کو ایک گرم سوٹ پیس الاٹ ہوا۔ رفیق صاحب نے اس لئے کہ ایک کے بجائے دو کو حصہ ملے انہوں نے سوٹ پیس کے ٹکڑے کروائے۔ ایک کوٹ کا دوسرا پتلون کا۔ پھر دونوں

کے لئے علیحدہ علیحدہ لاٹری ڈالی گئی۔ اتفاق سے کوٹ کے لئے میجر ہاشمی اور پتلون کے لئے خود کرنل رفیق کا نام نکلا۔

''سر آپ میرا ٹکڑا لے لیں یا اپنا ٹکڑا مجھے دے دیں''۔

''نو تھینکس۔ ہاشمی مجھے یہ آفر منظور نہیں۔ مجھے ایک پتلون کی ضرورت ہے۔ میں اپنے کپڑے کی پتلون بنواؤں گا۔ آپ کا کپڑا، آپ کا کپڑا ہے۔ آپ جس طرح چاہیں اسے استعمال کریں۔''

یہ دوسری غلطی ہے!

موسیٰ ہال میں ایک فنکشن تھا۔ میجر ہاشمی اس کے لئے تیار ہو ہی رہے تھے کہ اوپر سے ان کے ایک پرانے سی او آ گئے۔ اب وہ چہ کنم میں پڑ گئے کہ آیا ان کی خاطر تواضع کریں یا وقت پر فنکشن میں پہنچیں۔ بہرحال مہمان نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ انہیں کہیں جانا ہے اور وہ خدا حافظ کہتے ہوئے جیپ میں بیٹھ گئے لیکن ہیلو اور خدا حافظ کہنے میں دو چار منٹ تو لگ ہی گئے۔ میجر ہاشمی بھاگم بھاگ موسیٰ ہال پہنچے لیکن تمام بھاگ دوڑ کے باوجود ایک آدھ منٹ اوپر ہو ہی گیا۔ کرنل رفیق کی عقابی نظروں نے تاڑ لیا کہ ہاشمی لیٹ آئے۔ دوسرے روز ان کی پیشی ہوگئی۔ وہ جھاڑ پلائی کہ باید وشاید۔ جھاڑ کا نکتہ یہ تھا کہ لڑکے کیا کہیں گے کہ اتنے سینئر انسٹرکٹر بھی لیٹ آتے ہیں۔ جب وہ گرج برس چکے تو میجر ہاشمی نے وضاحت کی''۔

''سر وزیرستان میں میرے پہلے سی او کرنل کرامت عین وقت پر ملنے آ گئے ان کو رخصت کرتے کرتے تھوڑی سی دیر ہوگئی''۔

رفیق صاحب پھر گرجے:

''ہاشمی' یہ دوسری غلطی ہے۔ ایک پرانے سی او کی جو خود ملاقات کے لئے آئے تھے۔ خاطر تواضع کرنا بھی ضروری تھا۔ تم چٹ بھیج دیتے۔ دیر سے نہ آتے''۔

آئی ایم ساری مسٹر اقبال

یہ واقعہ انٹر ہاؤس باکسنگ کے موقع کا ہے۔ باکسنگ رِنگ اس جگہ تھا جہاں اب موسیٰ ہال ہے۔ باکسنگ ہو رہی تھی۔ سامنے کے صوفے پر کرنل صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی سینئر موسٹ اسٹاف ممبر اقبال صاحب بیٹھے تھے۔ کرنل صاحب نے پہلے ان کو سگریٹ آفر تو کیا لیکن بے خیالی میں لائٹر سے پہلے اپنا سگریٹ سلگا لیا۔ پھر یکا یک خیال آتے ہی فوراً بن پیا سگریٹ زمین پر پھینک دیا اور پھر بڑے اہتمام سے پہلے ان کا سگریٹ سلگایا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے تھے۔

''آئی ایم ساری، مسٹر اقبال رئیلی ویری ساری''۔

آئی گو یوفل مارکس

ایک روز مسٹر حیدری کے دانت میں یکا یک تکلیف شروع ہوئی۔ پیریڈ ہونے والا تھا۔ سوچا پیریڈ کے بعد ڈاکٹر کو دکھا دوں گا۔ اب تو پیریڈ لے لوں لیکن چونکہ پڑھانا ممکن نہیں تھا۔ کلاس کو کام دیا اور خود کرسی پر خاموش بیٹھ گئے۔ کرسی پر بیٹھ کر پڑھانا قاعدے کے خلاف تھا۔ بہر حال مجبوری تھی۔ حسبِ عادت رفیق صاحب برآمدے سے گزرے اور دیکھ کر چلے گئے۔ حیدری صاحب کو خوب معلوم تھا کہ وہ قاعدے وضابطے کے بارے میں کسی کی رعایت نہیں کیا کرتے۔ اس لئے وہ کمانڈنٹ کی چٹ کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ تاج اردلی نے اپنے مخصوص پراسرار انداز سے کمانڈنٹ کی چٹ ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''مسٹر حیدری ٹو سی می پلیز'' مسٹر حیدری اپنے دفاعی جملوں کو تیار کرتے دفتر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ انہوں نے کہا۔

''آئی گو یوفل مارکس''

یہ چونکہ ''ایکسائیٹڈ'' تھے ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خوش ہو رہے ہیں یا ناخوش۔ اس لئے اسی نروسی کیفیت

میں بولے۔سر، رفیق صاحب نے ان کے نروس ہونے کا اندازہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔حیدری یو ڈِڈ دی رائٹ تھنگ ۔اگر طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو کلاس نہیں لینا تھا اور اگر لیا تھا تو بیٹھ کر پڑھانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔لیکن مجھے دیکھ کر کھڑا ہونا انتہائی غلط بات ہوتی۔بعض استاد مجھے دیکھ کر اپنا پہلو یا موضوع بدل لیتے ہیں۔اس طرح وہ اپنے آپ کو لڑکوں کی نظر میں گرا لیتے ہیں''۔

آئی ایم ساری، برج نہیں کھیل سکوں گا

ملٹری کالج میں برج کا شوق رکھنے والوں میں تین نام بہت نمایاں تھے۔مسٹر بلگرامی ،مسٹر اقبال اور مسٹر برکت علی چوہان۔ ایک روز اقبال صاحب بولے چلو کرنل صاحب کو برج کلب کا ممبر بناتے ہیں۔ہاں خیال تو بہت اچھا ہے۔چوہان صاحب بولے ''کہے کون'' اقبال صاحب نے سوال کیا۔یہ کام میں کرتا ہوں، بلگرامی صاحب نے حامی بھری۔چنانچہ ایک روز موقع پا کر انہوں نے ذکر چھیڑا۔

''سر، برج صرف دیکھنے کی نہیں کھیلنے کی چیز ہے۔''

''جی ہاں، جی ہاں' اس میں کیا شک ہے''۔

''چوتھے پارٹنر کی ہمیں سخت ضرورت ہے''۔

''میں آپ لوگوں کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ برج دلچسپ کھیل ہے۔لیکن!''

''جب دلچسپ ہے تو لیکن کیا''

''لیکن یہ کہ جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ برج کا کھیل بغیر اسٹیک کے نہیں کھیلا جاتا کچھ نہ کچھ تو لگانا ہی پڑتا ہے۔اس کے بغیر مزہ نہیں آتا۔اور میں نے بچپن میں ماں جی سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی جوا نہیں کھیلوں گا۔میں اپنے وعدہ پر قائم رہنا چاہتا ہوں۔تو آئی ایم ساری جنٹلمین آپ کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔ہاں اگر آپ مجھے خاموش پارٹنر بنانا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں''۔

جو شرط باندھی ہے تو اسے نبھایئے بھی

برج کلب میں ماہانہ ون ڈش ڈنر ہوا کرتا تھا۔ ہر رکن ایک ڈش لاتا تھا۔ یا اس کی قیمت ادا کرتا تھا۔ چونکہ رفیق صاحب کلب کے اعزازی رکن منتخب ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کو بھی مدعو کیا جاتا۔ ایک ڈنر سے پہلے کلب کے ممبر کیپٹن (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) مرتضیٰ حسین نے بلگرامی صاحب سے کہا۔

''چھری کانٹے سے کھانے میں وہ مزہ نہیں آتا جو ہاتھ سے کھانے میں آتا ہے۔ پھر بے تکلفی کی فضا نہیں بنتی، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میس میں کھا رہے ہوں''۔

''تو پھر؟''

''پھر یہ کہ اس بار ڈنر کی یہ شرط رکھی جائے کہ ہاتھ سے کھایا جائے گا اور چونکہ کرنل صاحب نے زندگی بھر چھری کانٹے سے کھایا ہے وہ یہ دیسی طریقہ کیا جانیں۔ کیوں نہ کسی بہانے انہیں اس بار ٹال دیا جائے''۔

''میرے خیال میں کسی ممبر کو ٹالنا تو قرین انصاف نہ ہوگا۔ کیوں نہ ان کو بلائیں اور اس شرط کی پابندی کرائیں۔ وہ بڑے اسپورٹ مین ہیں مجھے امید ہے کہ ضرور مان جائیں گے''۔

چنانچہ جب ان کو اس شرط کے ساتھ دعوت دی گئی تو حسب توقع وہ فوراً تیار ہو گئے۔ جب کھانا آیا تو انہوں نے سب سے پہلے اور بے تکلفی سے ہاتھ ہی سے کھایا۔ بلگرامی صاحب نے قصداً مرغ کو کم گلوایا تھا تاکہ اسے دانتوں سے کاٹنا پڑے۔ انہوں نے اس مرحلے سے بھی خوب انصاف کیا۔ آخر میں جب سویٹ ڈش کا نمبر آیا اور دوسرے ممبروں نے چمچے سنبھالے تو رفیق صاحب نے کہا۔

''نہ بھئی یہ نہیں۔ جب شرط باندھی ہے تو اسے نبھانا بھی چاہیئے''۔

بلگرامی صاحب لکھتے ہیں کہ ہم لوگوں نے چمچے نہیں چھوڑے لیکن انہوں نے فیرنی انگلیوں ہی سے کھائی۔

اب چائے جیسی بھی ہے پی لیجئے

برج ہی سے متعلق ایک اور واقعہ ہے کہ کرنل صاحب کے ہاں چند مہمان آئے جو برج کھیلنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کرنل صاحب نے بلگرامی صاحب اور اقبال صاحب کو بلایا۔ جو پیغام گیا وہ یہ تھا کہ کرنل صاحب برج کھیلنے کے لئے بلا رہے ہیں۔ پہلے تو دونوں کو حیرانی ہوئی۔ کرنل صاحب اور برج انہوں نے اپنی قسم کیسے توڑی۔ بہرحال جب ان کے ہاں گئے تو یہ عقدہ کھلا کہ مہمانوں کے ساتھ کھیلنا ہے۔ چنانچہ برج کی محفل جمی تو خوب جمی۔ برج گھنٹوں کا نہیں دنوں کا کھیل ہے۔ دوپہر سے شام ہوئی شام سے رات، کھانا بھی وہیں ہوا۔ لیکن پتے نہیں ہٹے۔ رفیق صاحب بھی کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ شاطروں کے لئے سگریٹ چائے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اقبال صاحب ہر تین چار گھنٹے کے بعد چائے پینے کے عادی تھے۔ کھانے کے بعد چائے کا ایک دور چل چکا تھا۔ اب بارہ ایک بجے رات انہیں چائے کی سخت طلب تھی۔ جمائیاں آ رہی تھیں۔ رفیق صاحب نے ضرور ان کی حالت دیکھی ہوگی وہ چپکے سے اٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئے۔

''جنٹلمین! یہ اب تجرباتی چائے جیسی بھی ہے پی لیجئے''۔

بلگرامی صاحب لکھتے ہیں کہ ''چونکہ ملازم جا چکے تھے وہ خود چائے بنا کر لائے تھے''۔

اپنا تو کباڑہ ہوگیا

رفیق صاحب کے دوسرے دور میں خاص طور پر آؤٹ ڈور مشاغل کی بھرمار رہتی تھی۔ ہر اتوار کو کوئی ہاؤس پکنک پر جاتا تھا۔ ہاؤس ماسٹر کا ساتھ جانا بھی لازمی ہوتا تھا۔ ایک اتوار کو حیدری صاحب کا اورنگ زیب ہاؤس جگو ہیڈ پر پکنک کے لئے گیا۔ حیدری صاحب بھی ساتھ تھے۔ واپسی پر انہیں کچھ زیادہ ہی تھکن محسوس ہوئی کہ ٹرک میں بیٹھے ہوئے کسی اسٹاف ممبر سے کہا۔

''آج تو اپنا کباڑہ ہوگیا۔ رات کو ریہرسل بھی ہے''۔ ٹرک کی اگلی سیٹ پر رفیق صاحب بیٹھے تھے۔ کسی طرح حیدری صاحب کا یہ فقرہ ان کے کان میں پڑ گیا اس وقت تو وہ چپ رہے جب کالج پہنچے تو ٹرک

سے اترتے ہوئے کہا

''حیدری۔آپ آرام کریں ریہرسل میں لے لوں گا''۔

''حیدری صاحب نے جب دیکھا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے تو اصل بات زبان پر لائے''۔

''سر، اصل مسئلہ یہ ہے کہ کل میں ماسٹر آف دی ڈے بھی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، کل دو پہر تک میں آپ کی وہ ڈیوٹی بھی کروں گا''۔

حیدری صاحب یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پھر انہوں نے نہ صرف ریہرسل لیا بلکہ آدھے دن میرے حصے کی ڈیوٹی بھی کی۔

سر، میں سزا چاہتا ہوں

''سر، مجھے سزا دیجئے۔ میں سزا کا مستحق ہوں''۔

''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں سموکنگ نہیں کروں گا۔لیکن میں چھپ چھپ کے سموکنگ کرتا رہا ہوں۔ رابرٹس ہاؤس میں میرے بہت سے ساتھیوں نے سموکنگ چھوڑ دی ہے۔لیکن میں باز نہیں آیا تھا۔آپ مجھے سزا دیجئے''۔

''تمہارا یوں اعتراف کرنا بھی بہت ہے۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔اب نہ پینا یہ کافی ہے''۔

''لیکن میں نے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا۔سگریٹ تو میں رات سے چھوڑ چکا ہوں۔اب تا زندگی اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ چونکہ میں نے آنر سسٹم توڑا ہے اس لئے میں سزا چاہتا ہوں''۔ چنانچہ اس لڑکے کے اصرار پر ہال میں تمام کالج جمع کیا گیا پہلے اس نے اپنا واقعہ سنایا اور پھر سزا چاہی۔اب رفیق صاحب سامنے آئے انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''اس کا ضمیر اس کو سزا دے چکا ہے۔ غلطی کا اعتراف اور اس پر شرمندگی عزت نفس کی نشانی ہے۔ مجھے ایسے لڑکوں پر فخر ہے جو عزت نفس کا اتنا احساس رکھتے ہیں''۔

اس واقعہ کے راوی مسٹر حیدری لکھتے ہیں کہ یہ آنر سسٹم تھا۔ جس نے گرتے ہوؤں کو تھام لیا''۔

کسی نے کہا تھا یا خود آئے ہو۔

''سر، میں اندر آ سکتا ہوں''۔

''یونس، آ جاؤ''۔

''سر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے''۔

''کیا''۔

''جو وہ دو نئے ہاؤس بن رہے ہیں وہاں ایک واش بیسن مجھ سے ٹوٹ گیا ہے''۔

''کیسے''

''وہاں میں تنہائی میں امتحان کی تیاری کرنے گیا تھا۔ پڑھنے کے بعد ادھر ادھر گھوم رہا تھا کہ ایک واش بیسن سے ٹکرایا وہ گر کر ٹوٹ گیا۔ آپ جرمانہ کریں یا سزا دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ واش بیسن مجھ سے ٹوٹا ہے''

''وہاں کوئی تھا''۔

''جی نہیں''۔

''کسی نے تمہیں دیکھا''۔

''جی نہیں''۔

''کسی نے تم سے کہا کہ مجھے آ کر اس کی رپورٹ کرو''۔

''جی نہیں''۔

''یونس تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنے ضمیر کی آواز سنی یہی آنر سسٹم ہے۔ انشاءاللہ تم ترقی کرو گے۔ گاڈ بلیس یو''۔

کہیں چوٹ تو نہیں لگی

۱۹۵۷ء کی عید تھی کالج میں جمخانہ کھیل ہو رہے تھے۔ ہیڈ بوائے ۲۰۹۲ رب نواز نے پلو فائٹ کے آئیٹم کے لئے کیڈٹوں کو آگے آنے کی دعوت دی تو کالج کا مانا ہوا باکسر عبدالسلام ایک دم اچھل کے آگے آ گیا۔

عبدالسلام کا نک نیم سندھو تھا اور وہ اپنی جسمانی تاب وتوانائی کیلئے معروف تھا۔ سندھو سے مقابلہ کون کرے، رب نواز نے دوسری بار کال دی تو بھی کوئی سامنے نہ آیا۔ سندھو نے فاتحانہ شان سے مجمع کی طرف دیکھا۔ ایسے جیسے کہہ رہا ہو دیکھوں سندھو کے مقابلہ پر کون آتا ہے۔ جب رب نواز نے تیسری بار کہا کہ کوئی ہے جو اپنے آپ کو والنٹیر کرے اور کوئی سامنے نہ آیا تو دیکھنے والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ خود کرنل رفیق اپنی آستینیں رول کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے۔ پہلی بار زبردست تالی بجی، پھر سناٹا چھا گیا۔ سناٹا اس خیال سے کہ کہیں رفیق صاحب جو سب کے ہیرو ہیں ایک شوریدہ نوجوان سے اس جسمانی مقابلے میں مات نہ کھا جائیں۔ بہرحال اس کھیل کے اصولوں کے مطابق دونوں کا ایک ہاتھ پیچھے باندھ دیا گیا اور آنکھوں پر کس کے پٹی باندھ دی گئی۔ عجیب اضطراب کا عالم تھا۔ سندھو کی جنگ جوئی اور خونخواری مشہور تھی۔ اٹھارہ سال کا کڑیل جوان تھا۔ ادھر کرنل صاحب لاکھ فٹ سہی، تھے تو چالیس سال کے پیٹے میں۔ مختصر یہ کہ سندھو نے پہلا وار کیا۔ جو انہوہوں ں نے ہاتھ پر روکا۔ اس نے تابڑتوڑ دوسرا وار کیا جو انہوں نے بچایا۔ یہ وار اس نے بڑی قوت سے کیا تھا۔ اس کے خالی جانے سے اس کو جھٹکا لگا۔ اسی لمحے انہوں نے ایسا پلو مارا کہ سندھو قلابازی کھاتا ہوا نو فٹ بیم سے نیچے آ گرا اس کے گرتے ہی کرنل صاحب چھلانگ لگا کر نیچے آئے۔

''سلام۔ تمہارے چوٹ تو نہیں لگی''۔

اب جو تالیاں بجنا شروع ہوئیں تو ختم نہیں ہوتی تھیں۔

خان صاحب آپ کا بچہ سیلکیٹ ہو گیا ہے

یہ واقعہ ۱۹۵۷ء کا ہے۔آٹھویں درجے کے امیدوار لڑکے کمانڈنٹ کے دفتر کے آس پاس جمع تھے۔ بیشتر کا ذہنی امتحان اور انٹرویو ہو چکا تھا۔صرف چند لڑکے باقی تھے جو سفیدے کے درختوں کے نیچے (جہاں اب نئی لائبریری ہے) بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔سفیدے کے ایک درخت پر شہد کی مکھیوں کا چھتہ تھا جسے ایک شرارتی بچے نے جس کا انٹرویو ہو چکا تھا پتھر مار کر چھیڑ دیا۔مکھیاں اڑیں تو پہلے اسی پیڑ کے نیچے کمبل پر بیٹھے دو بچوں پر جھپٹ پڑیں۔ان میں سے ایک نے ذرا زیادہ ہوشیاری اور جرأت دکھائی اور کمبل سے اپنے ساتھی کو بچانے کی کوشش کی۔اس کوشش میں خود اس کو مکھیوں نے بری طرح کاٹ لیا۔اس ہنگامہ کا شور سن کر کمانڈنٹ اپنے دفتر سے باہر آئے اور بچے کو مکھیوں کا مقابلہ کرتے دیکھا۔اسے فوراً ہی ہسپتال بھجوایا گیا۔ پیچھے پیچھے کمانڈنٹ خود بھی ہسپتال گئے۔واپسی پر بچہ کے والد نے انہیں گھیرا۔

''کرنل صاحب ہم تو برباد ہو گیا۔بچہ کا حال خراب ہے انٹرویو بھی گیا۔داخلہ کا کیا ہوگا''۔

''خان صاحب آپ داخلہ کی فکر نہ کریں۔بچہ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا''۔

''صاحب ہم فکر کیسے نہ کریں؟ بچہ انٹیلی جنس اور انٹرویو کے لئے جا رہا تھا کہ یہ آفت نازل ہو گیا''۔

''میں نے آپ سے کہا نا کہ آپ داخلہ کی فکر نہ کریں۔آپ کا افضل داخل ہو گیا ہے''۔

''داخلہ ہو گیا ہے؟ انٹیلی جنس اور انٹرویو تو اس نے دیا ہی نہیں ہے''

اس بچہ کی ذہانت کا امتحان تو بہت پکا ہوا ہے۔اس نے اپنی ذہانت کو سب کے سامنے کام میں لاتے ہوئے کمبل کا صحیح استعمال کیا۔اور رہا انٹرویو وہ بھی عملی طور پر ہو گیا۔ہمیں فوج میں ایسے لوگ چاہئیں جو جرأت اور حوصلہ رکھتے ہوں۔اس بچے نے جس طرح اپنے ساتھی کو بچایا وہی انٹرویو تھا۔مبارک ہو''۔

لڑکے تمہارے ساتھ کون؟

کالج میں ۱۹۵۷ء کے داخلے ہو رہے تھے۔امیدوار اپنے والدین اور سرپرستوں کے ساتھ اسکین ہاؤس

میں ٹھہرے ہوئے تھے۔تحریری امتحان دے کر دوسرے دن جب لڑکے اپنے اپنے بزرگوں کے ساتھ تانگوں میں بیٹھ کر جہلم سی ایم ایچ جانے لگے تو کمانڈنٹ نے دیکھا کہ ایک لڑکا برڈووڈ ہاؤس کے سامنے اکیلا کھڑا ہے۔

''تمہارے ساتھ کون ہے''۔

''سر میں اکیلا ہوں''۔

''تمہارے والد''۔

''میرے والد صوبیدار فقیر محمد تھے''۔

''تمہیں سی ایم ایچ جانا ہے''۔

''جی ہاں''۔

''چلو میں تمہیں پہنچا آتا ہوں''۔

۲۴۳۹ نصیر احمد پراچہ لکھتے ہیں کہ اس دن کرنل صاحب مجھے اپنی موٹر بائیک پر خود چھوڑ کر آئے۔ پھر تین دن میرے آنے جانے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال.......

سسٹم یہ تھا کہ چاروں ہاؤسوں کے پریفیکٹوں کو ایک ایک ڈِسک دے دی گئی تھی۔طریق کار یہ تھا کہ ہاؤس پریفیکٹ ریوالی کے وقت سے جس پہلے لڑکے کو انگریزی کے سوا کوئی اور زبان بولتے دیکھتا وہ ڈیسک اس کے حوالے کر دیتا، پھر وہ جس کو پکڑتا اس کو دے دیتا۔رات کو لائٹس آؤٹ کے وقت ڈسک جس کے پاس نکلتی اس پر جرمانہ ہوتا تھا۔دن بھر تو یہ سلسلہ چلتا رہتا۔شام کا وقت گزرتا جا رہا تھا اور کوئی شکار نہیں پھنس رہا تھا۔وہ غسل خانے کی طرف سے گزرا تو کسی کے گنگنانے کی آواز آئی۔ یقیناً یہ اردو تھی اور قریب جا کر سنا تو الفاظ بھی سمجھ میں آ گئے۔

''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔ وصال یار.....جی ہاں وصال..........ڈسک ہولڈر نے فوراً ڈسک کو اڑ کے اوپر سے اچھالی اور کہا.......

''TAKE THIS FOR THE TIME BEING MY DEAR''

بگل پہلے کیوں بجایا؟

رفیق صاحب کے زمانے میں ملٹری کالج میں افسروں کی پی ٹی لڑکوں کی پی ٹی سے پہلے ہوتی تھی۔ ان کی وقت کی پابندی تو ضرب المثل تھی۔ ادھر اس گراؤنڈ میں جہاں اب موسیٰ ہال ہے وہ قدم رکھتے ادھر تاج بگل بجاتا۔ سیکنڈز کا فرق نہیں ہوتا تھا۔ تاج بگلر بھی تاج تھا۔ ایک روز وقت ہو گیا کرنل صاحب سامنے سے آتے نظر نہیں آئے۔ اس نے بھی پرواہ نہیں کی اور جھٹ سے بگل بجا دیا۔ بگل بجنے کے کوئی ایک منٹ بعد کرنل صاحب اپنی مخصوص چال سے وارد ہوئے۔

''تاج بگل پہلے کیوں بجایا؟''

''نہیں جناب یہ کیسے ہو سکتا ہے''۔

اس نے ٹائم پیس آگے کر دی جو صبح ملائی جاتی تھی۔ ان کی اپنی گھڑی ایک منٹ پیچھے نکلی۔ انہوں نے گھڑی کلائی سے اتاری اور فرش پر دے ماری۔ اس واقعہ کے بعد وہ ایک گھڑی غسل خانے میں بھی رکھنے لگے تھے۔

اسی انٹرویو میں راجہ تاج کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۹۵۷ء کا ہے۔ بیس برس بعد ۱۹۷۷ء میں جب میں ان سے ملنے لارنس کالج ان کے بنگلے پر گیا تو چھا مار کے ملے۔ گھر میں مہمان بنا کے ٹھہرایا۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور بٹھایا۔ چلتے وقت بار بار کہا۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں لاہور جا رہا ہوں وہاں آنا۔

ساری، یہ تمیز کرنا میرے لئے ممکن نہیں

دسمبر ۱۹۵۸ء میں اسکین ہاؤس کے لڑکے اس نئے ہاؤس میں جس کا اس وقت نام گرین ہاؤس (بعد کو ٹیپو سلطان ہاؤس) تھا، منتقل ہوئے تو وہاں چند چھوٹے کمرے بھی تھے۔ ہاؤس کے لڑکوں میں ایک بڑے باپ کا بیٹا بھی تھا۔ فلیگ کار کے اس اونچے گھر سے فرمائش آئی کہ بچے کو علیحدہ کمرہ دے دیا جائے تو مہربانی ہوگی۔

''ساری، یہ کمرے پریفیکٹس کے لئے ہیں۔ یا تو ایسے چھوٹے کمرے سب کے لئے ہوں ورنہ کسی ایک لڑکے کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

ممبرز ٹو موو ٹو مائی پلیس، پلیز

کالج میں ٹینس کلب ایک عرصہ سے تھا۔ لیکن وہ اسٹاف کے سینئر ممبرز کے لئے مخصوص تھا۔ وہی کھیلتے تھے۔ لڑکوں کو اس کھیل کی جھلک بھی مشکل سے نظر آتی تھی (ٹینس کورٹ کالج ہسپتال کے پیچھے کے لان میں تھا) رفیق صاحب نے جب سینئر لڑکوں کو بھی آفیسرز کے ساتھ ٹینس کھیلنے کی اجازت دی تو چند لڑکوں نے اس رعایت سے فائدہ بھی اٹھایا۔ جب وہ پہلی بار کھیل کے کورٹ سے واپس آنے لگے تو ان کی مخصوص آواز گونجی۔

''ممبرز ٹو مائی پلیس، پلیز''۔

ان لڑکوں کو گمان بھی نہیں تھا کہ ان کا شمار بھی ممبرز میں ہونے لگا ہے۔ چنانچہ یہ اپنی جرسیاں اٹھا کر اپنے ہاؤسوں کی طرف چلنے لگے تو پھر وہی آواز آئی۔

''ممبرز ٹو موو ٹو مائی پلیس پلیز''۔

۱۸۶۲ لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی لکھتے ہیں افسری کی طرف یہ ہمارا پہلا قدم تھا۔

یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں

کمانڈنٹ آفس کے پیچھے اور اسکین ہاؤس کے دائیں طرف ایک کچی بیرک ہوا کرتی تھی۔ اس میں سینئر

کلاسز تھیں۔ رات کولڑکے پریپ کے لئے وہیں آتے تھے۔ پریپ کی چیکنگ کے لئے کرنل صاحب ضرور چکر لگاتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ان کا چھوٹے قد کا سفید کتا برآمدہ میں آ کے بیٹھ جاتا تھا۔ انہی دنوں سی آئی صاحب نے ایک عام کتا پال لیا۔ وہ ان کے ساتھ آتا تھا۔ ایک روز ہوا یہ کہ کمانڈنٹ کا چھوٹا کتا برآمدہ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ سی آئی صاحب کا کتا اس پر بری طرح پڑ گیا۔ پہلے تو انہوں نے اسے انگریزی میں تنبیہہ کی۔ جو اس نے سنی ان سنی کر دی۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ سامنے سے کمانڈنٹ صاحب پہنچا ہی چاہتے ہیں تو انہوں نے اس کے زور سے لات ماری اور پنجابی میں دھرُ دھرَ کہا تو اس نے اس نازک اندام کی جان چھوڑی۔ اتنے میں کمانڈنٹ صاحب آن پہنچے اور نارمل طریقے سے انتظامی باتیں شروع کر دیں۔ سی آئی صاحب سے صبر نہ ہوا انہوں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''آئی ایم ساری سر''۔

''کیوں کیا ہوا؟ ٹائیگر نے آپ کے'' ....

''یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ (فارگیٹ اٹ)''۔

یہ مہارت یوں ہی نہیں آجاتی

''۱۹۳۱ء عطا محمد نئے کالج پریفیکٹ کو کمانڈنٹ نے بلایا۔'' عطا محمد تم اپنے کمرے کے لئے سارے کالج کے لڑکوں کا چارٹ بناؤ۔ یہ دیکھو میرا چارٹ۔ میں ہر روز کم از کم ایک بار اسے ضرور دیکھتا ہوں۔ پھر باری باری ہر ہاؤس کے لڑکوں کو پہچاننے کا اپنا ٹیسٹ لیتا ہوں۔ مثلاً بغیر نام نمبر دیکھے میں یہ چیک کرتا ہوں کہ یہ کون ہے۔ کس کلاس میں ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ پھر اتنا جاننا ہی کافی نہیں۔ میں تمہیں اپنی ڈائری بھی دکھاتا ہوں۔ اس میں ہر لڑکے کو ایک صفحہ دیا ہوا ہے۔ اس میں اپنے مشاہدات اشاروں کی شکل میں لکھتا رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں انٹرویو بھی کرتا ہوں۔ لیکن اصل فائدہ لڑکے کو مختلف حالات میں دیکھنے سے ہوتا ہے۔ تمہیں بھی شاید حیرت ہوتی ہو کہ میں لڑکوں کو اتنا کیسے جانتا ہوں۔ اس کا راز

میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ یاد رکھو کہ کسی قسم کی مہارت یوں ہی نہیں آ جاتی''۔

آل رائٹ سر، آئی وانٹ مائی پوسٹنگ

جب کرنل رفیق ڈی جی ایم ٹی جنرل حمید کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہ بھپرے ہوئے بیٹھے تھے۔

''رفیق، تمہیں جاننا چاہیے کہ ڈسپلن آرمی کی پہلی ضرورت ہے''۔

''سر، میں خوب جانتا ہوں''۔

''آپ کے ڈائریکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ان کے احکامات کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں''۔

''سر، کون سے احکامات؟ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں، جی ایچ کیو کی اس واضح یقین دہانی پر گیا تھا کہ کسی کو معمول کے معاملات میں دخل دینے کا نہ حق ہے نہ ضرورت''۔

''میں کہہ چکا ہوں۔ ڈسپلن آرمی کی پہلی ضرورت ہے''۔

(رسمی سیلوٹ کرتے ہوئے) ''آل رائٹ سر آئی وانٹ مائی پوسٹنگ''۔

ٹو اے میچ لیس فرینڈ

گو رفیق صاحب سگریٹ ہمیشہ اپنا ہی پیتے تھے۔ لیکن غالباً سگریٹ کم کرنے کی مصلحت سے عموماً اپنے پاس ماچس کی ڈبیہ نہیں رکھتے تھے۔ حیدری صاحب ہی ان کا سگریٹ سلگاتے تھے۔ ان کے کالج سے جانے کے وقت حیدری صاحب نے ایک سگریٹ لائیٹر پیش کیا جس پر لکھا تھا ''ٹو اے میچ لیس فرینڈ'' رفیق صاحب اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ ایک عرصے کے بعد وہ ۱۹۸۱ء میں ان سے ملنے سینٹ جانس پارک لاہور گئے تو دیکھا کہ میز پر وہی لائٹر پڑا ہوا ہے۔ بریگیڈئر رفیق نے کہا۔

''حیدری صاحب۔ سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے لیکن لائیٹر سامنے پڑا ہے۔ یہ مجھے آپ کی اور کالج کی یاد دلاتا رہتا ہے''۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مسٹر حیدری لکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کالج کی یاد ان کے دل سے کبھی گئی ہی

نہیں۔ یہ ان کی پہلی محبت تھی۔

اسی لئے تو میں خود آگے چل رہا ہوں

یہ واقعہ ۱۹۵۹ء کے اواخر کا ہے۔ ۱۹ پنجاب المعروف بہ شیر شاہ بٹالین کوٹلی میں متعین تھی کہ پلٹن کو ۲۰ میل کی روٹ مارچ کی ایکسر سائز کا حکم ملا۔ یہ ایک طرح کی ٹیسٹ مارچ تھی۔ پانچ دس میل چلنے کے بعد بٹالین کے ایک سینئر افسر آگے آئے۔

''سر، راستہ بڑا خراب ہے۔ ہو سکتا ہے بٹالین مقررہ وقت میں ٹارگٹ تک نہ پہنچ سکے''۔

''اسی لئے تو میں آگے چل رہا ہوں اگر میں خود وقت پر نہ پہنچ سکا تو کسی اور سے باز پرس نہیں کروں گا''۔

یہ چارپائی کس کے لئے ہے؟

اواخر ۱۹۵۹ء کا قصہ ہے۔ ۱۹ پنجاب کوٹلی میں کیمپ کر رہی تھی کہ سی او کا بیٹا مری کالج سے چھٹی پر آیا۔ کیمپ میں سی او سمیت سب لوگ زمین پر سوتے تھے۔ پلٹن کے ایس ایم نے یہ سوچ کر کہ لارنس کالج سے آیا ہوا یہ بچہ زمین پر سونے کا عادی نہ ہوگا، دوڑ دھوپ کر کے چارپائی کا انتظام کیا اور اسے سی او کے ٹینٹ میں ایک طرف کو ڈلوا دیا۔ اوپر سے خود سی او آگئے۔

''یہاں یہ چارپائی کیسی پڑی ہے؟''

''سر، یہ آپ کے بیٹے ریاض صاحب کے لئے ہے۔ زمین پر لیٹنا ان کے لئے مشکل ہوگا''۔

''اگر میرے ہزار بیٹے زمین پر لیٹ سکتے ہیں تو یہ بیٹا بھی لیٹ سکتا ہے۔ آپ یہ چارپائی اٹھوا لیجئے''۔

میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں

یہ واقعہ ۱۹۵۹ء کا ہے۔ پنجاب رجمنٹ سنٹر مردان میں بٹالین کمانڈرز کی کانفرنس ہو رہی تھی کہ ۱۹ پنجاب کے سی او کچھ وقت نکال کر اوسی ہیڈ کوارٹر کمپنی کیپٹن (بعد کو لیفٹیننٹ کرنل) حق نواز کے پاس آئے۔

''کیپٹن حق نواز، میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں''۔

''حکم سر!''

''حکم کی بات نہیں ایک درخواست ہی ہے''۔

''فرمائیے میں حاضر ہوں''۔

''حق نواز بات یہ ہے کہ میری پلٹن ۱۹ پنجاب کے ایک سوپیر کا تبادلہ رحم کی بنیاد پر یہاں سنٹر میں ہو رہا ہے۔غریب کی بڑی فیملی پرابلمز ہیں۔آپ اسے جلد سے جلد کوئی گھر دے سکیں تو میں ممنون ہوں گا''۔

یہاں آپ میرے مہمان ہیں ڈرائیور نہیں

اپریل ۱۹۶۰ء میں ۱۹ پنجاب سیالکوٹ میں تھی۔اس کے سی او کو مارشل لاء ڈیوٹی پر سرگودھا جانا پڑا۔ قریب ہی میں ان کا چک تھا۔جب وہ اپنے گاؤں گئے تو ڈرائیور ساتھ تھا۔جب کھانے کا وقت آیا تو اسے اندر بلایا۔

''آؤ بشیر کھانا کھاؤ''۔

''سر، میں جیپ میں کھالوں گا''۔

''یہاں آپ میرے مہمان ہیں، ڈرائیور نہیں۔اس لئے میرے ساتھ ہی کھانا کھائیں''۔

اس وقت میں دوسرے بہت سے بیٹوں سے بات کر رہا ہوں

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ۱۹ پنجاب ۱۰۱ بریگیڈ کے ساتھ درگئی منتقل ہوئی۔پہلے پہاڑی لڑائی کے لئے تربیتی کیمپ کیا۔اس کے بعد پلٹن کو دیر باجوڑ آپریشن کے لئے آگے جانا تھا۔درگئی کے زمانہ تربیت کا واقعہ ہے کہ ایک رات پلٹن کے سی او پلٹن کے جوانوں سے خطاب کر رہے تھے کہ دفتر سے کلرک آیا کہ سی او صاحب کا فون ہے۔سی او نے اپنے ایجوٹنیٹ کو بھیجا دیکھو کیا بات ہے۔

''سر، لارنس کالج مری سے آپ کے بیٹے ریاض کا فون ہے۔وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں''۔

''ریاض سے کہہ دیجئے کہ اس وقت میں اور بہت سے بیٹوں سے ضروری باتیں کر رہا ہوں وہ کسی اور وقت فون کر لے''۔

ڈاکٹر، ہوش کی دوا کرو

یہ واقعہ اواخر ۱۹۶۰ء کا ہے۔ ۱۹ پنجاب کی پوری پلٹن روٹ مارچ کر کے مالا کنڈ سے درگئی نہر کے ساتھ واپس آ رہی تھی۔ مارچ بہت صبر آزما تھی۔ سارا دن پہاڑی علاقے میں چل کے سب کا برا حال ہو چکا تھا۔ بہر حال جب بریک ہوا تو سی او جوانوں میں گھوم رہے تھے کہ اس دوران ان کی نظر بٹالین کے ڈاکٹر پر پڑی جو اپنی پانی کی بوتل میں رسی باندھ کر مزے سے نہر سے پانی نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے''۔

''ڈاکٹر یہ کیا ہو رہا ہے''۔

''سر، پانی''۔

''جس جگہ سے پانی لینے کی اجازت نہیں وہاں سے پانی لینا ڈسپلن کے خلاف ہے۔ میرے جوانوں کے سامنے آئندہ ایسا کرنے سے پرہیز کیجئے گا''۔

تم ٹائم کیپر کے پاس گئے ہی کیوں؟

یہ واقعہ ۱۹۶۰ء کا ہے۔ ایک روز شام کو دیر باجوڑ کے علاقہ میں واقع منڈا قلعہ میں متعین ۱۹ پنجاب کے آفیسرز اور جے سی اوز میں باسکٹ بال میچ ہو رہا تھا۔ کرنل رفیق بھی آفیسرز کی ٹیم کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ مقابلہ سخت تھا۔ آخری تین منٹ تھے اور سکور برابر تھا۔ اس نازک موقع پر ٹائم آؤٹ لے کر سیکنڈ لیفٹیننٹ (اب لیفٹیننٹ کرنل) مسعود باہر آ گئے۔ اتنے میں آفیسرز کی ٹیم نے ایک باسکٹ کر کے دو پوائنٹ لے لئے۔ اب وقت تقریباً ختم ہونے کو تھا۔ لیفٹیننٹ مسعود ٹائم کیپر جے سی او کے پاس گئے اور اسے اپنی گھڑی دکھا کر کہا۔ میری گھڑی کے لحاظ سے ابھی دو منٹ باقی ہیں۔ ٹائم کیپر تذبذب میں

پڑ گیا۔ اتنے میں آفیسرز کی ٹیم نے اوپر تلے دو باسکٹ کر کے چار پوائنٹ حاصل کر لئے اور میچ جیت لیا۔
مسعود ٹائم کیپر کے پیچھے کھڑے اپنی فتح کے نعرے لگا رہے تھے کہ کرنل رفیق ایک بھپرے شیر کی طرح ان پر جا پڑے (انہوں نے مسعود کو ٹائم کیپر سے بات کرتے دیکھ لیا تھا) اور بہت سخت جھاڑ پلائی ایسی کہ سب سناٹے میں آ گئے۔ جب ذرا دھیمے پڑے تو مسعود نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو وہ پھر گرجے"۔
"لیکن تم ٹائم کیپر کے پاس گئے ہی کیوں؟ اس سے بات ہی کیوں کی"۔
"آئی ایم ویری ساری سر، ریئلی ساری سر" مسعود پشیمانی سے سر جھکا کر بولے تو پھر انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ایک افسر کو اس طرح کا اقدام کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ کسی کو ٹائم کیپر یا ریفری بنا دیا جائے خواہ وہ سپاہی ہی کیوں نہ ہو پھر اس کے کام میں دخل دینا یا اس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنا نہ صرف اسپورٹس مین اسپرٹ کے خلاف ہے بلکہ اخلاق اور ڈسپلن کے منافی بھی ہے۔
کھیل تو ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ہار جیت بھی کچھ دیر کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ لیکن کھیل کے دوران انسان جو رویہ اختیار کرتا ہے اس کے اثرات باقی رہتے ہیں اور پوری شخصیت کو متاثر کرتے ہیں۔ جو شخص کھیل کے میدان میں ضبط و تحمل اور حوصلہ کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں یہ رویہ کیسے بروئے کار لائے گا"۔

آپ لوگ اپنے اپنے گرنیڈ پر اپنی گرفت مظبوط رکھیئے

دیر باجوڑ آپریشن کے زمانے کی بات ہے کہ کرنل رفیق شاہی قلعہ کی فارورڈ کمپنی کو وزٹ کر کے بٹالین ہیڈ کوارٹر واپس جا رہے تھے کہ رات پڑ گئی۔ رات کے وقت وہ علاقہ محفوظ نہیں ہوتا۔ پھر یہ ہوا کہ ان کی جیپ بُری طرح خراب ہو گئی۔ اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مع گارڈ کے وہیں ٹھہرا جائے۔
اب مسئلہ سیکیورٹی کا تھا۔ کچھ دیر تو گارڈ چوکنے رہے پھر ڈرائیور، گارڈ سب اونگھنے لگے۔ اس کا ایک انوکھا حل انہوں نے سوچا۔

''خطرہ ہے آپ لوگ اپنے گرنیڈ نکال لیں''۔

چنانچہ سب نے اپنے ایچ ای ۳۶ گرنیڈ نکال لئے۔ ''ان کی پنیں نکال کے مجھے دے دیجئے''۔ سب نے پنیں نکال کے ان کے حوالے کر دیں۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہر ایک کی گرفت گرنیڈ کے لیور پر سخت تھی۔ اونگھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خود ان کے ہاتھ میں بھی پن نکلا گرنیڈ تھا۔ اسی طرح ہوشیاری سے جاگتے سب نے رات گزار دی۔

صوبیدار میجر (اب آنریری کیپٹن) محمد حنیف جو کرنل صاحب کے ساتھ تھے لکھتے ہیں۔

''یہ بڑے خطرے کا کام تھا۔ لیکن چونکہ کرنل صاحب نے خود خطرہ مول لیا ہوا تھا، سب چپ رہے۔ ان کی عادت تھی کہ خطرہ والا کام سب سے پہلے خود کرتے تھے''۔

مجھے اکیلے بلایا ہے میں اکیلے ہی جاؤں گا

دیر باجوڑ آپریشن کے زہوں مانے کا ذکر ہے کہ کرنل رفیق کو علاقہ کے ایک باغی سردار نے کھانے پر مدعو کیا تو انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ یونٹ کے افسروں کو معلوم ہوا تو وہ پریشان ہوئے۔

''سر، اس میں ضرور کوئی چال ہے۔ آپ نہ جائیں تو بہتر ہے''۔

''سر، اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے''۔

''یا پھر، آپ کم از کم مسلح گارڈ ہی ساتھ لے جائیں''۔

''گارڈ نہیں تو دو چار آدمی ہی بھیس بدل کر خادموں کی طرح ساتھ ہوں جو کمبلوں میں چھوٹے ہتھیار چھپا کر لے جائیں تا کہ ان کی نیت خراب ہو تو اس کا بھی انتظام ہو''۔

''آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ سردار نے خیر سگالی کے طور پر مجھے اکیلا بلایا ہے۔ میں اکیلے ہی جاؤں گا۔ مارے جانے یا پکڑے جانے کے خوف سے وہاں نہ جانا نہ صرف بزدلی ہوگی بلکہ یہ قومی مفاد کے بھی خلاف ہوگا''۔

اگر کوئی آدمی جیپ کے ساتھ دریا میں گرے گا تو وہ میں خود ہوں گا

ایک دفعہ دیر باجوڑ کے علاقہ میں کرنل رفیق خود جیپ چلا رہے تھے۔ سڑک پتلی اور خراب تھی۔ اتفاق سے جیپ تھوڑی سی سلپ ہوئی اور اس کا ایک پہیہ سڑک کے کنارے میں پھنس گیا۔ ایک فٹ ادھر سینکڑوں فٹ نیچے ایک دریا تھا۔ ڈرائیور نے فوراً نیچے اتر کر گاڑی کے پیچھے پتھر رکھے۔ اب گاڑی کو اس جگہ سے نکالنا ایک مرحلہ تھا۔

''سر آپ اس سائیڈ سے باہر آ جائیں۔ میں گاڑی نکالنے کی کوشش کرتا ہوں''۔

(قریب ہی یونٹ کے کچھ جوان اور عہدیدار کام کر رہے تھے وہ بھی بھاگ کر آئے)

''سر آپ اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں ڈرائیور کو گاڑی نکالنے دیں''۔

''سر یہ نائیک تجربے کار ہے۔ جلد گاڑی نکال لے گا''۔

''جیپ میری غلطی سے میرے ہاتھ سے اس طرح پھنسی ہے۔ اب خطرہ ہو یا نہ ہو، میں اسے خود باہر نکالنے کی کوشش کروں گا تاکہ اگر کوئی ایک آدمی جیپ کے ساتھ دریا میں گرے تو وہ میں خود ہوں گا''۔

آپ بٹالین ہیڈکوارٹر اتنی دیر سے نہ آیا کریں

دیر باجوڑ آپریشن کے زمانے میں ۱۹ پنجاب کا دربار ہو رہا تھا۔ پہلے تو معمولی رسمی کارروائی ہوتی رہی۔

''کوئی اور مسئلہ، کوئی اور رینک کوئی اور بات کہنا چاہتا ہے''۔

''سر، مجھے کچھ کہنا ہے''۔

''جی''

(بڑے جذباتی انداز میں) سر، آپ بٹالین ہیڈکوارٹر اتنی رات گئے واپس نہ آیا کریں۔ جب تک آپ بخیریت واپس نہیں آ جاتے میں سو نہیں سکتا''۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا اللہ مالک ہے''۔

پالش کی خالی ڈبیاں

''ہمارے ٹینٹ میں کچھ پالش کی خالی ڈبیاں پڑی ہوں گی؟''

''سر، خالی ڈبیاں؟''

''جی ہاں، پالش کی خالی ڈبیاں چاہئیں''۔

''سر، شاید دو ایک پڑی ہوں۔ میں خالی ڈبیاں پھینک دیتا ہوں''۔

''دیکھو تلاش کرو، دو چار مل جائیں تو اچھا ہے''۔

''سر خالی ڈبیوں کا کیا کرنا؟''

''بس ضرورت ہے، ایک ننھے دوست نے مانگی ہیں''۔

''سر، آپ حکم دیں۔ ڈبیوں کی کیا کمی ہے۔ آپ جتنی کہیں بھری ڈبیاں خالی کر دیتے ہیں''۔

''صوبیدار میجر صاحب، پالش ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ شام کو میں کیمپ میں گھومنے کے لئے نکلوں گا تو دیکھا جائے گا۔ اپنے دوست کے لئے یہ کام کر کے مجھے خوشی ہو گی''۔

یہ کرنل رفیق تھے اور وہ دوست جس نے ان سے پالش کی خالی ڈبیوں کی فرمائش کی تھی ایک نابینا لڑکا تھا جس کو وہ اپنی جیپ میں بٹالین ہیڈ کوارٹر سے پلٹن کی اگلی پوسٹوں پر جاتے ہوئے لفٹ دیا کرتے تھے۔ اس نے ایک دن فرمائش کر دی کہ مجھے پالش کی خالی ڈبیاں چاہئیں۔ یہ واقعہ ۱۹۶۰ء کا ہے۔

حمید صاحب، میرا ضمیر صاف ہے

''بیگم صاحبہ کی بینائی جانے کا سن کر بہت افسوس ہوا''۔

''حمید صاحب کیا عرض کروں۔ جو اللہ کو منظور ہو''۔

''تکلیف کیا ہوئی تھی''۔

''یہ ۱۹۶۰ء کے شروع دنوں کی بات ہے۔ میری یونٹ سیالکوٹ میں تھی کہ فوراً دیر باجوڑ آپریشن کے لئے

آگے جانے کا حکم ملا۔ یونٹ کا کہیں جانا اپنی جگہ بڑا کام ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اسے کسی آپریشن میں بھی حصہ لینا ہو اس کی تیاری اور مصروفیات کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ انہی دنوں مجھے خط ملا کہ ان کی آنکھوں میں سخت تکلیف ہوگئی ہے۔ میں چھٹی لے کر جلد پہنچوں''۔

''تو پھر آپ گئے''۔

'' کیسے جاتا۔ سپاہی کی زندگی میں ایک آدھ بار ہی تو ایسا موقع آتا ہے جب اسے فرض پکارتا ہے۔ حمید صاحب مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ جب میں ۱۹۶۱ء میں اس اہم آپریشن سے فارغ ہو کر گھر گیا تو ان کی بینائی جا چکی تھی۔ اللہ کو یہی منظور تھا''۔

''کبھی آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ آپ بروقت آ جاتے تو شاید ان کی آنکھیں بچ جاتیں''۔

''خود مجھے تو خیال نہیں آتا۔ لیکن بعض دوستوں نے ضرور یہ کہا کہ مجھے سب کچھ چھوڑ کے گھر جانا چاہیے تھا''۔

''تو پھر آپ نے کیا جواب دیا''؟

''میں نے یہی کہا کہ اول تو یہ فوج کی نوکری میں ممکن ہی نہیں ہوتا اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ میری عدم موجودگی میں سرگودھا، ملتان وغیرہ میں ان کا تھوڑا بہت علاج ہوا بھی۔ اگر میں موجود ہوتا تو شاید یہی علاج ذرا زیادہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوتا یا شاید میں کسی بہتر سپیشلسٹ کو دکھا سکتا۔ لیکن بہرحال شفاء تو اللہ ہی کو دینی ہے''۔

''پھر بھی اپنی کوشش تو کرنی ہوتی ہے''۔

''حمید صاحب بہرحال میرا ضمیر بالکل صاف ہے۔ کچھ بھی ہو، فوقیت بہرحال فرض کی آواز کو ہوتی ہے۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا''۔

یہ تحفہ مختلف قسم کا ہے

۱۹۶۴ء میں رفیق صاحب جی ایچ کیو میں پوسٹ تھے اور ای ایم ای میس میں فروکش تھے کہ ۱۲۴۱۲ اصغر ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی سائیڈ ٹیبل پر اعلیٰ قسم کے سیب پڑے تھے۔ اصغر کو دیکھ کر انہوں نے مزید سیب منگوائے۔

اصغر نے ان کے رنگ اور خوشبو کی تعریف کی تو انہوں نے کہا۔

''صرف تعریف کافی نہیں، ان سے انصاف بھی کرنا ہے یہ سب تحفے کے ہیں''۔

''تحفے کے ہیں''۔ اصغر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں تحفے کے ہیں لیکن یہ تحفہ مختلف قسم کا ہے۔ دیر باجوڑ سے آئے ہوئے مجھے تین چار سال ہو گئے۔ وہ لوگ مجھے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ہر سال ایک بڑا ٹوکرہ اعلیٰ قسم کے سیبوں کا بھیجتے ہیں۔ ان کی مہربانی ہے۔ بڑی مہربانی''۔

ایک امریکی افسر کو جھاڑ

کھاریاں کلب میں ایک سینئر امریکی افسر کو الوداعی ڈنر دیا جا رہا تھا۔ امریکی صاحب کچھ ترنگ میں تھے۔ اپنی تقریر میں یہ بھی کہہ دیا۔

''میری خواہش تھی کہ میں پاکستان میں کچھ عرصے اور ٹھہر سکتا تا کہ پاکستانی افسروں کو ادب و آداب سمیت کچھ سکھا سکتا''۔

یہ سن کر کرنل اسٹاف رفیق ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''معاف کیجئے۔ ہماری تاریخ اس دور سے بھی پہلے کی ہے جب آپ کا جغرافیہ بھی متعین نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک ادب و آداب کا تعلق ہے ہمیں آپ سے کچھ نہیں سیکھنا''۔

اس ڈنر پر کور کمانڈر صاحب بھی موجود تھے۔ لیکن جب پاکستان یا پاکستانیوں کے وقار کا سوال آئے تو وہ کسی پروٹوکول کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

آگ بجھادو

مئی ۱۹۶۵ء میں راولاکوٹ سیکٹر کی کمان سنبھالنے کے بعد بریگیڈئر رفیق نے حسب عادت پہلا کام یہ کیا کہ اپنے زیرکمان علاقے کو اپنی آنکھوں دیکھنے کے لئے پیدل چل کھڑے ہوئے۔ یہ تمام علاقہ نہ صرف سخت دشوار گزار ہے بلکہ اس زمانے میں برف سے ڈھکا ہوا بھی تھا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق اپنی کمان کے دائیں طرف سے شروع ہوئے اور وادیوں کو ہساروں اور پہاڑوں پر سے ہوتے ہوئے کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) مسعود کی پوسٹ پیر گنٹھی پر پہنچ گئے۔ یہ پوسٹ ایک پہاڑی کے دامن میں تھی۔ اوپر سے یہاں تک پہنچنے کے لئے برف کاٹ کر سیڑھیاں سی بنائی گئی تھیں۔ پوسٹ کے جوانوں سے وہ بڑی بے تکلفی سے ملے۔ یوں جیسے کوئی بچھڑے ساتھیوں سے ملتا ہے۔ وہ رات انہوں نے اس کا بھی خاص نوٹس نہیں لیا۔ مسعود نے کچھ لکڑیاں جلا کر گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لکڑیاں تو پانی پڑنے سے گیلی ہوگئی تھیں۔ دھواں دینے لگیں۔

''میزبانی کا شکریہ آگ بجھادو''۔

سر، بغیر ایمونیشن کے کیا ہوسکتا ہے

حاجی پیر پاس کی لڑائی میں ۱۲اے کے بریگیڈ کی ایک بٹالین پر تمام دن پے بہ پے حملے ہوئے۔ شام تک اس کا سارا ایمونیشن ختم ہوگیا۔ رات کے متوقع اور دوسرے روز کے امکانی حملوں سے نمٹنے کے لئے کچھ نہ رہا۔ بٹالین کمانڈر نے اس صورت حال سے بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو مطلع کیا اور آٹھ سو گز پیچھے ہٹ کر دوسری دفاعی لائن سنبھالنے کی اجازت چاہی۔ بی ایم نے تائید کی۔

''سر پھر یہ بھی ہے کہ وہاں تک ایمونیشن پہنچانا ناممکن نہیں تو قریب ناممکن ضرور ہے۔ جی ون صاحب آپ کیا کہتے ہیں''۔

''بٹالین کمانڈر کی سچوایشن رپورٹ کا تقاضا بھی یہی ہے''۔

’’میں نے آپ دونوں کے دلائل اور بٹالین کمانڈار کی رپورٹ پر بہت غور کیا ہے‘‘۔

’’رہا ایمونیشن تو اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ٹروپس نہیں تو مجاہد کمپنی استعمال کی جائے۔لیکن بٹالین پیچھے نہ ہٹے‘‘۔

بی ایم میجر (اب بریگیڈیئر) مناظر حسین لکھتے ہیں۔

’’بریگیڈ رفیق کے کردار کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ فیصلہ غیر متوقع نہ تھا۔لیکن یہ فیصلہ ان کی عسکری فراست کا مظہر بھی تھا۔انہوں نے ایک اور بٹالین کو جو ایک میل پیچھے ایک اور فیچر پر متعین تھی حکم دیا کہ اس اگلی بٹالین کو جیسے بھی ہو راتوں رات چھوٹے ہتھیاروں کا ایمونیشن پہنچایا جائے۔ چنانچہ ضروری ایمونیشن پہنچا دیا گیا اور جیسا کہ ان کا خیال تھا کہ رات کو کوئی حملہ نہیں آئے گا واقعی نہیں آیا۔صبح تک بٹالین نئے حملے سے نمٹنے کے لئے تیار تھی‘‘۔

آپ قرآن ہاتھ میں لئے رو رہے تھے؟

ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں کشمیر کے محاذ پر ۱۲اے کے بریگیڈ کے کمانڈر اپنے کمان بنکر میں قرآن پاک ہاتھ میں لئے زاروقطار رو رہے تھے۔ بریگیڈ کے ڈاکٹر کی نظر پڑی تو انہیں تعجب ہوا اس وقت تو مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔

دوسرے روز انہوں نے پوچھ لیا۔

’’سر کل آپ قرآن پاک ہاتھ میں لئے رو کیوں رہے تھے‘‘۔

’’ڈاکٹر بڈوری بلج کی اس لڑائی میں کل کا معرکہ بہت اہم تھا۔ میں تو کمان بنکر میں بیٹھا رہنمائی ہی کرتا ہوں۔اصل لڑائی تو میرے جوان اور افسر ہی لڑ رہے ہیں۔پاکستان کی عزت اور اپنی عزت کا معاملہ ہے۔اس وقت بے اختیار جی چاہا کہ اللہ تعالی سے اس کی نصرت مانگوں۔شکر ہے کہ اللہ نے میرے بیٹوں کو سرخرو کیا‘‘۔

بی ایم دربار کا انتظام کرو

یہ واقعہ ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں کشمیر کے محاذ کا ہے۔ بریگیڈئر رفیق ۱۲اے کے بریگیڈ کو کمان کر رہے تھے۔ بڈوری بلج کے پورے محاذ پر دشمن کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔ خصوصاً حاجی پیر پاس کے علاقے میں۔ اس نازک وقت میں بریگیڈ کمانڈر نے معمول کا دربار منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔

''بی ایم، دربار کا انتظام کرو''۔

''دربار یہاں اس وقت''؟

''جی ہاں اور یہاں اسی جگہ''۔

اس واقعہ کے راوی لیفٹیننٹ کرنل محمد شعیب اخوندزادہ لکھتے ہیں۔ ''چنانچہ اِن کے حکم کے مطابق دربار اگلی دفاعی چوکیوں کے ٹھیک پیچھے ہوا۔ اس وقت انکے بازو کی ایک بٹالین پر دشمن کا بھاری فائر آرہا تھا۔ یہ نہیں کہ انہیں صورت حال کا احساس نہیں تھا۔ انہوں نے بٹالین کمانڈر سے برابر رابطہ رکھا ہوا تھا اور دربار بھی کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ٹروپس سمجھیں کہ لڑائی تو بہادروں کا کھیل ہے''۔

کرنل اخوندزادہ مزید لکھتے ہیں۔ بڈوری بلج کی لڑائی میں ان کے بریگیڈ پر بہت ہی زیادہ دباؤ تھا۔ لیکن ان کا عزم غیر متزلزل تھا۔ انہوں نے نہ خود خم کھایا اور نہ کسی کو خم کھانے دیا۔ ایک موقعہ پر ایک بٹالین کے سی او کو بتایا گیا کہ بریگیڈ کمانڈر لائن پر ہیں تو ان کی جرأت نہ ہوئی کہ خود ریسیور اٹھائیں۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے ایجوٹینٹ کو اشارہ کیا کہ آپ فون سن لیں اور میرے لئے کوئی پیغام ہو تو نوٹ کرلیں۔ بٹالین کے سی او بڑے ذہین آدمی تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ اس وقت بریگیڈ کمانڈر ان سے کیا بات کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس محاذ پر حالات اتنے خراب تھے کہ اگر بریگیڈیئر رفیق اس سیکٹر کو کمانڈ نہ کر رہے ہوتے تو سارا سیکٹر ہی دشمن کے پنجہ استبداد میں چلا جاتا۔

بریگیڈ ہیڈکوارٹر اور یہاں

جب نومبر ۱۹۶۵ء میں کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) محمد لطیف ۱۶ اے کے بریگیڈ میں کوارٹر ماسٹر پوسٹ ہوئے اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں جا کر رپورٹ کی تو اس کی حالت دیکھ کر انہیں شاک سا ہوا۔ نہایت خستہ حالت میں ایک پرانی سی ہٹ تھی۔ جس میں ایک طرف بریگیڈ کمانڈر نے اپنا دفتر قائم کر رکھا تھا اور دوسری طرف ان کا بستر لگا تھا۔ لطیف نے ملڑی کالج میں ان کے دفتر اور بنگلہ کو دیکھا تھا۔ دونوں جگہوں کی پرُشکوہ نفاست دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں درویشانہ رنگ تھا۔ بہر حال لطیف اتنے جونیئر تھے کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھا اور دیکھ کر چپ رہے۔ ایک روز بریگیڈئر رفیق نے خود ہی کالج کا ذکر چھیڑ دیا اور پرانی باتیں دہرائی جانے لگیں تو یکا یک پوچھا۔

''لطیف، یہاں کوئی تکلیف تو نہیں''۔

مجھے تو کوئی تکلیف نہیں لیکن سر، بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کرنے کے دن ہی مجھے اس جگہ کی حالت دیکھ کر بڑا شاک ہوا۔ سر، اس جگہ تو کوئی بھوسہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ آپ بریگیڈ کمانڈر ہیں کچھ تو رکھ رکھاؤ ہونا چاہیے۔ اب تو سیز فائر ہو چکی ہے۔ میں کوارٹر ماسٹر ہوں اگر آپ اجازت دیں تو ہیڈکوارٹر اور آپ کی رہائش کا خاطر خواہ بندوبست کرنے کی کوشش کی جائے''۔

تمہاری دلچسپی کا شکریہ، ویسے کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ابھی حالت جنگ میں ہیں اور یہ پورے تھیٹر آف وار کا سب سے حساس علاقہ ہے۔ یہاں بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو بہتر بنانے اور بریگیڈ کمانڈر کو رہائشی سہولتیں دینے سے بہت زیادہ اہم مسائل موجود ہیں جن پر توجہ دینا زیادہ ضروری ہے۔ تم ان کی فکر کرو۔ میں ٹھیک ہوں اور پھر لطیف، تم جانتے ہو کہ سپاہی کی شان ہی یہ ہے''۔

اس ہٹ پر تمہارا حق زیادہ بنتا ہے

بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے قریب ایک بہت پرانی دو کمروں کی ہٹ تھی۔ وہ بارش سے گر گئی۔ اس کو دوبارہ تعمیر

کرنے میں کوارٹر ماسٹر کیپٹن لطیف نے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ مقامی ہونے کی وجہ سے ضروری سامان اکٹھا کرنا ان کے لئے کچھ آسان بھی تھا۔لطیف کا خیال تھا کہ ہیڈ کوارٹر کے لئے یہ نئی ہٹ زیادہ موزوں ہوگی۔ابھی ہٹ میں ایک آدھ دن کا کام باقی بھی تھا کہ بریگیڈئر رفیق نے خود ہی یہ مسئلہ چھیڑا۔

''لطیف نئی ہٹ میں کتنا کام باقی ہے''۔

''بس سر، ایک آدھ دن اور لگے گا''۔

''میرا خیال ہے کہ اس ویک اینڈ پر جا کر تم اپنی فیملی کو لے آؤ''۔

''اس ہٹ میں''؟

''ہاں ہاں، حرج ہی کیا ہے، میرا خیال ہے کہ اس ہٹ پر تمہارا حق زیادہ بنتا ہے۔تمہاری بچی تم سے بہت مانوس ہے نا۔اسے لے آؤ۔گرمی میں تو رہو پھر دیکھا جائے گا''۔

کرنل لطیف لکھتے ہیں۔

''یہ کرم کچھ میرے لئے مخصوص نہیں تھا۔دوسرے افسروں کو بھی کہہ کہہ کے ویک اینڈ بھیجتے تھے اور مری تک گاڑی دیتے تھے۔ جوانوں کا خیال اس سے زیادہ تھا۔ حاجی پیر پاس اور بھرت گلی کی دور دراز پوسٹوں پر جہاں پہنچنے میں دس گھنٹے لگتے تھے وہ ضرور جاتے تھے۔جوانوں کی تفریح اور ''موٹی ویشن'' کے لئے بریگیڈ قوالی پارٹی بنا رکھی تھی۔ وہ جوانوں کے ساتھ بھنگڑا تک ڈالتے تھے''۔

سر، یہ درخواستیں آپ کا بہت وقت لے رہی ہیں

باغ سیکٹر کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں مقامی لوگوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا جو قسم قسم کی درخواستیں اور ضرورتیں لے کر آتے تھے۔ یہ اچھا خاصا اضافی کام تھا۔ بیشتر درخواستیں کیو ایم کو مارک ہوتی تھیں، وہ بھی یہ کام کر کر کے تنگ آ گئے تھے.........ایک روز انہوں نے موقعہ پا کر یہ ذکر چھیڑا۔

''سر، یہ درخواستیں اور یہ لوگ آپ کا بہت وقت لے رہے ہیں''۔

''ان میں سے کچھ جھوٹ بھی بولتے ہوں گے۔لیکن بیشتر واقعی مظلوم اور مجبور ہوتے ہیں۔انکی ہم نہیں سنیں گے تو کون سنے گا۔لڑائی نہیں تو یہ کام ہی سہی''۔

جب کمانڈر کو سردی نہیں لگتی تو جوان کو کیوں لگے

یہ ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔۱۶اے کے بریگیڈ کمانڈر ایک رات حاجی پیر کے علاقے میں ایک پوسٹ چیک کرنے نکلے۔موسم بہت سرد تھا۔پھر یکا یک برف باری شروع ہوگئی۔جب وہ پوسٹ پر پہنچے تو سنتری چوکس کھڑا تھا۔

''جوان کیسے ہو''؟

''ٹھیک ٹھاک سر''؟

''سردی نہیں لگتی''؟

''جناب، جب کمانڈر کو سردی نہیں لگتی تو جوان کو کیوں لگے؟''

یہ دوسرا کمبل کہاں سے آیا؟

یہ واقعہ ۱۹۶۶ء کا ہے ۱۶ اے کے بریگیڈ کے کمانڈر اور ان کے بی ایم ایک ایکسرسائز کے سلسلے میں ایک ایسی پوسٹ پر پہنچے جو آٹھ نو ہزار اونچی چوٹی پر واقع تھی۔آدھی رات کا وقت، سخت سردی، اور ہالٹ صرف دو گھنٹے کا۔اسی عرصے میں کھانا، پینا اور آرام کرنا تھا۔بی ایم کو ہلکا نزلہ بھی تھا۔جوں ہی انہوں نے ایک پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے اپنا کمبل اوپر کیا تو ان کی آنکھ لگ گئی۔جب تقریبا آدھ پون گھنٹے کے بعد چلنے پھرنے کے شور سے ان کی آنکھ کھلی اور گھڑی دیکھی تو کچھ وقت کا اندازہ ہوا۔لیکن حیرت اس بات پر کہ میں تو اپنا ایک کمبل لے کر سویا تھا یہ دوسرا کمبل کہاں سے آیا۔لیکن یہ راز جلد کھل گیا۔جوں ہی وہ کمانڈر کا حال احوال معلوم کرنے آگے بڑھے تو دیکھا کہ وہ ایک درخت کے سہارے صرف اپنا اوورکوٹ پہنے سو رہے ہیں۔

یہ بی ایم (اب لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال) لکھتے ہیں۔

''میں فوراً سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے سردی سے بچانے کے لئے اپنا کمبل میرے اوپر ڈال دیا تھا''۔

یہ حق تمہارا بنتا ہے

اواخر ۱۹۶۷ء میں کشمیر کے اوڑی سیکٹر میں کنٹرول لائن کے اس پار دشمن کی نقل و حرکت میں یکا یک غیر معمولی اضافہ ہوگیا تو بریگیڈئر رفیق نے اپنے بی ایم کو صورت حال کا مطالعہ کرنے اور ایک رپورٹ تیار کرنے کو کہا۔ بی ایم نے تمام امکانی ذرائع کو بروئے کار لا کر ایک پیپر تیار کر کے کمانڈر کو پیش کر دیا۔ انہوں نے اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ کر کے اسے مکمل اور متوازن صورت میں ۱۲ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر کو بھیج دیا۔ وہاں سے اس کی ایک کاپی اوپر جی ایچ کیو کو گئی۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز نے اس پیپر کو بہت سراہا اور ڈویژن سے ایک خط بریگیڈ کمانڈر کے نام آیا جس میں اس کاوش کی بہت تعریف کی گئی تھی۔

کمانڈر بہت خوش ہوئے اور بی ایم کو بلا کر کہا۔

''اقبال! مبارک ہو۔ یہ خط تم نے دیکھا؟ لیکن یہ حق تمہارا بنتا ہے''۔

اس وقت کے بی ایم (لیفٹیننٹ جنرل) محمد اقبال لکھتے ہیں۔

''بریگیڈیئر رفیق نے صرف زبانی مبارکباد پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسی وقت ایک خط جی او سی کے نام ڈرافٹ کیا اور وضاحت کی کہ نوے فیصد کام میرے بی ایم نے کیا تھا۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ توصیفی خط براہ راست انہیں لکھا جائے۔ چنانچہ ہفتہ عشرہ کے اندر وہ خط مجھے مل گیا''۔

زندگی کا طویل اور کٹھن سفر اسے تنہا ہی طے کرنا ہے

۱۹۶۸ء کے اواخر کی بات ہے کہ میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) محمد مسعود خان کا جب پی ایم اے تبادلہ ہوا تو وہ اپنے پرانے سی او اور گرو بریگیڈئر رفیق سے روشنی لینے گے۔ انہی دنوں رفیق صاحب کا اکلوتا بیٹا ریاض پی ایم اے کے لئے منتخب ہوا تھا۔ مسعود خان نے اس کی مبارکباد دی تو انہوں نے کہا:

’’مبارکباد کا شکریہ، لیکن نوٹ کر لو کہ ریاض کی کوئی رعایت نہیں کرنی بلکہ زیادہ سختی کرنی ہے۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دو۔ آخرکار زندگی کا طویل اور کٹھن سفر اسے اپنے ہی پیروں سے طے کرنا ہے‘‘۔

کم ٹوشن جنرل

یہ واقعہ ۱۹۶۹ء کے مارشل لاء کے زمانے کا ہے۔ سیالکوٹ میں پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین کو پرچم عطا کرنے کی تقریب تھی۔ سی ایم ایل اے جنرل یحیٰی خان مہمان خصوصی تھے۔ قومی ترانہ بجتے وقت بھی مخمور تھے اور ٹھیک طریقے سے اٹن شن پوزیشن میں کھڑے نہیں ہو پا رہے تھے۔ ان کی لڑکھڑاہٹ سب کے لئے باعث پریشانی تھی۔ لیکن سب دم بخود تھے۔ ۱۰۱ بریگیڈ کے کمانڈر سے نہ رہا گیا اور وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں دھاڑے۔

’’کم ٹوشن جنرل‘‘۔

یہ سن کر سب سناٹے میں آ گئے۔ تقریب کے بعد بریگیڈئر کے سینئر دوستوں نے کہا۔

’’رفیق یہ تم نے کیا کیا؟‘‘

یہ قومی پرچم کے وقار کا سوال تھا جو ہر فرد سے بلند ہے۔ کسی کو تو یہ کہنا تھا‘‘۔

سزا اپنی جگہ، مروت اپنی جگہ

۱۹۶۹ء کے مارشل لاء کے زمانے میں ای بی آر کے سنٹر کمانڈنٹ کرنل موجمدار باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوئے اور گرفتار کر لئے گئے تو انکوائری کے لئے یہاں سے بریگیڈئر رفیق بھیجے گئے۔ کرنل موجمدار نے اپنا فوجی کیئریر ۱۹ پنجاب سے شروع کیا تھا اور آخر میں اسی کو کمان بھی کیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ۱۹ پنجاب کے ایک سابق سی او کو ایک دوسرا سابق سی او ٹرائی کر رہا تھا۔ موجمدار کا جرم ثابت ہوا اور بریگیڈئر رفیق اسے اپنے ساتھ ہوائی جہاز میں بٹھا کر ڈھاکہ سے لائے اور اسے یہاں نظر بند کر دیا گیا۔ پھر رفیق صاحب نے بٹالین کے رشتے سے بٹالین کے لوگوں کو اجازت دی کہ جو چاہے

بٹالین کے پرانے سی او سے مل سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ اس سے ملے بھی اور بٹالین کے حوالے سے موجمدار کی روزمرہ کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ یہ دیکھ کر میجر مسعود نے پوچھ لیا۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ موجمدار کو سزا بھی آپ نے سنائی اور اب یہ خاطرداریاں بھی ہیں''۔

''مسعود! سزا اس کے کئے کی ہے۔ لیکن یہ لحاظ بٹالین کے رشتے کی وجہ سے ہے۔ سزا اپنی جگہ مروت اپنی جگہ''۔

میں یہاں سوشل نہیں ہوسکتا

۱۹۶۹ء کے اواخر میں لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر بریگیڈئر رفیق سے جو ان دنوں گورنر کی انسپکشن ٹیم کے چیئرمین تھے۔ شام کو ان کے میس میں ملے۔ رفیق صاحب میس کے لان میں اکیلے ٹہل رہے تھے۔ سلطان حیدر نے چہیتے شاگرد ہونے کے ناطے شوخی کی۔

''سر، ڈھاکہ کی خوبصورت شامیں آپ میس کے کمرہ اور لان میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ڈھاکہ تو اپنی سوشل لائف کے لئے مشہور ہے''۔

''بجنوری میرے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ میں یہاں سوشل نہیں ہوسکتا۔ جب آنا جانا ہوگا تو لوگوں سے تعلقات بھی ہوں گے۔ اگر کسی کا کھایا تو اس کا گانا بھی پڑے گا۔ اس لئے اس گوشہ تنہائی میں مگن ہوں''۔

میرا دل حج پر جانے کو چاہتا ہے

مئی ۱۹۷۱ء میں رفیق صاحب ۱۴ ڈویژن ڈھاکہ کے میس میں ٹھہرے تھے اور مجیب کے مقدمے کے لئے استغاثہ کے کیس کا بنیادی کام کر رہے تھے۔ ۱۶۲۸ء میجر (اب بریگیڈئر) محمد اکرم ان سے ملاقات کے لئے آئے۔ اولڈ بوائز کو دیکھ کر وہ کھل اٹھتے تھے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کالج کا ذکر بھی آیا۔ پھر یکا یک کھو سے گئے۔

''اکرم اب کبھی کبھی میرا دل شدت سے حج پر جانے کو چاہتا ہے اور جاؤں بھی اس طرح کہ ماہ دو ماہ وہاں رہوں تا کہ میں کچھ ارتکاز کر سکوں''۔

انتیس نہیں تیس؟

عوامی لیگ اور مکتی باہنی کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ملٹری ایکشن ۲۵ مارچ ۷۱ء کی رات کو شروع ہوا تھا۔ اس وقت ڈھاکہ چھاؤنی میں جو تھوڑے بہت ٹروپس تھے وہ ڈھاکہ شہر میں باغیانہ سرگرمیوں سے نمٹنے میں مصروف تھے۔ ۲۶ مارچ کو صورت حال یہ تھی کہ ڈھاکہ چھاؤنی ایک لحاظ سے خالی پڑی تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر سارے آفیسرز بھی باہر تھے۔ ۱۴ ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر کے ڈی کیو ۱۵۱۹ میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) رب نواز کو دوپہر کے قریب خبر ملی کی چھاؤنی کی نئ طفیل کالونی پر جہاں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے بیشتر افسروں کے بیوی بچے فروکش تھے، رات کو مکتی باہنی کا حملہ ہوگا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ افسروں کے گھروں کو لوٹنے کا پکا منصوبہ بنایا گیا ہے بلکہ ان کے ارادے تو اور بھی خراب ہیں۔ باقاعدہ فوجی دستے تو اس وقت چھاؤنی میں تھے ہی نہیں، کالونی کو بچانے کیلئے میجر رب نواز نے ''ایل او بیز'' ہی سے کام لینے کے بارے میں سوچا۔ بیٹ مین، منیجرز، کلرک وغیرہ جو لوگ بھی آس پاس نظر آئے ان کے ذریعے سب ''ایل او بیز'' کو اطلاع کروائی کہ سب لوگ شام کو چھ بجے اسٹیشن ہیڈ کوارٹر پر جمع ہوں۔ ''آر وی'' کا انتظام کرنے کے بعد میجر رب نواز طفیل کالونی گئے اور آفیسرز کے خاندانوں کو بتایا کہ افواہ یہ ہے لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کالونی کے تحفظ کے لئے ہم ضروری اقدامات کر رہے ہیں۔ شام ہوئی تو لڑائی سے باقی ماندہ لوگ ''آر وی'' پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن ان کے جمع ہوتے ہوتے خاصی دیر ہوگئی اور اندھیرا سا چھانے لگا۔ چونکہ ہیڈ کواٹر کے آس پاس پیڑ تھے اندھیرے کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ رب نواز نے مناسب یہی سمجھا کہ اب مزید انتظار نہ کیا جائے اور جو لوگ آ گئے ہیں انہی کو منظّم کیا جائے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ان افراد میں ہتھیار تقسیم کئے اور پھر ان کو

ایک لائن میں فالن کروایا تاکہ ان کی گنتی کر کے ان کو سیکشنوں میں بانٹ دیا جائے اور ان کا ٹاسک ان کو سمجھا دیا جائے۔ چنانچہ سب فالن ہوگئے اور گنتی شروع ہوئی۔ ایک، دو، تین، چار........ اس طرح گنتے گنتے جب قطار کے آخری آدمی کی آواز آئی اٹھائیس تو رب نواز نے کہا اور ایک میں انتیس۔ ٹھیک اس وقت ایک پیڑ کے پیچھے سے ایک گھمبیر آواز ابھری۔

''نہیں ہم تیس ہیں''۔

رب نواز یہ سن کر چونکے۔ آواز مانوس تھی۔ ان کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ گورنر کی انسپکشن ٹیم کے چیئرمین بریگیڈئر رفیق تھے جو خلاف معمول بریگیڈئر کی وردی میں ملبوس تھے اور ان کا پستول کینوس سے پاؤچ میں جھول رہا تھا۔

''سر، آپ یہاں کہاں''۔

''میرا اپنا کام تو ختم ہو چکا ہے، سوچا کالونی کے دفاع میں تمہاری مدد کروں''۔

''سر، اب آپ ہی ہماری کمان سنبھالیں''۔

''چنانچہ بریگیڈئر نے ایل او بیز کی کمان سنبھالی اور ضروری کاروائی کی''۔

مجھے تم سے یہی امید تھی

مارچ ۱۹۷۱ء میں ای بی آر نے بغاوت کی تھی۔ اس طوفان میں صرف ایک مغربی پاکستانی افسر ۲۱۳۴ میجر (اب لیفٹینینٹ کرنل) محمد افسر زندہ بچ سکے۔ پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ انہوں نے اپنے سی او کرنل زیب کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کرلیا۔ جب قانونی کاروائی ہوئی تو افسر نے وہی کچھ لکھوا دیا جو امر واقعہ تھا لیکن جو قانونی تقاضوں پر پورا نہیں اترتا تھا۔ بعض لوگوں نے کہا۔

''اس طرح بیان نہیں دینا چاہیے تھا۔'' بات اڑتے اڑتے بریگیڈئر رفیق تک پہنچی

''افسر کیا تم نے یہ بیان دیا ہے''۔

''جی ہاں آپ ہی نے تو سکھایا تھا۔ٹروتھ دی ہول ٹروتھ۔جو بات جس طرح ہوئی تھی میں نے لکھوا دی۔ آپ کا شاگرد ہوں۔محض مقدمے کے تقاضے پورے کرنے کے لئے میں غلط بیانی کیسے کرتا''۔

''تم نے اچھا کیا، مجھے تم سے یہی امید تھی''۔

کرنل افسر لکھتے ہیں کہ یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا شانہ بھی تھپتھپایا تھا۔

اسے بریفنگ کی ضرورت نہیں

مجیب کیس میں استغاثہ کے چیف آرگنائزر بریگیڈئر رفیق تھے چونکہ ای بی آر کی بغاوت اور دوسرے عوامل سے میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ) محمد افسر خوب واقف تھے،اس لئے استغاثہ نے افسر کو مقدمے میں ایک گواہ کے طور پر پیش کرنا تھا۔وہ گواہی کے لئے فیصل آباد پہنچ گئے۔گواہی سے ذرا دیر پہلے استغاثہ کے ایک افسر، میجر افسر کے پاس آئے کہ انہیں گواہی کے بارے میں بریف کریں۔ بریگیڈئر رفیق نے دیکھ لیا۔وہ اٹھ کران کے پاس آئے''۔

''اسے بریفنگ کی ضرورت نہیں''۔

تمہاری جان بھی برابر کی قیمتی ہے

۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو سرکٹ ہاؤس فیصل آباد میں جی ایچ کیو سے ایک فوری نوعیت کا سگنل بریگیڈئر رفیق کے نام آیا کہ آپ مقدمہ کے بعد جی ایچ کیو رپورٹ کریں۔انہوں نے یہ سگنل پڑھ کے اپنے جی ون لیفٹیننٹ کرنل عبدالحئ کی طرف بڑھا دیا۔

''سر، مبارک ہو بڑا اچھا ہوا۔ یہ پوسٹنگ بروقت آئی۔شام کو میری سیٹ بک ہے۔میں ڈھاکہ جا کر وہاں سے آپ کا سامان بھجوا دوں گا۔یا جب میری اپنی پوسٹنگ ہوئی تو ساتھ لیتا آؤں گا''۔

(کرنل عبدالحئ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں) یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں یہاں رک جاؤں اور تم چلے جاؤ۔اگر جی ایچ کیو کو میری جان کی اتنی فکر ہے تو تمہاری جان بھی کم قیمتی نہیں۔اس

لئے اگر میں یہاں رک گیا تو تم بھی ڈھاکہ نہیں جاؤ گے۔ ورنہ مقدمے کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد ہم دونوں ساتھ چلیں گے۔ میں ابھی جی ایچ کیو سے سگنل کے ذریعے درخواست کرر ہا ہوں کہ تم بھی اسی حساس کام پر تھے جو میں کرر ہا تھا۔ اس لئے تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے۔ میرے لئے قرین انصاف نہیں کہ تمہیں تو واپس بھیج دوں اور ادھر ہی رہوں۔

''سر، یہ آپ کا کرم ہے۔ وہاں افسروں کی بہت کمی ہے۔ جی ایچ کیو نے ماننا نہیں ہے۔ میری سیٹ آج رات کی بک ہے۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ مجھے چلے جانا چاہیے۔ میرے رکنے کا کوئی جواز نہیں''۔

''جواز کیوں نہیں۔ مقدمہ کی کاروائی ملتوی ہو چکی ہے، ایک جواز تو یہ ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے سگنل دے دیا ہے اس کے جواب کا تمہیں انتظار کرنا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ یہ میرا حکم ہے میں تمہیں روک رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ چلیں گے تو دونوں ساتھ چلیں گے''۔

اس گفتگو کا پس منظر یہ ہے کہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو جب مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع ہوئی تو بغاوت کے الزام میں شیخ مجیب الرحمان اور ڈاکٹر کمال کو دھان منڈی سے گرفتار کر کے مغربی پاکستان بھیج دیا گیا تو لائل پور میں ایک ملٹری کورٹ نے اس مقدمے کی سماعت کرنی تھی۔ بریگیڈئر رفیق کو جو گورنر کی انسپکشن ٹیم کے چیئرمین تھے استغاثہ کے پینل کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ بعد کو کرنل عبدالحئ بھی اس ٹیم میں شامل ہو گئے تھے۔ چونکہ یہ دونوں استغاثے کا کیس تیار کر رہے تھے اس لئے عوامی لیگی اور مکتی باہنی والے انکے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ ڈھاکہ سے ٹیلی فون آپریٹر تک دھمکیاں دیتے کہ اگر یہاں آئے تو ائرپورٹ سے باہر جانا نصیب نہیں ہو گا۔ تم نے ہمارے بنگلہ بندھو کو پکڑ رکھا ہے۔

اس پس منظر میں بریگیڈئر رفیق نے کرنل عبدالحئ کو ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ جانے نہیں دیا۔

صرف محمد رفیق لکھوانا

''رضوان، اب ریٹائر ہو کر مجھے لاہور ہی میں رہنا ہے۔ ایسا کرو کہ تم بازار سے اس تختی پر میرا نام لکھوا

لاؤ''۔

''بہت اچھا''۔

''اور دیکھو صرف محمد رفیق لکھوانا''۔

''بریگیڈئر محمد رفیق نہیں''

''اسکی ضرورت نہیں''

''کیوں۔کیا آپ بریگیڈئر نہیں''۔

''جب میں بریگیڈ کمانڈر کر رہا تھا تو بریگیڈئر تھا۔اب میں اس منصب پر نہیں۔رینک منصبی ذمہ داری کی پہچان کے لئے ہوتا ہے۔اسے شخصیت یا ذات سے کوئی تعلق نہیں۔رینک کمپلیکس دور غلامی کی یادگار ہے۔میرا اصل نام محمد رفیق ہے۔میں چاہتا ہوں کہ میں اپنی ذات اور شخصیت کے حوالے سے پہچانا جاؤں۔اسی اصول کے تحت میں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی میاں، یا چودھری کا لفظ نہیں لکھا۔بیٹے اصل چیز کردار اور کام ہے۔نسل، ذات پات پر فخر کرنا، اس کو اچھالنا، جہالت ہے۔اب ہماری پہچان اسلام اور پاکستان ہے اور یہ کافی ہے''۔

عید پر یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب بریگیڈئر رفیق کے صاحبزادے کیپٹن (اب کرنل) ریاض الحق ۱۹ پنجاب میں ہی کمپنی کمانڈر تھے۔جب عید آئی تو انہوں نے بڑے چاؤ سے چھٹی لی اور بڑی خوشی خوشی گھر آئے۔بریگیڈئر صاحب بھی ریٹائر ہو کر لاہور آئے ہوئے تھے۔چاند رات تھی ہر طرف خوشی کا ہنگامہ برپا تھا۔جوں ہی بریگیڈئر صاحب کی اپنے اکلوتے بیٹے پر نظر پڑی تو کہا:

''ہیلو ریاض تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''کیا کرنے؟ ڈیڈی عید کرنے گھر آیا ہوں۔بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے''۔

کیا تمہاری کمپنی کے سب جوان عید کرنے گھر گئے ہیں''۔

''جی نہیں''۔

''تم پھر کیوں اپنے گھر آئے؟ تمہیں اپنے جوانوں کے ساتھ عید کرنی چاہیے۔ ان کا تم پر حق زیادہ ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسی وقت واپس چلے جاؤ ہم ماں باپ ہیں تمہارے، ہمارے ساتھ عید نہ منانے سے ہماری محبت میں کمی نہیں ہوگی لیکن تمہارے اپنے جوانوں کے ساتھ عید منانے سے ان کی محبت میں اضافہ ہوگا۔ یاد رکھو جو جوان امن کے زمانے میں اپنے کمانڈر کے لئے محبت رکھتے ہیں وہ جنگ کے زمانے میں اس کے لئے جان دے دیتے ہیں''۔

پھر پبلک اسکولوں کو پاکستانیت کا آب ورنگ کون دے گا؟

۱۹۷۲ء کے اواخر میں لارنس کالج کے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین ۱۲ ڈویژن کے جی او سی میجر جنرل (اب لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ) عبدالمجید ملک نے بریگیڈئر محمد رفیق کو کالج کے پرنسپل کی پیش کش کی۔

''کرنل ابرہیم ریٹائر ہو رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اب آپ اس ادارے کی سربراہی قبول کریں''۔

''آپ سے میرے برسوں پرانے مراسم ہیں۔ پیش کش کا شکریہ لیکن میں معذرت چاہوں گا''۔

''آخر کیوں''۔

''تقریباً تیس سال کی ملازمت کے بعد ابھی میں ریٹائر ہوا ہوں، مزید ملازمت کرنے کی ہوس نہیں''۔

''آخر کچھ نہ کچھ تو آپ کو کرنا ہی ہے۔ کار خیر کے طور پر ہی میں سمجھتا ہوں کہ کئی وجوہ سے یہاں کی پرنسپلی کو آپ کی ضرورت ہے''۔

''ملک صاحب۔ لارنس کالج امیر امراء کا کالج ہے، بڑے بڑے لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں، ضبط و نظم کے معاملے میں مجھے رعایت نہیں کرنی، اصولوں پر چلنا ہے اور میرٹ پر داخلہ کرنا ہے۔ اس طرح میرے اور آپ کے لئے مشکلات پیدا ہوں گی اور آپ جانتے ہیں میرا مزاج کیسا ہے۔ میں اصولوں پر

مفاہمت کا قائل نہیں''۔

''رفیق اگر ٹھیٹھ پاکستانی ذہن کے لوگ نہیں آئیں گے تو ان برٹش زدہ پبلک اسکولوں کو پاکستانی کون بنائے گا''۔

''اچھا ٹھیک ہے لیکن ایک شرط ہے''۔

''وہ کیا؟''

''یہی کہ پرنسپلی کے کام میں دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔ خصوصاً ضبط و نظم اور داخلے کے معاملہ میں''۔

''بابا ہر شرط منظور ہے تم پتوار تو سنبھالو''۔

جنرل ملک اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ پتوار تو انہوں نے سنبھال لئے لیکن ان کی اصول پرستی مجھے بھی مہنگی پڑی۔ ان کے پرنسپلی کا عہدہ سنبھالنے کے کچھ دنوں بعد ہی میرے ایک سینئر افسر نے ایک لڑکے کے داخلے کے بارے میں کہا۔ میں نے رفیق کو فون کیا۔ رفیق کا ٹکا سا جواب تھا۔ ''لڑکا دوسرے امیدواروں کے ساتھ امتحان میں بیٹھے، اگر پاس ہو گیا اور میرٹ پر آ گیا تو داخل ہو جائے گا''۔

وہ نیچے وادی میں کیا ہے؟

ملنا جلنا انسانی فطرت ہے۔ اکیلے رہنا خواہ کتنی ہی آسائش میسر ہو مشکل ہوتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے لارنس کالج کے نئے پرنسپل کی بیٹی نے جو انکے ساتھ ہی فروکش تھیں ایک روز اپنے والد کو گھیرا''۔

''ابا جی۔ اکیلے رہتے رہتے دل گھبرا گیا ہے''۔

''تو پھر؟''

''اگر آپ اجازت دیں تو آس پاس کے اسٹاف کے یہاں آنا جانا شروع کروں؟ کچھ دل بہلے گا''۔

''رضیہ بیٹی۔ دل بہلانے کیلیئے تمہارے گھر میں کام کم ہے، بچے ہیں، امی ہیں، ماں جی ہیں۔ تمہارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ کہیں آؤ جاؤ''۔

’’شاید کبھی تھوڑا سا وقت مل ہی جائے‘‘۔

’’میں تو ٹال رہا تھا۔لیکن تمہیں اصرار ہے تو اصل بات بتا تا ہوں ۔ادھر آؤ۔ دیکھو وہ نیچے وادی میں کیا ہے‘‘۔

’’کیا ہے کچھ بھی نہیں۔سویپرز وغیرہ کے سرونٹ کوارٹرز ہیں‘‘۔

’’بیٹی میرے حساب سے یہ بھی کالج کے کارکن ہیں۔اگر تم اونچے درجے کے اسٹاف کے ہاں جاؤ گی تو پھر ان کلاس فوروں کے ہاں بھی جانا پڑے گا‘‘

یہ واقعہ ۱۹۷۳ء کا ہے۔جب بریگیڈئر رفیق نئے نئے گھوڑا گلی کے پرنسپل ہو کر گئے تھے۔

کلاس فور ہو کہ ون،سب سرکاری ملازم ہوتے ہیں

ملٹری کالج کا ایک چپڑاسی بریگیڈئر رفیق سے ملنے لارنس کالج گیا۔اس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔دیر تک کالج کی باتیں کرتے رہے۔کون ہے،کون گیا وغیرہ۔پھر اسکے بچوں کے بارے میں پوچھتے رہے

’’کیسے آنا ہوا؟‘‘

’’جناب صرف سلام کرنے آیا تھا‘‘۔

’’بڑی مہربانی ہے،بڑی مہربانی ہے‘‘۔

’’مہربانی تو جناب آپ کی ہے،آپ ایک کلاس فور سے اس طرح مل رہے ہیں‘‘۔

’’کلاس فور ہو کہ ون سب سرکاری ملازم ہوتے ہیں اور اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔آؤ کھانا کھاتے ہیں‘‘۔

’’جناب میں تو میز کرسی پر کھانا کھانے کا عادی نہیں‘‘۔

’’تو آج سہی۔ چک میں میں بھی تمہاری طرح ہی کھاتا پیتا تھا‘‘۔اس واقعہ کے راوی پروفیسر رشید لکھتے ہیں کہ اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے بعد وہ چپڑاسی مہمان کو ایک وی آئی پی کی طرح گیٹ تک چھوڑنے آئے‘‘۔

اب تم میرے ساتھ کھانا کھانا

یہ نومبر ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے۔ لارنس کالج میں سر شام ہاؤس ماسٹرز کانفرنس شروع ہوئی۔ تو کچھ زیادہ ہی دیر میں ختم ہوئی اور نو بج گئے۔ اس دن موسم معمول سے زیادہ سرد تھا۔ پرنسپل دوسرے ہاؤس ماسٹرز کے ساتھ باہر نکلے تو بشیر چپڑاسی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

''بشیر بہت دیر ہوگئی ہے میرے ساتھ گھر چلو، میرے ساتھ کھانا کھانا''۔

''شکریہ سر، سر کوئی بات نہیں میری روٹی تیار ہے''۔

''تیار کیسے ہے۔ چار بجے سے تو تم یہاں بیٹھے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ ان دنوں کوارٹر میں تم اکیلے رہتے ہو اور اپنی روٹی خود پکاتے ہو''۔

''سر، میں کچھ انتظام کر لوں گا''۔

''نہیں۔ اب یہ میرا فرض بنتا ہے۔ میں نے تمہیں اتنی دیر بٹھائے رکھا ہے، چلو کھانا کھاتے ہیں''۔ بشیر نے بہت پہلو بچانا چاہا لیکن وہ اسے اصرار کر کے اپنے بنگلے لے گئے اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور گھر میں جو کچھ تھا وہ بے تکلفی سے سامنے رکھ دیا۔

کالج تو یہ بل ادا نہیں کر سکتا لیکن ....

لارنس کالج کا ایک مالی تھا۔ اس کی بیوی کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کے علاج کے بل میں ایک ٹانک بھی شامل تھا جو از روئے ضابطہ کالج کے فنڈ سے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چیف اکاؤنٹنٹ رشید صاحب نے جب بل ان کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا تو انہوں نے ٹانک کی رقم پر سرخ لکیر کھینچ دی۔

''سر، یہ بڑا غریب آدمی ہے۔ کثیر الاولاد ہے۔ پانچ چھ بیٹیاں ہیں''۔

''مجھے معلوم ہے اس کا نام مظفر ہے نا؟''

''جی وہی''۔

''ٹانک کی رقم تو منظور نہیں کی جاسکتی یہ ضابطہ کی بات ہے۔(پرس نکال کر) آپ یہ پچاس روپے بل کی رقم کے ساتھ ملا کر اسے دید یجئے گا۔ مجھے اپنے پیسے پر اختیار ہے، سرکاری پیسے پرنہیں اور ہاں آپ مظفر سے یا اور کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیجئے گا''۔

خدمت اپنی جگہ، غریبی اپنی جگہ لیکن اس نے جھوٹ کیوں بولا

لارنس کالج کے پرنسپل کے بنگلہ کا مالی ایک روز لکڑی کا ایک تختہ اٹھائے اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ اتفاق سے پرنسپل صاحب کی نظر پڑ گئی۔

''یہ تختہ کہاں لے جا رہے ہو؟''

''گھر، جناب''

''سٹیٹ مینیجر سے پوچھ لیا ہے''۔

''جی ہاں پوچھ لیا ہے''۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے اجازت نہیں لی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اتفاق سے مینجر بھی ان سے کوئی بات کرنے آگئے۔ انہوں نے یوں ہی پوچھ لیا۔''وہ تختہ کافی بڑا تھا آپ نے کچھ سوچ کر اجازت دی ہوگی''۔اسٹیٹ مینجر نے جواب دیا۔''کون سا تختہ؟'' پرنسپل صاحب نے مالی سے اپنی گفتگو دہرائی تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہا میں نے اسے کوئی تختہ لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ یہ سن کر انہوں نے کھڑے کھڑے ڈسچارج کر دیا۔ وہ روتا دھوتا اکاؤنٹنٹ رشید کے پاس گیا۔ انہوں نے رفیق صاحب سے بات کی۔

''پرانا خدمت گار ہے۔غریب آدمی ہے اسے اپنے کوارٹر کی چھت پر وہ تختہ ڈالنا تھا۔

''خدمت گاری، غربت اور ضرورت ایک طرف لیکن اس نے جھوٹ کیوں بولا؟ اور پھر ایک شریف آدمی کو بھی ملوث کیا۔ اگر وہ سیدھے طریقے سے مانگتا تو میں خود اسٹیٹ مینجر سے اس کی سفارش کرتا۔لیکن یہ

نہیں ، ہر گز نہیں ۔اس واقعہ کے راوی مسٹر رشید اکاؤنٹنٹ لکھتے ہیں کہ میری منت سماجت کے باوجود انہوں نے اسے نہیں رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ دنوں کے بعد خاندان کی کفالت کے خیال سے انہوں نے اس مالی کے لڑکے کو نوکر رکھ لیا۔

تم ادارے پر رحم کیوں نہیں کھاتے؟

پرنسپل نے سب پر واضح کر دیا تھا کہ امتحان میں نقل کا سلسلہ بند ہونا چاہیے، ورنہ اس کی سزا اخراج سے کم نہیں ہوگی۔ پرنسپل نے جو کچھ کہا پھر سختی سے اس کی تعمیل بھی کی۔ایک دن چند لڑکے پرنسپل کے آفس کے برآمدہ میں بیٹھے تھے۔کالج کے ایک پرانے استاد ادھر سے گزرے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ نقل کا چکر ہے۔ انہیں ان پر رحم آیا انکی سفارش کرنے پرنسپل صاحب کے کمرے میں گئے۔

''سر، میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ یہ جو بچے باہر بیٹھے ہیں ان کے بارے۔۔۔۔

''میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔آپ کو ان لڑکوں پر تو رحم آتا ہے لیکن اس ادارے پر رحم نہیں آتا''۔

پھر میں پرائم منسٹر سے بات کروں

۱۹۷۵ء کا قصہ ہے، لارنس کالج میں داخلے مکمل ہو چکے تھے کہ مرکزی حکومت کے ایک وزیر باتدبیر کا فون آیا۔

''میں پرنسپل سے بات کرنا چاہتا ہوں''۔

''میں پرنسپل بول رہا ہوں۔فرمائیے''۔

''ایک لڑکے کو داخل کرنا ہے میں اسے چٹ دے کر بھیج رہا ہوں''۔

آپ چٹ دینے کی زحمت نہ کیجئے۔داخلہ بند ہو چکا ہے اب مجھے کسی کو داخل نہیں کرنا''۔

''داخل نہیں کرنا کیا مطلب''۔

''وہی جو الفاظ سے واضح ہے''۔

''آپ کو علم ہے کہ میں کون بول رہا ہوں''۔

''جی خوب معلوم ہے''۔

''پھر میں پرائم منسٹر سے بات کروں''۔

''ضرور کیجئے۔ساتھ ہی یہ بھی بتا دیجئے گا کہ پرنسپل رفیق ہے''۔

''کون رفیق''۔

''بس اتنا کافی ہے وہ مجھے مجیب الرحمان کیس کے وقت سے خوب جانتے ہیں''۔

مجھے پرنسپل سے بات کرنا ہے۔

جنوری ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے کہ پرنسپل کے آفس کے فون کی گھنٹی بجی۔ چیف اکاؤنٹنٹ مسٹر رشید نے ریسیور اٹھایا۔

رشید اکاؤنٹنٹ ''جی فرمایئے''۔

''میں ایجوکیشن سیکرٹری بول رہا ہوں۔آپ کے پرنسپل صاحب سے بات کرنا ہے''۔

''جی کیجئے''۔

(انہوں نے ریسیور پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا۔) ''ایجوکیشن سیکرٹری بات کرنا چاہتے ہیں''۔

''رفیق، فرمایئے''۔

''ایک بچے کا داخلہ کرانا ہے اس کو میں بھیج ....

'' آپ زحمت نہ کیجئے۔ اس سال کے داخلے بند ہو چکے ہیں۔ اب اگلے داخلے پر امیدوار کو ضروری مرحلوں سے گزرنا ہوگا''۔

ساری، ان سے تو میں بھی کچھ نہیں سکتا

یہ واقعہ ۱۹۷۶ء کا ہے۔ساہیوال کے ایک بہت بڑے زمیندار اور سر برآوردہ سیاسی کارکن رائے مسعود صاحب تھے۔ وہ خان قیوم کی مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔خان قیوم ان دنوں پی پی کی گورنمنٹ میں وزیر داخلہ تھے۔ وہ رائے صاحب کے ہاں آ کر ٹھہرے تو انہوں نے ان سے کہا خان صاحب بچے کو گھوڑا گلی میں داخل کروانا ہے۔انہوں نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے، میں وزیر تعلیم کے نام رقعہ لکھے دیتا ہوں۔رائے صاحب وہ رقعہ لیکر وزیر موصوف کے پاس گئے۔انہوں نے ایک ڈی او پرنسپل کے نام لکھ دیا۔رائے صاحب کو ڈی او حاصل کر کے بچے کے داخلے کا اس حد تک یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے داخلے کی ضروری تیاری شروع کر دی اور پھر جب سارا سامان تیار ہو گیا تو وہ خط لے کر گھوڑا گلی پہنچے اور بڑی بے نیازی سے بریگیڈئر صاحب کے سامنے ڈی او کر دیا۔انہوں نے اسے پڑھا تو پہلے تو ان کا رنگ کچھ متغیر ہوا۔پھر اپنا قلم اٹھایا اور اپنی مخصوص سبز کا ہی روشنائی سے صرف اتنا لکھا۔

''معذرت بے ضابطہ ہے''۔

اور خط ان کے ہاتھ میں دے دیا۔رائے صاحب کو جو مایوسی ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے انہوں نے خان قیوم صاحب سے فون پر بات کی۔انہوں نے کہا وہ ڈی او مجھے بھیج دو۔انہوں نے بھیج دیا۔ریمارک دیکھ کر وہ بہت برہم ہوئے۔پھر وہ ڈی او اپنی چٹ کے ساتھ وزیر تعلیم کو بھجوا دیا۔وزیر تعلیم کا چراغ پا ہو نا فطری تھا۔انہوں نے چیف آف آرمی سٹاف سے بات کی کہ آپ نے گھوڑا گلی میں کس کریک پاٹ کو بٹھا رکھا ہے۔انہوں نے کہا۔اچھا میں دیکھتا ہوں یہ تفتیش کرنے کے بعد کہ پرنسپل کون ہے ان کو پھر رنگ کیا۔ساری رفیق سے تو میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔اس واقعہ کی تمام تفصیلات خود رائے صاحب نے سلیم اختر کیانی سے بیان کیں۔

اور یہ چٹ انہیں کبھی نہیں ملے گی

۱۹۷۵ء میں ۲۳۱۹ سلیم اختر کیانی ساہیوال میں مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے۔جب رفیق صاحب کو اس

امر کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے سلیم اختر کو خط لکھا۔ ''نیا منصب مبارک ہو۔ ساہیوال میں میرے بہت سے عزیز رشتے دار رہتے ہیں۔ کاشتکاروں کے کام کچہری سے پڑتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میرے نام کے حوالے سے میرا کوئی عزیز رشتے دار تمہارے پاس آئے تو اس سے کہنا کہ میری چٹ لادے جو میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ چٹ انہیں کبھی نہیں ملے گی''۔

پیالی میں چائے پیو گے یا پیالہ میں

یہ واقعہ ۱۹۷۶ء کا ہے۔ لارنس کالج کے ایک استاد مسٹر مغیث اپنے پرنسپل کے بنگلے پر کسی کام سے گئے۔ ''سر، معذرت کرتا ہوں کہ ناوقت آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ لیکن مسئلہ ہی کچھ تھا کہ آپ سے فوری مشورہ ضروری سمجھا''۔

''مغیث، تکلیف نہ کریں۔ معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب کام ہو تو وقت کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ اچھا چائے پہلے پیجیے اور یہ بتائیے کہ چائے پیالی میں پئیں گے یا پیالہ میں''۔ مسٹر مغیث لکھتے ہیں

''پرنسپل بریگیڈئر رفیق کے ہاں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ رفیق صاحب جو بے تحاشا انگریزی بولتے تھے اور جن کے طرز زندگی پر بظاہر انگریزی چھاپ تھی، اندر سے ٹھیٹھ مشرقی تھے۔ ان کے بنگلے میں جو انگریزوں کے زمانے کا ایک شاندار مکان ہے آرائش یا تکلف کا کوئی خاص سامان مجھے نظر نہیں آیا، بلکہ بنگلے پر رنگ وروغن بھی کیا ہوا نہیں تھا۔ ان کا رہن سہن بہت ہی سادہ تھا۔ ان کے کپڑے البتہ بے داغ تھے۔ ہاں بالآخر چائے ہم نے خالص مشرقی انداز میں پیالوں میں پی''۔

ایک طرف کالج ہے دوسری طرف شادی میں شرکت

یہ واقعہ بریگیڈئر رفیق کی لارنس کالج کیا پرنسپلی کے دور کا ہے۔ ایک روز ایک لیفٹیننٹ جنرل جو کشمیر کی لڑائی میں ان کے فیلڈ آرٹلری کمانڈر رہ چکے تھے، ان سے ملنے آئے۔ رفیق صاحب نے فیلڈ کے رشتے

سے ان کی بہت خاطر تواضع کی۔ آخر میں وہ حرف مدعا زبان پر لائے۔

''قریبی رشتے داروں میں شادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے کو آپ دو دن کی چھٹی دے دیں، ساتھ جمعہ ملا لے گا''۔

''مجھے افسوس ہے کہ یہ ممکن نہیں''۔

''کیوں صرف دو دن کی بات ہے۔ کوئی امتحان بھی قریب نہیں۔ اس شادی میں اس کی شرکت بہت ضروری ہے''۔

''میں کالج کو کچھ اصولوں کے تحت چلا رہا ہوں۔ میں ان میں استثنیٰ نہیں کیا کرتا۔ میں طلبہ کے والدین اور اپنے احباب سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس قومی کام میں مجھ سے تعاون کریں گے''۔

''آپ پھر غور کر لیجیے۔ شادی میں بچے کی شرکت بہت ضروری ہے''۔

''آپ بچے کے لئے کالج اور شادی میں شرکت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کر لیجئے''۔

''میں شادی میں شرکت کو منتخب کرتا ہوں''۔

بریگیڈئر مناظر حسین جو جنرل کے ساتھ گئے تھے بیان کرتے ہیں کہ بریگیڈئر رفیق نے بڑی خوش دلی سے فوراً جنرل صاحب کے بیٹے کو کالج سے فارغ کر دیا۔

لیکن سر یہ ضابطے کے خلاف ہے

گھوڑا گلی کالج کے ایک ہاؤس ماسٹر اقبال کو اپریل ۱۹۷۶ء میں اپنی والدہ کے علاج معالجہ کے سلسلے میں کئی ماہ پنڈی میں رہنا پڑا۔ ایک مسئلہ ان کی چھٹی کا تھا۔

''سر، میری چھٹی بہت لمبی ہو گئی ہے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ چھٹی کی فکر نہ کروں''۔

ہاں۔ میں نے بار بار کہا ہے۔ چھٹی کی فکر ہرگز نہ کریں۔ والدہ کے علاج کی فکر کریں۔

''سر، ضابطے کے مطابق اب مجھے مزید ایک دن کی چھٹی نہیں مل سکتی۔ اکاونٹنٹ کا بھی یہی خیال ہے''۔

آپ ضابطے کی فکر نہ کریں۔ ہر ضابطے کی ایک اسپرٹ ہوتی ہے۔اس کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔دوسرے یہ کہ ضابطے کا اطلاق کرنا نہ کرنا میری ذمہ داری ہے۔آپ نے بغیر چھٹی لئے برسوں اس ادارے کی خدمت کی ہے۔اب حسب ضرورت آپ کا حق بنتا ہے۔

وہ تمہارا کام یہ میرا کام ہے۔

یہ واقعہ اواخر ۱۹۷۶ء کا ہے۔رات کا وقت، اچھی خاصی سردی تھی۔سرشام ہی سے برفباری شروع ہو چکی تھی۔ہوا میں تیر کی سی تیزی تھی۔گھوڑا گلی کالج کے ایک استاد ہاؤس ماسٹر مسٹر محمد مغیث ''ایم او ڈی'' (ماسٹر آن ڈیوٹی) تھے۔وہ رات گئے ٹارچ لے کر اور اپنے آپ کو گرم کپڑوں میں لپیٹ کر گھر سے نکلے کہ رات کی چیکنگ پوری کریں۔ایک چڑھائی چڑھتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی آہستہ آہستہ ان سے آگے جا رہا ہے۔اتنے رات گئے اتنی سردی میں کون ہو سکتا ہے۔ذرا تیزی سے آگے بڑھ کر دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ڈفل کوٹ میں ملبوس چھڑی ہاتھ میں لئے کوئی اور نہیں خود پرنسپل صاحب تھے۔انہیں مزید حیرت اس لئے بھی ہوئی کہ انہیں معلوم تھا کہ وہ ابھی حال ہی میں دمہ کے ایک شدید حملے سے اٹھے ہیں۔

''سر، آپ اس وقت یہاں کہاں، آپ کی صحت اس طرح اپنے آپ کو ''ایکسپوز'' کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔آپ کے ایم او ڈی آپ کو مایوس نہیں کریں گے''۔

(ذرا سانس سنبھلنے کے بعد) ''مغیث، میں تمہیں یا کسی اور ایم او ڈی کو چیک کرنے نہیں نکلا کرتا۔مجھے معلوم ہے کہ میری پوری ٹیم انتہا درجے کی فرض شناس ہے۔لیکن وہ تمہارا کام ہے یہ میرا کام ہے''۔

''سر''

''رہی بات تکلیف کی تو بیماری کوئی عذر نہیں، ہر منصب کے کچھ بنیادی تقاضے ہوتے ہیں۔جو اہل کار ان تقاضوں کو کسی وجہ سے پورا نہ کر سکتا ہو وہ یا تو جگہ چھوڑ دے یا پھر منصبی تقاضے پورے کرے، بیچ کی راہ کوئی

نہیں''۔

طلبا اور اسٹاف کا حق فائق ہے

نومبر ۱۹۷۶ء میں لیفٹیننٹ کرنل حق نواز نے گھوڑا گلی کالج کے برسر کے منصب کا چارج لیا تو کچھ عرصے کے بعد نوٹ کیا کہ باقی کالج تو ٹھیک ٹھاک ہے لیکن پرنسپل کے بنگلے کی حالت ٹھیک نہیں۔

''سر، آپ کو پرنسپل ہوئے چار برس ہونے کو آئے لیکن آپ کے بنگلے کو رنگ وروغن نہیں ہوا۔ اگر اجازت ہو تو''۔

''حق نواز، چھوڑو، یہ کوئی مسئلہ نہیں''۔

''سر، مسئلہ تو ہے''۔

''دیکھو، طلبا اور اسٹاف کا حق فائق ہے۔ اگر طلباء کے ہاوسز اور اسٹاف کے گھروں کی مرمت کے بعد پیسہ بچا تو اپنا بنگلہ بھی ٹھیک کروالوں گا''۔

کرنل حق نواز لکھتے ہیں۔

''لیکن کالج چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اپنے بنگلے کی ضروری مرمت اور رنگ وروغن کا آرڈر دیا تو مجھ سے نہ رہا گیا''۔

''سر اب بنگلے پر اتنا روپیہ صرف کرنے میں کیا مصلحت ہے''۔

''تاکہ آنے والے پرنسپل کو نہ تکلیف ہو نہ گلہ ہو''۔

ماں جی میں اچھا ہوں

نومبر ۱۹۷۷ء کا واقعہ ہے۔ رفیق صاحب پر دمہ کا شدید دورہ پڑا۔ اتنا کہ انہیں سی ایم ایچ پنڈی داخل ہونا پڑا۔ دوسرے دن یکا یک ان کی والدہ ان کو دیکھنے ہسپتال آ پہنچیں۔ انہیں اطلاع ہوئی تو آکسیجن کی نلکی ناک سے نکال کر سنبھل کے بیٹھ گئے۔

’’ماں جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔آپ نے کیوں تکلیف کی‘‘۔

مسٹر رشید جو اس وقت موجود تھے۔ لکھتے ہیں کہ وہ ٹھیک بالکل نہیں تھے۔ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی انہوں نے مجھ سے اشارے سے کہا تھا کہ انہیں باہر لے جائیں۔اس بیماری سے سنبھلتے ہی وہ اپنے دوست کرنل نذیر کے ہاں ویسٹ ریج میں کچھ دن رہے۔یہیں سے انہوں نے کالج کے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین کو فون کیا تھا کہ اب میں اس منصب کی ذمہ داری نبھا نہیں سکتا۔ مجھے اس خدمت سے سبکدوش کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ میں راز داری کا حلف اٹھا چکا ہوں

لاہور کے صحافی محمد اعظم کے بریگیڈئر رفیق سے گھریلو تعلقات تھے۔صحافیوں کو واقعات کی ٹوہ لگانے کی عادت ہوتی ہے اور اگر کوئی واقعہ تاریخی راز کی حیثیت رکھتا ہو تو پھر ان کا تجسّس اور بڑھ جاتا ہے۔اعظم صاحب کو یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ انہوں نے مجیب کیس میں استغاثہ کا دعویٰ تیار کیا تھا۔ جب تعلقات بڑھے تو انہوں نے اس راز کو کریدا۔

’’آپ تو پراسیکیوشن کے چیف تھے۔آپ کو تو سب کچھ معلوم ہوگا۔اب یہ باتیں تاریخ کی حیثیت رکھتی ہیں‘‘۔

’’اعظم میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں لیکن میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ان باتوں سے پردہ اٹھاؤں۔یوں بھی اس کیس کے اہم کردار اب دنیا میں نہیں۔ یحیٰی جس نے مجیب کی گرفتاری اور بھٹو جس نے رہائی کا حکم دیا تھا، دونوں اب دنیا میں موجود نہیں۔خود مجیب کا المناک انجام تمہیں معلوم ہے۔اب کیا فائدہ گڑے مردے اکھاڑنے سے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں نے راز داری کا حلف اٹھایا ہوا ہے‘‘۔

اعظم جو ہے کافی ہے

جن دنوں لاہور کینٹ کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے پلاٹوں کی الاٹمنٹ ہو رہی تھی، اعظم صاحب نے

بریگیڈئر رفیق سے کہا کہ وہ بھی درخواست دیں۔ ''سر، میں سویلین ہوکر ممبر ہو چکا ہوں، آپ کا تو براہ راست حق بنتا ہے۔ آپ کو ہزار گز کا پلاٹ با آسانی مل جائے گا۔ چند سالوں کے بعد لاکھوں کی چیز ہوگی''۔

''اعظم یہ کوٹھی جو میں نے ان بچوں کے لئے خرید لی ہے، ان کی ضرورت کے لئے کافی ہے۔ اسی کو بنا کے رکھیں تو بہت ہے۔ انسانی خواہشات کی تو کوئی حد نہیں ہے۔ ان بکھیڑوں میں پڑنے سے حاصل''۔

حکیم صاحب کا کیا ہے

بریگیڈئر رفیق کی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے ۱۲؍۲۴ اصغر علی خان اُن سے ملنے لاہور گئے۔

''سر اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔ آئندہ کا کیا پروگرام ہے''۔

''ہاں یہ تو ہے۔ میں بھی افاقہ محسوس کر رہا ہوں۔ یہاں چھاؤنی میں ایک پرانے حکیم صاحب ہیں ان کے علاج سے کافی فرق پڑا ہے بلکہ پڑا تھا''۔

''پڑا تھا کیا معنی''۔

''پڑا تھا میں نے اس لئے کہا کہ چند روز ہوئے میں نے ان کی دوا چھوڑ دی''۔

''چھوڑ دی''۔

''جب افاقہ ہو رہا تھا۔ تو دوا چھوڑ دی آخر کیوں؟''

''بات ہی کچھ ایسی پڑی تھی''۔

''وہ کیا؟''

''اب تمہیں پوری بات بتانی پڑے گی۔ پہلی بار مشورہ کرنے تو میں خود گیا تھا۔ اس کے بعد کبھی ریاض دوا لے آتا تھا اور کبھی رضوان۔ جب افاقہ ہوا بلکہ کافی افاقہ ہوا تو میں نے سوچا اب ایک بار خود بھی ہو آؤں تو بہتر ہے۔ حال بھی کہہ دوں گا اور دوا بھی لے آؤں گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا شکریہ ادا

کرتا آؤں گا کہ بڑی توجہ سے علاج کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں گیا اور شکریئے سے بات شروع کی۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی بات کرتے رہے، پھر بولے بریگیڈئر صاحب شکریئے کی ضرورت نہیں آپ میرا ایک کام کروا دیجئے۔ مجھے سو بوری سیمنٹ کی ضرورت ہے۔ آپ کا بندہ مارشل لاء میں ہے اسے کہہ کر سیمنٹ دلوا دیجئے۔ میں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں یہ سفارش نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر بغیر دوا لئے میں واپس آ گیا''۔

''چونکہ کالج کے رشتے سے متعلقہ افسر سے میری بھی کچھ یاد اللہ ہے۔ سر اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے کہوں۔ آپ کی صحت کا معاملہ ہے''۔

''اصغر کہہ تو میں بھی سکتا ہوں۔ اگر میں اشارہ بھی کر دوں تو وہ حکیم صاحب کا کام کروا دے گا۔ لیکن میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ پھر حکیم صاحب کا کیا ہے۔ آج یہ ہے تو کل اور فرمائش ہوگی۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے یہ انکار کرنا پڑے گا اور دوا بند کرنا پڑے گی۔ کیوں نہ وہ ناخوشگوار انکار آج ہی کر دیا جائے''۔

کسی کو یہ نہ بتانا کہ ....

''نانا جان میں آئی ایس ایس بی کے لئے جا رہا ہوں''۔

''عرفان بیٹے، تو خدا حافظ۔ لیکن دیکھو آئی ایس بی سے پہلے نہ کسی اولڈ بوائے سے ملنا اور نہ کسی کو یہ بتانا کہ تم میرے نواسے ہو۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھو''۔

یہ گفتگو ان کے انتقال سے چند روز پہلے کی ہے۔

ابھی نہیں کچھ دیر کے بعد

وہ جو کبھی کارزار زندگی میں شیر ببر تھا، دمہ کی بیماری کے ہاتھوں خاک ہو چکا تھا۔ زندگی کی شام ہو رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کا منظر تھا۔ لیکن اس مرد میدان نے حوصلہ اب بھی نہیں ہارا تھا۔ چائے کا وقت ہوا تو آفیسرز وارڈ سی ایم ایچ لاہور کا وارڈ بوائے چائے کی ٹرے لئے آیا۔ ''سر چائے لیجئے''۔

(گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) ’’ابھی نہیں کچھ دیر کے بعد میری والدہ آ رہی ہیں ۔ جب وہ آ جائیں تو لانا‘‘ ۔

اس واقعہ کے راوی لیفٹیننٹ کرنل توقیر حسین لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۹ نومبر ۸۱ء کی شام کا ہے۔آکسیجن لگی ہوئی تھی یعنی صاف ظاہر تھا کہ دم واپسیں ہے ۔ کچھ دیر پہلے ان کے معالج کرنل ارشد نے مجھے بتایا تھا کہ بریگیڈئر صاحب محض اپنی قوت ارادی سے جی رہے ہیں ۔ اس لئے میں برسوں کے ساتھی اور محسن کو حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ دیکھو پھر دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اپنی ماں کے آنے پر خود بٹن دبا کر وارڈ بوائے کو بلایا اور چائے لانے کو کہا۔ چائے کی ٹرے آنے پر نہ صرف انہوں نے آہستہ آہستہ دو ایک گھونٹ لئے بلکہ بسکٹ کا ایک ٹکڑا بھی منہ میں رکھا۔حقیت یہ ہے کہ ان کی حالت چائے پینے کی نہیں تھی ۔ یہ ڈرامہ اپنی والدہ کو یہ جتانے کے لئے کر رہے تھے کہ آپ گھبر ائیں نہیں، میں ٹھیک ہوں ۔لیکن ماں کی نظر ممتا کی نظر ہوتی ہے ۔ وہ کب دھوکہ کھاتی ہے ۔ میں ماں جی کو ان کے پاس چھوڑ کر باہر نکل آیا کہ شاید ماں بیٹے کو کچھ کہنا سننا ہو۔ جب کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلیں تو اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ بولیں۔ ’’ بیٹے دعا کرو ان کی آنکھوں کی نمی سے میں سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ سمجھ چکی ہیں لیکن خاموش تھیں ۔اللہ اکبر......... جیسی ماں ویسا بیٹا‘‘ ۔

اب کھیل ختم ہو چکا ہے

بریگیڈئر رفیق کے انتقال سے چند دن پہلے ۱۵۲۰ء محمد اعظم اور ۱۸۲۱ شوکت جنجوعہ ان سے ملنے سی ایم ایچ لاہور گئے ۔آکسیجن لگی ہوئی تھی ۔

’’سر کیا حال ہے‘‘ ۔

’’کرنل ارشد بہت کوشش کر رہے ، ہیں میں بھی ان سے تعاون کر رہا ہوں ۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے ۔ میں اپنی اننگز کھیل چکا ہوں ۔ آخری سیٹی کا انتظار ہے ۔ میں تیار ہوں تم لوگوں سے مجھے

یہ کہنا ہے کہ جرات سے، محنت سے، دیانت سے کام کرتے رہو، ملک کے مفاد کو سامنے رکھنا، کوئی ظلم، بد دیانتی نہ کرنا۔ یہ چیز آخر خود اپنی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ کسی کو تکلیف دینا اصل میں اپنے آپ کو تکلیف دینا ہے۔ گاڈ بلیس یو خدا حافظ‘‘۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

باب دوم

شخصیت و کردار منزل بہ منزل

(احباب و رفقاء کار کی نظر میں)

ایک گوہر شب چراغ تھا نہ رہا

کلاس فیلو............ مسٹر ابوالنصر کی یادیں

راشد: ابوالنصر صاحب۔ آپ کو یہ متیاز حاصل ہے کہ آپ بریگیڈئر رفیق کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ اس حوالے سے آپ سے گفتگو کرنا ہے۔

ابوالنصر: جی ہاں مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں رندھیر ہائی اسکول کپورتھلہ میں ان کا کلاس فیلو تھا۔ یہ چالیس پینتالیس سال ادھر کی بات ہے۔ ۱۹۳۵ء چھتیس کی۔ ۱۹۳۷ء میں ہم دونوں نے وہاں سے میٹرک کیا تھا اور پھر رندھیر انٹر کالج میں داخلہ لیا تھا۔

راشد: اس زمانے کی کوئی خاص یاد؟

ابوالنصر: رفیق کپورتھلے شہر میں نہیں رہتے تھے۔ وہ شہر سے چھ سات میل دور ایک قصبے بادشاہ پور سے رندھیر سکول پڑھنے آتے تھے سائیکل پر۔ ابھی آپ نے پوچھا کہ اس زمانے کی کوئی خاص یاد تو فوراً ایک بہت ہی اسمارٹ نوجوان کی تصویر میری آنکھوں میں پھر گئی جس کا ایک ہاتھ سبز رنگ کی ریلے سائیکل کی ہینڈل پر اور ایک پاؤں اس کے پیڈل پر ہے، سفید قمیض کے کلف لگے کالر کے پیچھے ایک رومال تہہ کیا

ہوا رکھا ہے اور سانولے چہرے پر بڑی بڑی ابھری ہوئی عقابی آنکھیں نمایاں ہیں اور فر فر انگریزی بول رہا ہے۔ رفیق کی امیج مجھے آج بھی ہانٹ کرتی ہے۔ رفیق کو دیکھ کر پہلی نظر میں جو چیز مرعوب کرتی تھی وہ یہی ان کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی دمک اور بے داغ لباس کی نفاست تھی۔ ان کی چلت پھرت ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے اندر کچھ جان ہے، کچھ آن ہے۔

راشد: یہ تو ظاہر پہلو ہوا۔ شخصیت کا تاثر کیا تھا۔

ابوالنصر: بے حد پر اعتماد، لیکن وقار کے ساتھ، صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نیوی بلیو پینٹ اور سفید قمیض میں ملبوس یہ لڑکا اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایک طرح کی superiority کی air تھی ان میں، جس سے سچ پوچھیے میں خود چڑ جاتا تھا کہ رفیق اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دوستوں میں بھی لاشعوری طور پر تھوڑی بہت رقابت تو چلتی ہی ہے۔

راشد: اس زمانے میں ان کی کوئی شرارت، کوئی ہنگامہ وغیرہ۔

ابوالنصر: نہیں۔ رفیق اس زمانے میں بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ایک سکھ لڑکے نے جو BULLYING کرتا رہتا تھا ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو انھوں نے اسے بری طرح باکس کیا تھا۔ غریب دیر تک زمین پر اوندھا پڑا رہا تھا۔ لیکن یہ ONCE IN A BLUE MOON کی بات تھی۔ ویسے رفیق اپنے رویے اور وقار کے اعتبار سے ایسے تھے کہ اسکول کے لڑکے تو لڑکے ٹیچرز بھی ان کا لحاظ کرتے تھے۔

راشد: ابوالنصر صاحب۔ رفیق صاحب کی تعلیمی کارکردگی کیسی تھی؟

ابوالنصر: انگریزی تو ان کی ہم سب سے اچھی تھی، بہت تیز بولتے تھے اور لب ولہجہ بھی خالص انگریزیانہ تھا۔ ان کی انگریزی کا ساری کلاس پر رعب تھا۔ چونکہ دوسرے سارے مضامین بھی انگریزی میں تھے اس لئے ان میں بھی ان کی پرفارمنس ٹھیک ٹھاک تھی۔ حساب کمزور تھا۔

راشد: کبھی انہوں نے کسی تقریب یا ڈرامے وغیرہ میں حصہ لیا تھا۔

ابوالنصر: نہیں۔اس زمانے میں، ڈسے اسکولوں میں یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔

راشد: اسپورٹس مین کیسے تھے۔

ابوالنصر: اسپورٹس مین بہت اچھے تھے۔ ہاکی اور فٹ بال بہت اچھی کھیلتے تھے۔سائیکل ریسنگ کا بھی شوق تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جالندھر سے کسی بڑے شہر تک (نام یاد نہیں رہا) سائیکل ریسنگ کا ایک بڑا مقابلہ ہوا تھا۔اس میں بھی رفیق نے حصہ لیا تھا اور کوئی انعام جیتا تھا۔ پروفیسر صاحب اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے اور میں بھول جاؤں۔آپ یہ بھی نوٹ کرلیں کہ لباس کا انہیں اتنا خبط تھا (آپ خبط کے بجائے کوئی اور اچھا سا لفظ لکھ لیں) کہ کپڑوں پر ذرا داغ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ایک بار ایسا ہوا قمیض کی آستین پر روشنائی کا داغ پڑ گیا۔ میں ساتھ بیٹھا تھا۔ بار بار کہتے ابوالنصر دیکھو کیا ہو گیا، دیکھو کیا ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔زخم تو نہیں آیا، دھبہ ہی تو لگا ہے۔لیکن میرا یار رفیق نہ مانا۔انٹرول میں سائیکل لے کر اڑ گیا۔جب اگلا پیریڈ شروع ہوا تو نئی دھلی ہوئی قمیض پہنے بیٹھا تھا۔

راشد: کیا اس زمانے میں انہوں نے کبھی فوج میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

ابوالنصر: مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہو لیکن اتنا ضرور مجھے معلوم ہے کہ میٹرک پاس کرتے ہی انہیں ریاستی فوج میں کمیشن کی آفر ہوئی تھی لیکن انہوں نے انڈین ایئر فورس میں جانا پسند کیا۔۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں۔

راشد: ائرفورس چھوڑ کر آرمی میں جانے کی کوئی خاص وجہ تھی؟

ابوالنصر: ایک بار اس موضوع پر بات ہوئی تھی کہنے لگے مجھے حساب لے ڈوبا۔اچھی خاصی ٹریننگ جاری تھی لیکن میتھس میں نہ چلا۔ بڑی امنگوں سے ائرفورس میں گیا تھا۔ائرفورس نے آرمی کی طرف منتقل کر دیا۔

راشد: چند لفظوں میں آپ ان کی شخصیت پر کیا تبصرہ کریں گے۔

ابوالنصر: اک گوہر شب چراغ تھا، نہ رہا۔

ایک قابل فخر شاگرد

استاد............ مسٹر عبدالحمید قریشی کے تاثرات

راشد: حمید صاحب آپ نے رفیق صاحب کو کہاں پڑھایا اور یہ کب کی بات ہے؟

مسٹر حمید: کے رندھیر ہائی سکول میں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۷ء میں میں نے انہیں نویں دسویں جماعت میں جغرافیہ پڑھایا تھا۔

راشد: کچھ یاد ہے اپ کو بحیثیت طالب علم کیسے تھے؟

مسٹر حمید: جس کو برائٹ کہتے ہیں وہ بات تو نہیں تھی لیکن ملایا کے ایک انٹرنیشنل اسکول میں ابتدائی تعلیم وتربیت حاصل کرنے کی وجہ سے ان کی اٹھان بہت اچھی تھی۔

راشد: ان کی امتیازی خصوصیت کیا تھا؟

مسٹر حمید: چلت پھرت، لباس اور عادات میں ایک انفرادیت تھی۔ رفتار میں تمکنت تھی۔ ملائی زبان چو نکہ یہاں کوئی سمجھتا نہ تھا وہ بے تکان انگریزی بولتے تھے کچھ اس کا رعب بھی تھا۔ غالبا اسی لئے اسکول میں ان کا نک نیم صاحب پڑ گیا تھا۔ سب لڑکے بے تکلفی سے بلکہ تقریبا سب استاد بھی صاحب کہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کپور تھلے کے بڑے بڑے رئیس زادے وزیر زادے بھی انہیں صاحب کہتے تھے۔ میں کہہ چکا ہوں یہ لقب بے تکان انگریزی بولنے اور رکھ رکھاؤ کے طور طریقوں کی وجہ سے پڑا تھا۔

راشد: ان کے دوست زیادہ تھے یا کم؟

مسٹر حمید: میرا خیال ہے کہ کم تھے۔ بادشاہ پور سے لڑکوں کا ایک غول سائیکلوں پر آتا تھا یہ بھی ان میں سے

ایک ہوتے تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بہت کم دیکھا۔۔۔ دوسرے لڑکوں سے صرف کھیلوں پر ملتے جلتے تھے۔

راشد: ان کے پسندیدہ سپورٹس اور کھیل کون سے تھے؟

مسٹر حمید: مثلاً یہ کہ جب کبھی فٹ بال کا کوئی میچ ہوتا تو یہ اسکول بند ہونے کے بعد گاؤں واپس نہیں جاتے تھے۔ کھیل کے بعد گھر کا رخ کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے اسکول میں کچھ کام تھا۔ چھٹی کے کوئی دو گھنٹے بعد میں اسکول کے جوبلی ہال کے پاس سے گزرا تو رفیق کو فرش پر بیٹھے دیکھا۔ میں نے پوچھا اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو۔ سر شام کو فٹ بال کا میچ ہے۔ سوچا ہوم ورک ہی کرلوں۔'' انکا جواب تھا۔

راشد: آخر میں، حمید صاحب ایک اور سوال (جو پہلے پوچھنا چاہیے تھا) کہ کلاس کی کوئی ایسی صورتحال بھی آپ کو یاد ہے۔ جس سے ان کے کردار کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔

مسٹر حمید: اس سوال کا جواب دینے کے لئے مجھے مہاراجہ کپورتھلہ کے بارے میں کچھ بتانا پڑے گا۔ مہاراجہ کی تعلیم وتربیت فرانس میں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ بہت روشن خیال اور کلچرڈ تھا۔ کپورتھلے کی مسجد اس نے استنبول کی مشہور مسجد کے نمونے کی بنوائی تھی اور تعلیم میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا۔ رندھیر اسکول کو ایک سال میں ایک سے زیادہ بار وزٹ کرتا تھا۔ ایک بار مہاراجہ اسکول کے معائنے کے لئے آیا تو میں کلاس میں براعظم جنوبی امریکہ کا تعارف کرا رہا تھا۔ جنوبی امریکہ کے دورے سے واپس آیا تھا۔ اس کو دلچسپی ہوئی۔ کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک آدھ سوال لڑکوں سے پوچھوں''۔ میں نے کہا ''ضرور'' مہاراجہ نے ایک مشکل سوال پوچھ لیا۔

راشد: کیا؟

مسٹر حمید: یہ کہ برازیل کے رقبے میں کتنے یورپی ممالک سما سکتے ہیں۔ سب لڑکے چپ رہے۔ میں بہت

EMBARRASS ہوا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ مہاراجہ کو بتاؤں کہ ابھی ہم یہاں تک نہیں پہنچے کہ یکا یک میاں چراغ دین کے بیٹے رفیق نے ہاتھ اٹھا دیا۔

راشد: کیا صحیح جواب دیا؟

مسٹر حمید: نہیں۔ بڑے ادب سے صرف یہ کہا۔ ''سر ابھی ہم نے برازیل کا تفصیلی مطالعہ شروع نہیں کیا اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ خود ہی ہماری معلومات میں اضافہ فرمائیں. رفیق کی انگریزی اور جواب کے انداز کی شائستگی سے مہاراجہ بہت متاثر ہوا۔ اور میں بھی ان کی فراست اور جرأت کے اظہار سے بہت خوش ہوا۔

راشد: شکریہ حمید صاحب۔

آ ئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مائیں ایسے بچے کبھی کبھی جنتی ہیں

یارِ غار لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد علی انصاری کے احساسات

راشد: انصاری صاحب قبلہ، قبل اس کے کہ ہم آپکے پرانے دوست بریگیڈئر رفیق مرحوم کا ذکر چھیڑیں، پہلے آپ اپنے رویے میں اور رفیق صاحب سے اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ بتائیں تا کہ اس پس منظر میں گفتگو کی معنویت میں مزید اضافہ ہو سکے۔

کرنل انصاری: بھیا راشد، اپنے بارے میں کیا بتاؤں دیکھ رہے ہو کہ (مارا اسد اللہ خان زمانے نے تمھیں) کی تصویر ہوں۔ لیکن کبھی آتش جواں بھی تھا۔ اس زمانے کی داستان یہ ہے کہ میں کپورتھلہ میں پیدا ہوا۔ ایف سی کالج اور گورنمنٹ کالج سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا۔ پھر انگریزی میں ایم اے

کیا۔۱۹۴۳ء میں آئی ایم اے دہرہ دون سے کمیشن لیا۔ ۲۸ برس فوج میں نوکری کی۔ بہت سے کنوئیں جھانکے لیکن زیادہ تر آئی ایس آئی میں رہا۔ بہت دنیا دیکھی۔ اب صاحب فراش ہوں۔ پرانے اعزاء پیارے دوست اٹھتے جاتے ہیں۔ رفیق بھی ایسا ہی یاروں کا یار تھا۔فوج میں برس ہا برس نوکری کی، پری پارٹیشن بھی اور پاکستان بننے کے بعد بھی۔ بلا مبالغہ ہزاروں سینئر اور جونیئر افسروں کو دیکھا اور قریب سے دیکھا۔لیکن رفیق کی بات ہی اور تھی۔ مائیں ایسے بچے کبھی کبھی جنتی ہیں۔

راشد: یہ بہت بڑا اخراج تحسین ہے۔

کرنل انصاری: بھیا میں مبالغہ نہیں کر رہا۔مرنے والا مر چکا۔اب میری تعریف سے اسے کیا فرق پڑے گا۔ میں ایمانداری سے اپنے تاثرات بیان کر رہا ہوں۔کسی کو اختلاف ہو تو شوق سے کرے، میں تو وہی کہوں گا جو میرے دل میں ہے۔

راشد: بجا ہے انصاری صاحب، آپ رفیق صاحب سے اپنے تعلقات کی تاریخ تو بیان فرمایئے۔کب، کہاں کیسے راہ و رسم شروع ہوئی۔کیا وہ آپ کے کلاس فیلو تھے؟

کرنل انصاری: نہیں کلاس فیلو نہیں، رفیق سکول میں مجھ سے جونیئر تھا۔وہ کپور تھلے میرے ایک کزن کے ساتھ پڑھتا تھا، اس وجہ سے اکثر ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ اس کا اپنا گھر کپور تھلے سے چند میل دور بادشاہ پور میں تھا۔ اگر کبھی رات کو دیر ہو جاتی تو ہمارے گھر ہی رات گزارتا۔تو بھیا یہ ابتدا تھی۔ ہماری زندگی بھر کی دوستی کی۔

راشد: اس زمانے میں رفیق صاحب میں کیا خاص بات تھی؟

کرنل انصاری: اب ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں اس کی عزت کی جاتی تھی۔ اور اپنی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ مجھے دھندلا سا خیال ہے کہ شائستہ، خوش لباس اور چاق و چوبند تھا۔ یہ باتیں ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کی ہیں۔

راشد: پھر کہاں ملاقات ہوئی؟

کرنل انصاری: اتفاق سے کمیشن کے بعد ہماری پہلی مڈبھیڑ برما میں ہوئی۔ میں ایک کیمپ کے کنارے کھڑا اپنی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا کہ پاس ایک جیپ آ کر رکی۔ نوجوان افسر کا چہرہ گوگرد سے اٹا ہوا تھا لیکن نقوش مانوس تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ رفیقا، تو یہاں کہاں؟ وہ جھٹ جیپ سے اترا اور جھپاک سے گلے لگ گیا کچھ گلے شکوے ہوئے اور آنسو بھی نکلے۔

راشد: آنسو؟

کرنل انصاری: ہاں جی۔ آنسو بھی نکلے۔ یہ بھی خصوصیت تھی۔ اس کے اعصاب لوہے کے نہیں فولاد کے تھے لیکن دل کا نازک بھی بہت تھا۔ روتا بھی تھا ہوش میں بھی اور حالت سرور میں بھی، اس کے قصے بھی سناؤں گا۔

راشد: یہ اتفاقی ملاقات برما میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد؟

کرنل انصاری: اس کے بعد ایک عرصے تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر تقریبا دس بارہ برس کے بعد پنڈی میں ملا۔ میں جی ایچ کیو میں پوسٹ تھا اور وہ ملٹری کالج سے کسی کام پنڈی آیا تھا اور انہیں یہ جو سامنے بیٹھے ہیں میجر ریاض الحق ان کو لارنس کالج میں داخل کرانے لے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ بیٹے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کہنے لگا، انصاری سوچنا کیا ہے"۔ میرا کام فاؤنڈیشن دینا ہے۔ کدھر جانا ہے، کیا کرنا ہے بڑا ہو کر یہ خود سوچے گا۔ بچوں کو سوچنے کے قابل بنانا ہمارا کام ہے، اپنی سوچ دینا ہمارا کام نہیں۔ بچوں کو دبایا جائے تو وہ آگے چل کر بغاوت کر دیتے ہیں اور نتیجہ صفر نکلتا ہے"۔

مجھے خیال آیا کہ اس واقعہ سے پہلے بھی میں کہیں اس سے ملا تھا اور میں نے کہا تھا یار تجھے کسی تعلیمی ادارے میں ہونا چاہیے تھا۔

راشد: تو پھر انہوں نے کیا کہا؟

کرنل انصاری: اس نے کہا تھا۔ انصاری دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن دیکھو حالات اجازت دیتے ہیں یا نہیں۔ پھر جب اسے ملٹری کالج کی پرنسپلی ملی تو میں نے اس گفتگو کا حوالہ دیا تو یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ کچھ کرر ہا ہوں۔ دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

راشد: آپ نے انہیں شروع میں یکتا شخصیت کہا تھا کس اعتبار سے یکتا تھے؟

کرنل انصاری: اپنے کردار کی خصوصیات کے اعتبار سے۔

راشد۔ مثلاً؟

کرنل انصاری: مثلاً یہ کوئی راز نہیں۔ وہ بڑا ''کلیسا'' تھا۔ کلب لائف کا دلدادہ بلکہ دیوانہ۔ جس زمانے میں وہ پنڈی میں تھا رات کو دو دو تین تین بجے میرے ہاں آ دھمکتا۔ اکثر اختر ملک (جو بعد کو جنرل ہوئے) ساتھ ہوتے تھے۔ خوب ہنگامہ رہتا یہی حال ''کلڈ نے'' (مری) کا تھا۔ رات رات بھر دور چلتا لیکن کیا مجال کہ صبح کی پی ٹی پر ایک منٹ کی دیر ہو جائے۔ سب سے پہلے پی ٹی پر حاضر ہوتا۔ مری کی سردی میں بنیان پتلون میں پی ٹی کرنا مذاق نہیں ہے لیکن میرا شیر رفیق، کسی رعایت کا قائل نہیں تھا۔ نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے۔

راشد: مری کے زمانے کا کوئی خاص واقعہ؟

کرنل انصاری: کوئی خاص تو یاد نہیں سوائے اس کے کہ دوستوں کے ساتھ تو اس کا رویہ مروت کا تھا ہی ملازم اور خدمتگار بھی اس پر جان دیتے تھے۔

راشد: اس کی کوئی مثال؟

کرنل انصاری: اس کی مثال یہ ہے کہ ایک خاص وقت کے بعد میس میں موجود ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن رفیق کے لئے میں نے ایک دو ویٹرز کو رات کے دو دو تین تین بجے تک انتظار کرتے دیکھا ہے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ رفیق رات کے کسی وقت بھی کھانا مانگے اس کو گرم کھانا اور تازہ روٹی پیش کی

جائے۔کبھی کبھار دوسرے افسروں کو بھی ناوقت کھانے کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن ان کے لئے ملازم یہ اہتمام نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے مجھ سمیت انہیں جھنجلاہٹ ہوتی تھی اور کہا کرتے تھے کہ رفیق میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ واقعی اس میں سرخاب کا پر لگا تھا۔

راشد: کیسے؟

کرنل انصاری: اس طرح کہ وہ ملازموں اور خدمت گاروں کو بھی غیر نہیں اپنا سمجھتا تھا۔ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ان سے اس کا تعلق انسانی سطح پر تھا افسری کی سطح کا نہیں۔

راشد۔وہ فرشتہ نہیں، انسان تھے، کچھ خامیاں بھی تو ہوں گی؟

کرنل انصاری۔کیوں نہیں۔سگریٹ بے تحاشا پھونکتا تھا۔پیتا بھی تھا لیکن اس میں بھی ایک ادا تھی۔

راشد۔وہ کیا؟

کرنل انصاری۔جب تک پی تو خوب پی اور جب چھوڑی تو ایک دم چھوڑ دی۔پھر ایک قطرہ حلق سے نیچے نہیں اترا؟

راشد۔وہ کہیں مجبوری تو نہیں تھی؟

کرنل انصاری۔نہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے رفیق نے ۶۹۔۱۹۶۸ء میں پینا چھوڑا۔اس وقت اس کی صحت ٹھیک ٹھاک تھی۔بریگیڈئر تھا۔کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ہاں اس نے سگریٹ پینا ضرور مجبوراً ترک کیا وہ اس طرح کہ گھوڑا گلی کالج کے دور میں جب اس پر دمہ کا حملہ ہوا اور بار بار ہوا تو ڈاکٹر کے مشورے پر اس نے سگریٹ کو بھی خیر باد کہا۔

راشد: بریگیڈئر رفیق کی شخصیت کا کوئی اور تاثر جو آپ کے ذہن پر جم کر رہ گیا ہو۔

کرنل انصاری: ہاں ہاں ہے اور بہت گہرا ہے۔

راشد: وہ کیا؟

کرنل انصاری: روتا بہت تھا۔ ہوش میں بھی اور پی کر بھی۔ روتا بہت تھا اور سسکیوں سے روتا تھا۔

راشد: کیوں؟

کرنل انصاری: میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ایک سبب تو غالبا یہ تھا کہ زندگی سیٹ نہیں تھی، دل کو سکون نہیں تھا۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ اسے احساس محرومی و ناکامی بھی تھا۔

راشد: وہ کیوں؟

کرنل انصاری: ایک بار جب وہ خوب سسکیوں سے رو رہا تھا اور ہوش میں تھا تو میں نے اصرار سے پوچھا، رفیقے تجھے کیا ہوا ہے؟ تیرے دل میں کون سا زخم ہے۔ اتنا کیوں روتا ہے۔ کہنے لگا کہ علی (میرا نام محمد علی انصاری) سوچ رہا ہوں میں کیا ہوں اور کیا ہو سکتا تھا۔ میری زندگی کوئی اور رخ بھی اختیار کر سکتی تھی۔ شاید میں نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

راشد: انصاری صاحب بے حد شکریہ، انٹرویو ختم کرنے سے پہلے دو ایک سوال اور ذرا لائٹ قسم کے۔

کرنل انصاری: جی فرمایئے۔

راشد: پہلے تو یہ کہ کالج میں ہم نے انہیں اکثر و بیشتر انگریزی بولتے ہوئے سنا۔ ان کی دوستی یاری کی زبان کون سی تھی؟

کرنل انصاری: پنجابی، جناب، ٹھیٹھ پنجابی، بڑی زوردار پنجابی بولتا تھا۔ ''ظالم'' اس کا تکیہ کلام تھا۔ ذرا دیر سے ملاقات ہوتی تو کہتا۔ ظالم کہاں رہا۔ ظالم،۔ اطلاع تو دی ہوتی۔ گھر آتے ہی کہتا خواہ رات کا ایک بجا ہو یا دو، ظالم، جلدی کرو، کھلاؤ جو ہے وہی منگواؤ............ اصل میں ظالم ہم دوستوں کا مشترکہ تکیہ کلام تھا۔

راشد: وہ کیسے؟

کرنل انصاری: یہ لفظ ہم نے جنرل فضل مقیم سے لیا تھا۔ پھر بعد کو ہمارے سرکل میں ایک۔ ''کوڈ ورڈ''

بن گیا تھا۔اس لفظ کا استعمال ضامن تھا کہ اب یاروں کی محفل ہے۔کسی تکلف کا موقعہ نہیں؟

راشد: آخر میں ایک سوال ان کی نیند کے متعلق۔ساری رات تو عموماً کلب میں گزرتی۔سوتے کب تھے ؟

کرنل انصاری: رفیق کے لئے دوتین گھنٹے کی نیند کافی ہوتی تھی۔ پنڈی اور مری میں، میں نے اسے بہت دیکھا،کبھی دوڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا۔اور کمال یہ کہ صبح کو اس طرح چاق و چوبند۔

اب تک میں نے آپ کے سوالات کے جواب دیئے۔اب اپنی طرف سے دوچار جملے کہتا ہوں۔ بھیا۔ غالب کا وہ مصرعہ آپ کو یاد ہوگا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

رفیق کی صحیح تعریف ہرگز نہیں،اس کی آزادروی ایک اوپری چیز تھی۔اصل میں وہ بہت کچھ تھے اس لئے جو فقرہ میں نے شروع میں کہا تھا اب پھر اسے دہراتا ہوں۔مائیں رفیق ایسے بچے کبھی کبھی جنتی ہیں۔

نوٹ: یہ انٹرویو اپریل ۱۹۸۳ء میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔اب یہ چراغ سحری بھی بجھ چکا ہے۔حق مغفرت کرے۔

نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

پہلے کمپنی کمانڈر: میجر جنرل (ریٹائرڈ) مظفرالدین کا تبصرہ

راشد: مظفر صاحب! مجھے کرنل ریاض نے بتایا ہے کہ آپ بریگیڈئر رفیق کے بہت گہرے اور بہت پرانے دوستوں میں سے ہیں۔

جنرل مظفر: میں رفیق کا گہرا دوست تھا یا نہیں اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ کم وبیش چالیس سال رفیق سے بہت مخلصانہ تعلقات رہے۔

راشد: اس تعلق کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟

جنرل مظفر: میرا آبائی وطن ہوشیار پور ہے، رفیق کپور تھلے کے تھے گویا علاقہ ایک تھا لیکن ان سے پہلی ملاقات اگست ۱۹۴۲ء میں کلکتے میں ہوئی۔ کلکتے سے کچھ فاصلے پر ان کا کیمپ تھا۔ دیولا نام کا۔ اس کی بیرکیں مجھے ابھی تک یاد ہے بانس کی بنی ہوئی تھیں۔ وہاں رفیق نے لیفٹیننٹ کی حیثیت سے میری کمپنی میں رپورٹ کی۔ وہاں سات آٹھ مہینے ساتھ رہا۔ اور وہیں زندگی بھر دوستی کی بنیاد پڑی۔

راشد: کیا اس دوستی میں کچھ دخل ''گرائیں'' ہونے کا بھی تھا؟

جنرل مظفر: ہرگز نہیں۔ رفیق آفاقی آدمی تھا۔ اس کی دوستی یا دشمنی میں اس طرح کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ پروفیسر صاحب، اس کا اپنا مزاج تھا، وہ کوئی عام انسان نہیں تھا، اس وقت بھی اس کا ایک کردار تھا، اس میں ایک انفرادیت تھی۔

راشد: مثلاً؟

جنرل مظفر: وہ بیباک اور صاف گو تھا۔ دوٹوک بات کرتا تھا۔ لڑائی کا زمانہ تھا، ہر طرح کے افسروں کی ریل پیل تھی۔ لیکن رفیق میں کلاسیکی افسروں کی سی شان تھی، اسی آن بان سے رہتا تھا۔ پینے پلانے کا سلسلہ بھی تھا اور بہت تھا۔ یہ یاد رہے کہ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے جب افسری اور میخواری لازم وملزوم سمجھی جاتی تھی اور مجھ جیسے ''ٹی ٹوٹلر'' خال خال تھے اور عجوبہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس شغل پر بھی اس کی مذہبی اور قومی عصیت غالب تھی۔

راشد: کیا مطلب؟

جنرل مظفر: اس کو مثال سے واضح کرتا ہوں۔ دیولا کیمپ میں ہندو، سکھ، عیسائی ہر قومیت کے بے شمار افسر تھے۔ مسلمان تو ہم چند ہی تھے۔ پاکستان کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم مسلمان افسروں کا تشخص قائم رہے۔ چنانچہ ایک روز میں نے رفیق سے کہا میں تمہیں تمہارے شغل سے منع نہیں کرتا اتنا کرو کہ تم میس کی بار پر مت جایا کرو۔ وہاں ہندو، سکھ، عیسائی سب ہوتے ہیں۔ ان کو اتنا تو معلوم ہے کہ

ہمارا مذہب ان اشغال کی اجازت نہیں دیتا۔تمہارے ان کے ساتھ شریک محفل ہونے سے ہماری قومی انفرادیت کی نفی ہوتی ہے۔ بیشک تم اپنی بار یہاں اس کمرہ میں قائم کرلو۔لیکن نہیں، ہاں نہیں کی۔ کہنے لگا میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔تمہاری بات ٹھیک ہے''۔

راشد: پھر؟

جنرل مظفر: پھر یہ کہ ''ہٹ'' ہی میں دو ایک روز یہ سلسلہ چلا۔

راشد: صرف چند روز؟

جنرل مظفر: جی ہاں۔ چند روز کے بعد کہنے لگا۔''مظفر اس طرح اکیلے مزہ نہیں آتا۔چلو دفع کرو''۔

چنانچہ باقی تقریباً چھ ماہ اس نے خشک گزارے۔ بظاہر اس نے یہ کام میری مروت میں کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی مذہبی عصبیت بھی کم نہیں تھی اس ''تر'' زمانے میں بھی۔ بلکہ خود مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ اندر سے ''مولوی'' کیسے نکل آیا۔

راشد: وہ کیا قصہ ہے؟

جنرل مظفر: وہ قصہ ہے کہ دیولا کیمپ کے قیام کے دوران رمضان آ گیا تو رفیق نے میرے بغیر روزے رکھے اور پورے رکھے۔

راشد: روزے؟

جنرل مظفر: جی ہاں۔روزے اور پورے۔

راشد: گویا ؎ جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

جنرل مظفر: جی ہاں۔ چنانچہ میں نے پوچھا بھی رفیق یہ کیا قصہ ہے تو اس نے بتایا کہ روزے میں بچپن سے رکھتا ہوں پھر اپنے بزرگوں میاں غلام قادر میاں غلام رسول کے بارے میں باتیں کرتا رہا جو عالم، حافظ قرآن اور طبیب تھے۔میاں غلام رسول تو خطاط بھی تھے۔اپنے ہاتھوں سے قرآن مجید کی کتابت کی

تھی۔

راشد: گویا مذہبیت ان کے خون میں تھی۔

جنرل مظفر: جی ہاں۔اُن کا مذہبی گھرانا تھا۔رفیق نے پہلے ائرفورس جوائن کی تھی یہ عادت غالباً وہیں پڑی۔

راشد: آپ ان کے ''خشک'' ہونے کی بات کر رہے تھے؟

جنرل مظفر: جی ہاں۔ میرے دیولا میں ہوتے ہوئے وہ خشک ہی رہا میرے وہاں سے پوسٹ آوٹ ہونے کے بعد پھر یہ سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے معلوم ہوا تو افسوس ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس پائے کے افسر اور انسان پر یہ داغ رہے۔رفیق میں کچھ تضادات تو تھے اس کے اندر کا جن کبھی قابو میں اور کبھی بے قابو ہوتا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں اس کی قوتیں اور صلاحیتیں غیر معمولی تھیں اس دور میں جب رفیق کی بلانوشی عروج پر تھی ایک محفل میں رفیق ''ڈسکس'' ہو رہا تھا تو میں نے کہا تھا میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ شخص اپنی اصل کی طرف لوٹے گا۔ یہ اندر سے بہت ORTHODOX ہے۔رفیق کا قلب ہمیشہ سے مومن تھا۔قومی عصبیت تو اس میں اس وقت بھی انتہا درجے کی تھی۔ چنانچہ میرا خیال صحیح ثابت ہوا اور آخری دس بارہ سال رفیق نے خشک ہی نہیں،صوفیانہ انداز سے گزارے۔

کیسے کیسے لوگ اٹھتے جاتے ہیں!

ہمدم وہم مشرب..... لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) نذیر احمد کی آہ سرد

کرنل نذیر رفیق صاحب کے یارِ غار ہیں۔۱۹۴۲ء میں آئی ایم اے سے دوستی شروع ہوئی تھی۔ جو رفیق صاحب نے آخر دم تک نبھائی اور خود نذیر صاحب کی حالت یہ ہے کہ رفیق صاحب کے تذکرہ پر پہلے روتے پھر بات کرتے ہیں۔

بریگیڈئر اسحاق صاحب کے ساتھ کھاریاں میں ان کی کوٹھی پر نذیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔

اعصابیت کا شکار خاصے بیمار تھے۔ بولنے میں بھی تکلف ہوتا تھا اس حالت میں بھی انٹرویو دیا۔

راشد: نذیر صاحب، بریگیڈئر رفیق سے کب رسم وراہ شروع ہوئی؟

کرنل نذیر: پروفیسر صاحب۔ بہت پرانہ یارانہ تھا۔ رفیق سے ۱۹۴۲ء سے دوستی شروع ہوئی تھی۔ ساتھی سنگی اٹھتے جاتے ہیں۔ خود میری یہ حالت ہے۔ زندگی کا مزہ نہیں رہا۔

راشد: کہاں کہاں ساتھ رہے؟

کرنل نذیر: دونوں پنجابی تھے بار بار اکٹھے رہے۔ کمپنی کمانڈری بھی ساتھ ساتھ کی۔ ۱۹۴۲ء میں آئی ایم اے سے تعلق شروع ہوا تھا۔ تین مہینے سینئر تھا اس وجہ سے رفیق ۱۲ پنجاب اور ۴/۱۵ میں میرے ٹو آئی سی رہے۔ ۵۳ میں جب وہ ملٹری کالج چھوڑ کر پلٹن میں واپس آ گئے تو ایک بار پھر ساتھ ہوا۔ لیکن نوکری تو انسان بہتوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اصل بات طبیعت ملنے کی ہوتی ہے۔ میرا یار رفیق اچھا دوست تھا۔ (پھوٹ پھوٹ کر رونے کے بعد) کیا بات کروں۔

بریگیڈئر اسحاق: میرا خیال ہے تھوڑا سا بریک کرتے ہیں نذیر صاحب پر دورہ پڑنے لگا ہے۔
آپ چائے پیئں۔

راشد: بہت بہتر۔

(چائے کے بعد)

کرنل نذیر: پروفیسر صاحب معاف کیجئے گا میرے اعصاب کوئی غم، کوئی خوشی برداشت نہیں کر سکتے۔
اب میں ٹھیک ہوں۔ اب کچھ پوچھیں۔

راشد: پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔ آپ کے لئے یہ تذکرہ برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ آج صرف کوئی ایسا واقعہ سنا دیجئے جس سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہو۔

کرنل نذیر: چالیس سال تک تعلقات رہے ہزار ہا واقعات ہیں آپ کو کیا بتاؤں، میرا تو دل پھٹا جا رہا

ہے۔

راشد: اس وقت آپ کی طبعیت ٹھیک نہیں میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا کوئی ایک واقعہ تبرکاً سنا دیجئے۔

بریگیڈئر اسحاق: نذیر وہ مری والا واقعہ سنا دیں۔

کرنل نذیر: کون سا؟

بریگیڈئر اسحاق: وہی جس میں انہوں نے کار والے کو باکس کیا تھا۔

کرنل نذیر: ہاں۔قصہ یوں ہے کہ ایک بار، میں، رفیق اور توقیر (کرنل توقیر) مری جا رہے تھے۔رفیق ڈرائیو کر رہے تھے۔چھرہ پانی کے قریب پیچھے سے ایک کار آئی اور اس نے غلط طریقے سے اوورٹیک کیا اور بدتمیزی سے کیا۔وہ لوگ شاید نشے میں تھے۔رفیق کو تاب کہاں۔رفیق نے اس کار کا پیچھا کیا اور دو تین میل اوپر جا کر اس کو جا لیا اور اس کو ڈانٹا۔کار ڈرائیور آپے میں نہ تھا، اس نے پستول نکال لیا۔رفیق کہاں دھمکی میں آنے والا تھا یہ اس پر جھپٹا تو اس نے فائر کر دیا۔میں بال بال بچا۔پھر رفیق نے جو اس کو باکس کیا ہے اس کی حد و انتہا نہیں تھی۔میں نے بڑی مشکل سے چھڑایا۔رفیق اصول کا پکا تھا۔غلط کام اور غلط آدمی کو برداشت نہیں کرتا تھا۔رفیق جنرل اختر کا بڑا دوست تھا۔جبرالٹر اپریشن میں رفیق نے بڑا کام کیا۔رفیق جب ملڑی کالج میں تھا تو میں وہاں جاتا رہتا تھا۔جس زمانے میں گھوڑا گلی میں پرنسپل تھا تو پنڈی میں میری کوٹھی پر اس کا بہت آنا جانا تھا۔

راشد: نذیر صاحب شکر ہے کہ آج آپ کی طبعیت کچھ بہتر نظر آ رہی ہے۔

کرنل نذیر: بہتر کیا ؎ چراغ سحری ہوں اب بجھا اب بجھا کی صورت ہے۔

راشد: یہ فرمایئے کہ آپ رفیق صاحب کے ہم پیالہ ہم نوالہ رہے ہیں یہ کیا سلسلہ تھا۔

کرنل نذیر: جوانی کی رات تھی بیت گئی وہ یاروں کا یار مٹی میں مل چکا۔اختر ملک نہ رہے، انصاری کی جو

حالت ہے وہ آپ لاہور میں دیکھ آئے ہیں، اب ان باتوں کو کریدنے سے کیا حاصل۔

راشد: اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ کا ان سے اتنا یارانہ تھا پھر وہ آپ کے ٹو آئی سی بھی رہے، یہ دونوں تعلق ساتھ ساتھ کیسے چلے۔

کرنل نذیر: رفیق میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ اس نے کلب اور یونٹ کو الگ الگ رکھا ہوا تھا، کیا مجال کہ ایک قدم ادھر سے ادھر ہو جائے۔ آہ کیسا انسان مٹی میں مل گیا۔

راشد: سدا رہے نام اللہ کا۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایک کلاسیکی افسر

میجر (ریٹائرڈ) مولا بخش

دسمبر ۱۹۴۷ء میں کمیشن ہونے کے بعد میری عارضی پوسٹنگ ان کی یونٹ ۱۵/۴ پنجاب میں ہوئی تھی جو ان دنوں رزمک وزیرستان میں متعین تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میں اپنی مستقل یونٹ میں پشاور چلا گیا۔ اس وقت وہ کیپٹن تھے۔ اس طرح ایک یونٹ میں ان کے ساتھ بہت کم عرصے رہا لیکن اس قلیل عرصے میں ایک لمبی دوستی کی بنیاد پڑ گئی۔ پھر ہم علیحدہ علیحدہ دائروں میں حرکت کرتے رہے۔ لیکن دسمبر ۱۹۴۷ء کی دوستی قائم رہی۔ آج تو سارے آرمی میس خشک ہیں پہلے ایسا نہ تھا۔ اس زمانے میں ہر میس تر تھا بلکہ دریا تھا اور جس افسر کا دامن تر نہ ہوتا اس زمانے کے معیار سے اسے صحیح افسر نہ سمجھا جاتا۔ شام کو میس میں حاضری ایک طرح سے ڈیوٹی ہی شمار ہوتی تھی اور میس کے آداب دن کی نوکری کے آداب سے سخت تر تھے۔ چنانچہ کیپٹن رفیق کی شامیں بھی میس کی بار پر گزرتی تھیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ راتیں بھی۔ مجھے ایک آدھ باران کے ساتھ میس میں فنکشن اٹینڈ کرنے کا اتفاق ہوا تو انہیں میس سے سب سے آخر میں جانے

والوں میں پایا۔لیکن صبح کی پی ٹی کبھی مس نہیں کی۔اس کے علاوہ اس عمر میں بھی وہ میس کے مشاغل میں کچھ اصولوں کے پابند تھے مثلاً یہ کہ وہ کبھی بدمست نہیں ہوئے اور کبھی برج کی میز پر بازی نہیں لگائی۔اس زمانے میں تو یونٹوں میں سینئر افسر انگریز ہی ہوتے تھے۔ جتنا عرصہ میں رزمک میں رہا میں دیکھا کہ وہ ان کے ساتھ کندھا ملا کر چلتے تھے، دبنے یا رعب میں آنے کی تو وہ چیز ہی نہیں تھے۔ان کی ایک خصوصیت جو اس وقت بھی نمایاں تھی یہ تھی کہ سینئرز سے غیر ضروری رعب نہیں کھاتے تھے لیکن جونیئرز کا خیال رکھتے تھے۔دوستی نبھانا جانتے تھے۔اپنی چال ڈھال، طریق کار اور عادات سے وہ افسر کے کلاسیکی تصور کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

پی ایم اے کی میتھڈ افسری کی صدائے بازگشت

۱۸۷ا جنرل محمد اقبال خان نشان امتیاز۔ستارہ بسالت

۱۹۵۰ء میں جب پی ایم اے کی خالد کمپنی میں انسٹرکٹر کی حیثیت سے پوسٹ ہوا تو وہیں رفیق صاحب سے تعارف ہوا۔وہ میجر کے رینک میں اکیڈیمی کے میتھڈ آفیسر تھے۔میں نے کیپٹن کی حیثیت سے ان کے زیر اہتمام میتھڈ آف انسٹرکشن کا چار ہفتے کا ایک کورس بھی کیا۔لیکن چونکہ رینک میں زیادہ فرق نہیں تھا، آف پریڈ بھی ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ایک میتھڈ افسر کو ایک مثالی افسر کی تمام صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔نہ صرف وہ طریق تعلیم کی تکنیک میں طاق ہو بلکہ ایک اچھا مقرر ہو، منتظم ہو اور قائدانہ صلاحتیں رکھتا ہو۔ان صفات کے علاوہ اسکی نظر فن جنگ پر بھی ہو کیونکہ اس کا کام بہت مشکل ہوتا ہے۔اس لحاظ سے کہ اسے زمانہ امن میں جنگ کو سامنے رکھ کر ٹریننگ پروگرام مرتب کرنا پڑتا ہے تاکہ زیر تربیت کیڈٹس زیادہ سے زیادہ جنگ کے سے حالات میں تربیت حاصل کر سکیں۔اس کے لئے نہ صرف تخیل چاہیئے بلکہ اعلی درجہ کی تنظیمی اور منصوبہ بندی کی صلاحیت بھی چاہیئے اور سب سے بڑھ کر خود اسے اعلی درجہ کا انسٹرکٹر ہونا چاہیئے تاکہ اس کے حوالے سے دوسرے انسٹرکٹر افسر رہنمائی حاصل کر

سکیں۔ بحثیت میتھڈ افسر کے وہ اس فن کے او نچے سے او نچے معیار پر اتر تے تھے۔ جز ئیات پر نظر رہتی تھی۔ تنظیمی صلاحیت بے پناہ تھی۔ خود بہت اچھے انسٹر کٹر تھے۔ بو لنے کا انداز بہت ہی موثر تھا۔ ٹرن آ ؤٹ اور بیر نگ سے بھی کیڈ ٹس بہت متاثر تھے۔ مجلسی آ دمی تھے اور میس لائف کے دلدادہ، یہ ان کی زند گی کا دوسرا رخ تھا۔

کرنل (ریٹائرڈ) مسعود قمر پنجاب رجمنٹ

راشد: مسعود صاحب آپکی رفیق صاحب سے رسم وراہ کب کی ہے؟

کرنل مسعود: بہت پرانی۔ میرا کمیشن ۱۹۴۳ء کا ہے۔ تھرڈ پی ایم اے کورس میں طارق کمپنی کی ایک پلاٹون کا کمانڈر تھا تو رفیق صاحب میجر کے رینک میں میتھڈ آفیسر تھے۔ وہاں دو تین برس ایک ساتھ نوکری کی۔ چونکہ پڑوسی بھی تھے اور ہم مشرب بھی اس لئے خوب گپ شپ رہی۔

راشد: پہلے تو میتھڈ افسری پر کچھ روشنی ڈالیے۔

کرنل مسعود: وہ بہت ہی کامیاب میتھڈ افسر تھے۔ کام کی جزئیات میں جاتے تھے۔ نوک پلک پر بھی نظر رکھتے تھے۔ خود بہت ہی موثر لیکچر دیتے تھے۔ آواز میں بڑی گونج تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک کشش تھی۔ اصولوں میں بے لچک تھے۔ دوست ہو یا دشمن کوئی ان سے غلط کام نہیں کرا سکتا تھا۔ لیکن ڈیوٹی کے بعد وہ کلب کے ہو جاتے تھے اور اس میں بھی دوسری انتہا پر تھے۔

راشد: یعنی؟

کرنل مسعود: یعنی کلب لائف کے شوقین بھی تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ انہیں فرشتہ بنا کر پیش کر رہے ہیں یا کیا۔ یہ ظلم نہ کیجئے گا۔ بڑا اگریٹ آدمی تھا۔ بے داغ دیانت تھی۔ لیکن چند کمزوریوں سے کم از کم اس وقت خالی نہ تھے اور میں بھی نہ تھا۔ دونوں کے پاس موٹر بائیک تھی۔ ایبٹ آباد سے اکثر پنڈی کلب آتے تھے۔ اور رات گئے دو تین بجے واپس جاتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی اس سے غرض نہ تھی۔ ایک بار شدید سردی میں نکلے۔ حسن ابدال پہنچتے پہنچتے قلفی جمنے لگی۔ چنانچہ ایک کھوکھے پر ٹی اسٹال والے کو سوتے سے اٹھایا۔ کئی کپ گرم چائے پی تو آگے بڑھے۔ اٹک میں ۳/۱۵ پنجاب تھی۔ وہاں پھر ساتھ ہوا۔ کرنل داؤدسی او تھے۔ وہاں انہوں نے کئی بار ہنگامہ کیا۔ یہ سب اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ کتاب میں ان کو ایک انسان کے طور پر پیش کریں۔ ان کی کمزوریوں نے انہیں عظیم نہیں بنایا بلکہ ان کے باوجود وہ

یاروں کا عظیم یار تھا۔کوئی انسان بھی کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتا۔لیکن یہ امتیاز بھی انسان کو ہی حاصل ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں سے بلند ہوسکتا ہے، ان سے آگے نکل سکتا ہے۔اس لئے انسان کے ذہنی اور نفسیاتی ارتقا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور انسان کو اس کی نفسیاتی شخصیت کے حوالے سے دیکھنا چاہیئے۔اس معیار کو ملحوظ رکھا جائے تو میں کہوں گا کہ اس شخص کا جواب نہیں تھا۔ایسے کردار کے آدمی مشکل سے ملتے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) سلطان بادشاہ: بلوچ رجمنٹ

راشد: سلطان صاحب بریگیڈئر رفیق سے آپ کا تعارف کب ہوا؟

کرنل سلطان: ۱۹۴۹ء میں پی ایم اے میں کورہوں س کر رہا تھا تو بریگیڈئر صاحب میجر کے رینک میں ہمارے میتھڈ آفیسر تھے۔ وہ ہمیں میتھڈ آف انسٹرکشن پر لیکچر دیتے تھے۔

راشد: بحیثیت استاد کے آپ نے انہیں کیسا پایا۔

کرنل سلطان: کسی استاد سے ہم دو طرح سیکھتے ہیں ایک اس نصاب کے حوالے سے جو وہ ہمیں پڑھاتا ہے دوسرے اس کی شخصیت کے حوالے سے۔ میں نے دونوں حوالوں سے انہیں بہت موثر اور باکمال پایا۔

راشد: لیکن کون سا پہلو یا کون سا حوالہ زیادہ موثر تھا؟

کرنل سلطان: شخصیت کا پہلو، ویسے ان کا طریق تعلیم بھی کم موثر نہ تھا۔ انگریزی کا لب ولہجہ انگریزیانہ تھا۔ لفظوں کی ادائیگی بہت واضح ہوتی تھی اور قائداعظم کی طرح خاص خاص فقروں پر ذرا زور دے کر بولتے تھے لیکن میں اور میری طرح بہت سے جی سیز ان کی awe-inspiring شخصیت سے زیادہ متاثر تھے۔ ان کی شخصیت کا ظاہری پہلو بھی بہت متاثر کن تھا۔ ہم نوجوان تھے ہمیں اس وقت سب سے زیادہ ان کے ٹرن آؤٹ نے متاثر کیا تھا۔ پی ایم میں اس وقت ایک سے ایک اسمارٹ افسر موجود تھا لیکن ان میں بھی ان کی انفرادیت قائم تھی۔ عموماً سروس ڈریس پہنتے تھے تو ان کی شان قابل دید ہوتی تھی۔ ان کی آنکھیں عقابی تھیں اور ان کے چہرے مہرے سے جلال کا اظہار ہوتا تھا۔

لیفٹنٹ کرنل (ریٹائرڈ) سید توقیر حسین: پنجاب رجمنٹ

بریگیڈئر رفیق سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں جب میری پوسٹنگ بھی پی ایم اے تھی ہوئی تو انہوں نے وہاں بڑی گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا۔ حسب عادت وہ اپنے کام کو بڑی سنجیدگی سے لے

رہے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کہا توقیر مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آسکے۔ نوجوان افسروں کی تربیت بہت بڑا اعزاز اور بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ان کی خدمت پاکستان کی خدمت ہے۔ اس وقت ان کے الفاظ مجھے رسمی سے لگے تھے لیکن بعد کے حالات و تجربات نے ثابت کر دیا کہ افسروں کی صحیح تربیت کتنے گہرے اور دور رس اثرات رکھتی ہے۔ رفیق صاحب بہت اچھے دوست بھی تھے۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ اس واقعہ کا تعلق میری ذات سے ہے۔ اگر وہ بروقت میری جان نہ بچاتے تو آج یہ کہانی لکھنے کے لئے دنیا میں موجود نہ ہوتا۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ ایک روز جو روزہ زیادہ لگا تو ہم دونوں پی ایم اے کے سوئمنگ پول پر چلے گئے۔ میں کافی دیر تک تیرتا رہا لیکن جب ایک بار میں نے اوپر سے گہرے پانی میں چھلانگ لگائی تو ایک دم میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور جسم بے جان سا ہو گیا۔ رفیق نے جب دیکھا کہ توقیر نیچے سے اوپر نہیں آیا تو انہوں نے کپڑوں سمیت چھلانگ لگائی اور مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۰ء کے اواخر کا ہے اس کے بعد زندگی کی بہت سی منزلوں اور بہت سے مرحلوں میں ان سے واسطہ پڑا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا وہ پی ایم اے کے سوئمنگ پول میں مجھے ڈوبنے سے بچانا محض ایک اضطراری فعل نہ تھا بلکہ گرتوں کو تھامنا اور ڈوبتوں کو سہارا دینا ان کی عادت و خصلت تھی۔ فرائض کی ادائیگی میں بے لچک سختی اور تعلقات میں لچک اور مروت ان کی شخصیت کا ایک تابناک پہلو تھا۔

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

۹ پنجاب کی نائب کمانداری جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ کی چیف انسٹرکٹری
بریگیڈئر (ریٹائرڈ) اقبال شفیع ستارۂ امتیاز کا انٹرویو

جرأتوں کے نشانوں کے سلسلہ میں بریگیڈئر اقبال شفیع صاحب سے ان کے چکلالہ میں آرٹ گیلری نما گھر میں ملاقات ہوئی تو برسبیل تذکرہ بریگیڈئر رفیق کا ذکر بھی آیا۔ ان کا نام سنتے ہی اقبال شفیع صاحب بے اختیار بول اٹھے۔ بریگیڈئر رفیق کیا بات ہے۔ ان کی ملٹری لیڈرشپ میں مجاہدانہ رنگ تھا۔ یگانہ و یکتا۔ آنکھوں کی جس چمک اور لہجے کی جس گرمی کے ساتھ انہوں نے یہ الفاظ ادا کئے اس سے ہمیں تجسس پیدا ہوا کہ انہیں کریدا جائے کہ یہ چنگاریاں کہاں سے آئیں۔ اس کے بعد کی گفتگو یہاں نقل کی جاتی ہے۔

راشد: شفیع صاحب آپ نے چند لفظوں میں مرحوم پر بڑا ابھرپور تبصرہ کیا ہے اس کا پس منظر کیا ہے؟

اقبال شفیع: پس منظر آپ کیا پوچھتے ہیں میں ان کا ایجوٹینٹ رہا ہوں۔

راشد: ایجوٹینٹ؟ کب کہاں؟ یہ تو بہت دلچسپ انکشاف ہے۔

اقبال شفیع: یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے وہ ایبٹ آباد میں ۹ پنجاب کے ٹو آئی سی تھے اور میں پلٹن کا ایجوٹینٹ، اس رشتے سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے انہیں خلوت و جلوت میں کتنا دیکھا ہوگا اور کتنے قریب سے دیکھا ہو۔ یہ جو میں نے ابھی کہا کہ ان کی قیادت میں مجاہدانہ اور پاکستانی رنگ تھا اسی دور کے مشاہدات پر مبنی ہے۔ آپ کے کالج میں ۱۹۵۲ء میں وہ ۹ پنجاب ہی سے گئے تھے۔

راشد: ۹ پنجاب یا پی ایم اے کی متھیڈ افسری سے؟

شفیع: نہیں ۹ پنجاب سے۔ جون ۱۹۵۲ء کے اواخر میں سیالکوٹ سے خود میں نے انہیں الوداع کہا تھا۔ اس وقت تک یونٹ اٹک فورٹ سے سیالکوٹ منتقل ہوگئی تھی۔

راشد: شفیع صاحب کیا کوئی ایسا واقعہ آپ کے ذہن میں ہے جس سے عام پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہو

جائے کہ ہاں واقعی اس بندے میں مجاہدانہ اور پاکستانی رنگ تھا؟

شفیع: ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں لیکن ایک واقعہ جو ابھی یکا یک ذہن میں آ گیا ہے عرض کرتا ہوں۔

راشد: فرمائیے۔

شفیع: یونٹ ایبٹ آباد میں ہی تھی کہ ایک دن سگنل آیا کہ ہمیں فوراً اٹک فورٹ میں منتقل ہونا ہے۔ اسی سگنل میں یہ بھی تھا کہ یونٹ کی موومنٹ کے لئے ضروری تعداد میں گاڑیوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اب بریگیڈئر رفیق کا ردعمل دیکھئے یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ میجر اور ٹو آئی سی تھے۔ انہوں نے احتجاج کیا پلٹن کی موومنٹ برحق لیکن یہ ٹرانسپورٹ کس لئے؟ سوسوا سو میل کے فاصلے پر ایک انفنٹری بٹالین موو کرے اور ٹرکوں پر سوار ہو کر جائے؟ چونکہ ان دنوں پلٹن کے سی او بیمار تھے یہی ایکٹنگ سی او تھے انہوں نے مجھ سے کہا شفیع پلٹن جمع کرو میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے سب لوگوں کو جمع کیا۔ پھر رفیق صاحب نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں پلٹن سے کہا پاکستان میں ایندھن کی کمی ہے، ٹرانسپورٹ کی کمی ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ انفنٹری بٹالین ہے سوسوا سو میل کا فاصلہ ہے۔ کیا ٹرانسپوٹ پر سوار ہو کر جانے کی بے عزتی برداشت کرلیں؟ ہر طرف سے آواز آئی ہرگز نہیں، ہم روٹ مارچ کریں گے۔ رفیق صاحب نے خوش ہو کر کہا، ویل ڈن، میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ چنانچہ طے پایا کہ ساری پلٹن مارچ کرے۔ صرف عورتوں، بچوں، بیماروں اور کیمپ کے خدمت گاروں کے لئے گاڑیوں کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

راشد: بہت خوب!

اقبال شفیع: ابھی کہاں مارچ کی تفصیلات تو سنئیے۔ پلٹن اس شان سے روٹ مارچ پر روانہ ہوئی کہ سب سے آگے یونٹ کی قیادت رفیق صاحب کررہے تھے، پورے ایف ایس ایم او کے ساتھ، انکے بعد

یونٹ کا بینڈ تھا، اس کے پیچھے ساری پلٹن تھی پورے ساز وسامان کے ساتھ۔ اس شان سے پلٹن نے مارچ کیا۔ پہلا ہالٹ ہری پور کی گراونڈ میں ہوا تھا (جہاں بعد کو ایک صدر صاحب کے صاحبزادے نے اپنا پڑول پمپ بنالیا۔ یہ آپ لکھیں یا نہ لکھیں)۔ دوسرا ہالٹ حسن ابدال میں اس جگہ ہوا تھا جہاں اب کیڈٹ کالج حسن ابدال ہے۔ تیسرے دن اٹک فورٹ پہنچے۔ یہاں یہ بھی بتا تا چلوں کہ ہالٹوں کے دوران جہاں اور رینکس ستاتے تھے، اپنے پاؤں کو گرم پانی سے دھوتے تھے، مساج کرتے تھے، اس دوران بھی بیشتر وقت رفیق صاحب ادھر سے ادھر جوانوں کر دیکھتے پوچھتے رہتے تھے۔ اللہ اکبر کیا اسٹیمنا تھا! کیا قیادت تھی۔

راشد: آپ اٹک فورٹ پہنچنے کی بات کر رہے تھے۔

اقبال شفیع ; جی ہاں، اٹک فورٹ سے میل آدھ میل ادھر پھر ٹھہرے۔ جوانوں سے کہا گیا کہ اپنی وردی وغیرہ ٹھیک کریں اور تازہ دم ہو جائیں۔ تو جناب وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا جب ۹ پنجاب فورٹ میں داخل ہوئی۔ سب سے آگے ببر شیر کی طرح رفیق صاحب تھے، بینڈ کی تیز دھنیں بج رہی تھیں اور جوان قدم ملائے دمکتے چہروں کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ کاش اس زمانے میں ویڈیو کیمرہ ہوتا۔

راشد: سبحان اللہ کیا بات ہے کمانڈر ہو تو ایسا ہو۔

اقبال شفیع: اب بریگیڈئر رفیق کے دوسرے پہلو پر آتا ہوں۔ ان کی زندگی میں پریڈ، میس اور گھر تین بالکل علیحدہ چیزیں تھیں۔ پریڈ پر یعنی سرکاری کام کے وقت نہ وہ اپنی رعایت کرتے تھے نہ کسی دوسرے کی بلکہ جان کے دشمن نظر آتے تھے۔ سخت ترین معیار خود قائم رکھتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ دوسرے بھی ایسا کریں۔ دوست دشمن کی تمیز نہیں ہر ایک کو اس کا حق اور ہر ایک سے انصاف یہ ان کا طریق کار تھا اور ان کے ساتھیوں اور ماتحتوں کو سو فیصد یقین ہوتا تھا کہ ان حالات میں رفیق کا یہ ردِ عمل ہوگا۔ ان کے ہاں غلط کام کی اگر سزا سخت تھی تو صحیح کام کا انعام بھی بہت تھا۔ میس میں دوسرے موڈ میں ہوتے

تھے۔ رکھ رکھاؤ اور آداب۔ میس کے وسیع دائرے میں زندگی کی لائٹ سائڈ اپنا رنگ دکھاتی تھی لیکن وہاں بھی یہ نہیں تھا کہ ان کے سامنے کوئی جونیئر افسر خواہ کتنا ہی لائٹ موڈ میں ہو سگریٹ کی راکھ قالین پر گرادے یا کوئی اور بدتمیزی کرے۔ لیکن گھر پر رفیق کا انداز ہی اور تھا۔ گھر پر وہ لکھنو کے روائتی میزبان نظر آتے تھے شائستگی اور مہمان نوازی میں۔ لیکن بے جا تکلف کے بغیر گھر پر وہ جونیئر پر بھی جان چھڑکتے تھے۔ وہاں پر ہر ایک وی آئی پی ہوتا تھا۔ جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہوگا ان کی پرائیوٹ زندگی بالکل مختلف تھی (گو آخر میں وہ بھی یکسر بدل گئی تھی) اس لئے ہم تو اس رفیق کو دیکھیں گے جو سامنے تھا اور جو رفیق سامنے تھا وہ ایسا تھا جس نے ایک نہیں سینکڑوں، ہزاروں پر دوررس اثرات چھوڑے۔ ان کی سکھلائی نے ہر ایک کو اتنا متاثر کیا کہ اسکے نتائج جنگ میں نظر آئے۔

راشد: وہ کیسے اس کی دو ایک مثالیں آپ دینا چاہیں گے؟

شفیع: ضرور کیوں نہیں۔ کئی مثالیں ہیں۔ پہلا واقعہ ۲۵/ مارچ ۷۱ء کا ہے۔ جب ملٹری ایکشن شروع ہوا میں ۵۳ بریگیڈ کمان کر رہا تھا اور ہمارا ہیڈ کوارٹر کومیلا میں تھا۔ چٹا گانگ کی صورت حال بہت خراب تھی۔ ۲۴ ایف ایف آر نے کومیلا سے چٹا گانگ کی طرف موو کرنا شروع کیا۔ ۱۰۵ میل کا فاصلہ تھا۔ چٹا گانگ سے ۱۷ میل شمال میں ۱۲ ای بی آر کے باغیوں نے ۲۴ ایف ایف آر پر حملہ کیا۔ باغیوں میں میجر ضیاء الرحمٰن بھی شامل تھا جو بعد کو وہاں کا صدر بنا۔ اس حملہ میں ۲۴ ایف ایف کے کمانڈر کرنل شاہ پور خاں شہید ہوئے۔ میں نے بریگیڈ کمانڈر ہوتے ہوئے بٹالین کی کمان خود سنبھالی اور سب سے آگے رہا۔ اسی طرح لڑتے بھڑتے چٹا گانگ پہنچے اور جتنے حملے پہاڑیوں کے اوپر نیچے ماپنگ اپ آپریشن میں کرنے پڑے وہ میں نے خود لیڈ کیے۔ چٹا گانگ میں ٹو ای بی آر کی کمپنی سے ہتھیار رکھوائے۔ مجھے یاد ہے کہ چٹا گانگ کے آپریشن میں نیوی کے (جہانگیر) جہاز نے فائر سپورٹ دی تھی جس کو کیپٹن طارق کمال خان کمان کر رہے تھے جو اب ایڈمرل اور چیف آف نیول اسٹاف ہیں سبحان اللہ! یہ حقیقت ہے کہ جب میں نے ۲۴

ایف ایف کی کمان سنبھالی تو میرے ذہن میں رفیق صاحب کی ایبٹ آباد سے اٹک فورٹ تک کی لانگ مارچ تھی کہ کس طرح وہ سب سے آگے تھے۔ یہ ان کا انسپیریشن تھا کہ اس نازک موقعہ پر میں کچھ کر سکا۔ یہ ایک مثال ان کی کمانڈ کی تاثیر کی تھی۔ بریگیڈئر رفیق کے کردار کی دوسری بہت نمایاں خصوصیت تھی دستگیری، ہمدردی، شفقت، ویلفیئر، احسان چاہے جو نام بھی اسے دیجئے اور اس میں بھی ایک اصول یہ تھا کہ ان کے کرم کا رخ نیچے سے اوپر کی طرف تھا۔ چھوٹوں زیردستوں پر پہلے اس کے بعد اوپر۔ ان کی اس صفت سے ہر اس شخص نے جس نے ان کے ساتھ کام کیا ہے ضرور انسپیریشن لیا ہے۔

راشد: اس کی بھی کوئی مثال؟

شفیع: اس کی بھی ایک مثال اس کومیلا چٹا گانگ آپریشن سے دیتا ہوں۔ کومیلا میں کوئی ہزار بارہ سو عورتیں بچے جمع ہو گئے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کی انہیں مغربی پاکستان کیسے بھیجا جائے۔ حالات کا رخ ٹھیک نہیں تھا۔ اپریل کے اوائل میں جب میں چٹا گانگ آپریشن کی رپورٹ ڈھاکہ دینے آیا تو جنرل ٹکا، جنرل خادم حسین راجہ، جنرل راؤ فرمان علی وغیرہ سب موجود تھے۔ بریفنگ کے بعد میں نے کہا میرا مسئلہ یہ ہے کہ کومیلا میں جو ہزار ڈیڑھ عورتیں، بچے ہمارے آل رینکس کے ہیں انہیں کیسے واپس بھیجا جائے۔ اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ کمک لے کر جو ہوائی جہاز چٹا گانگ آتے ہیں وہ واپسی میں پندرہ منٹ کے لئے کومیلا میں اتر جایا کریں۔ اس طرح یہ محفوظ طریقہ سے کراچی پہنچ جائیں گے۔ کسی نے کہا وقت کا سوال ہے۔ میں نے یقین دلایا کہ وقت بچانا میری ذمہ داری ہے۔ مختصر یہ کہ جب خلاصی کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو سب خاندانوں کو ائرپورٹ پر جمع کر لیا گیا اور میں نے اپنے بی ایم میجر سلطان (اب بریگیڈئر سلطان ایس جے بار) سے کہا اصول یہ ہوگا کہ سب سے پہلے سپاہیوں کے بیوی بچے، پھر اور رینکس اسکے بعد افسروں کے اور سب سے آخری پرواز سے میرے اور تمہارے اہل وعیال جائیں گے۔ سلطان تو خود رفیق صاحب کے ساختہ پرداختہ ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اسی ترتیب سے فیملیز

گئیں۔ کچھ ردوقدح کا سلسلہ بھی تو ہوا۔

راشد: وہ کیسے؟

شفیع: ایک افسر آئے انھوں نے اصرار کیا میری بیٹی جوان ہے پہلے اسے بھیج دیا جائے۔

راشد: پھر

شفیع: اس کا جواب سلطان نے یہ دیا سر اور رینکس کی بھی بہت سی بیٹیاں جوان ہیں۔ میری اپنی بیٹی بھی ہے اللہ مالک ہے آپ فکر نہ کیجئے۔ چنانچہ جب آخری جہاز میں میرے بیوی بچے بیٹھے اور جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کیا اس وقت ایک عجیب طمانیت کا احساس ہوا ہوا اور میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عمل کے پیچھے بھی بنیادی طور پر وہ سکھلائی تھی جو رفیق صاحب نے ہمیں عملاً دی تھی۔

بریگیڈئر (ریٹائرڈ) اے۔ کیو۔ شیر، ہلال جرات

راشد: قیوم شیر صاحب بریگیڈئر رفیق سے آپ کا تعارف کب ہوا؟

قیوم شیر: ریف سے (میں رفیق کو ہمیشہ ریف کہا کرتا تھا) میری پہلی ملاقات جون ۱۹۴۸ء میں ہوئی جب انہوں نے مجھ سے ہی پی ایم اے کی میتھڈ ا افسری کا چارج لیا۔ یہ بڑی مختصر ملاقات تھی۔ مجھے اوڑی سیکٹر میں اپنی بٹالین میں جانا تھا۔ جلدی جلدی میں چارج دیا اور آگے روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ مختصر ملاقات بھی اس لحاظ سے اہم تھی کہ زندگی بھر کی دوستی اور اعتماد کی بنیاد بنی۔ اس پہلی ملاقات ہی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ایک روایتی جنٹلمین سے مل رہا ہوں پھر اس تعلق کو ریف نے نبھایا بھی۔

راشد: کیسے؟

قیوم شیر: وہ اس طرح کہ جاتے جاتے میں نے کہا تھا کہ میری فیملی کو ایبٹ آباد میں رہنا ہے ان کا خیال رکھنا۔ میرے جانے کے بعد ریف نے جتنا اور جو کچھ میرے بیوی بچوں کے لئے کیا وہ محض خیال رکھنے کی حد سے بہت زیادہ تھا۔ میرے بچے اپنے انکل ریف سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ وہ انکا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ریف اپنی فیملی کو اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے ایک بار میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے مجھ سے کہا شیر کیا کروں یہ ایک ضرورت اور مجبوری ہے۔ اپنے بڑے بھائی کے بال بچوں کی کفالت بھی میری ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ کینٹونمنٹ میں دو خاندانوں کو رکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اب دونوں گھرانے یکساں معیار زندگی کے ساتھ ایک جگہ رہتے ہیں۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میرے بھائی کے بال بچے کوئی فرق یا محرومی محسوس نہ کریں۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا جو ریف نے بظاہر آسانی سے کرلیا۔ لیکن اس کے کچھ نفسیاتی اثرات ضرور ہوئے۔

راشد: وہ کیا؟

قیوم شیر: ان میں بال بچوں کے لیے ایک طرح کی پیاس سی تھی۔ وہ میرے بچوں سے جس طرح کھیلتے

تھے اس سے مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ اس شخص میں بچوں کے لئے کتنی محبت ہے کیونکہ کشمیر آپریشن کے بعد بھی میری فیملی ایبٹ آباد میں رہتی تھی۔ میں بھی آتا جاتا تھا اس لئے ریف سے اکثر ملنا ہوتا تھا۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں میرا ۱۰۱ بریگیڈ اٹک کے علاقے میں تربیت پر تھا کہ ریف مجھ سے بریگیڈ میجری کا چارج لینے آئے۔ دو برس پہلے انہوں نے مجھ سے میتھڈ افسری کا چارج لیا تھا۔ اس ملاقات میں ریف کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آیا۔

راشد: وہ کیا؟

قیوم شیر ; وہ یہ کہ جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ جب وہ بریگیڈ ہیڈ کواٹر میں مجھ سے چارج لینے آئے تو سخت سردی تھی اور ہم اٹک کے پل سے نیچے کی طرف کیمپ کئے ہوئے تھے۔ وہ چند دن جو میں نے اپنی بٹالین کی کمان سنبھالے جانے سے پہلے ان کے ساتھ گزارے میں نے نوٹ کیا کہ اس شدید سردی میں بھی صبح شام ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کی عادت کو انہوں نے بڑے نارمل طریقے سے جاری رکھا۔ اب تک ہم نے ایک ساتھ سروس نہیں کیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ صورت بھی پیدا ہوئی۔

راشد: وہ کیسے؟

قیوم شیر: وہ اس طرح کہ جب میں ۱۹۵۴ء کوئٹہ جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ اسکول کی کمان کر رہا تھا تو ریف میرے چیف انسٹرکٹر پوسٹ ہو کر آئے۔ ریف ایجوکیشن کے رموز کو خوب سمجھتے تھے۔ میں ایجوکیشن سے کچھ مس رکھتا ہوں ہم دونوں نے مل کر کوشش کی بظاہر اس فوجی ادارہ کو ایک تعلیمی ادارہ کے طور پر پبلک اسکول کے طرز پر چلائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایسا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور اس کامیابی میں ریف کے تعاون کو بڑا دخل تھا۔ اسی زمانے میں یہ تجویز بھی کافی زیر غور رہی کہ اسکول کو بند کر کے اسے او ٹی ایس کے خطوط پر کوھاٹ میں کھولا جائے لیکن اسکول کی کارکردگی اس معیار کی ہو گئی تھی کہ بالآخر یہ تجویز مسترد کر دی گئی اور اسکول اپنے معمول کے مطابق ۱۹۵۶ء تک کام کرتا رہا۔

راشد: ابھی آپ نے فرمایا کہ آپ نے جے ایس پی سی ٹی ایس کو پبلک اسکول خطوط پر کیڈٹ کالج کی طرح چلانے کی کوشش کی اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

قیوم شیر: ٹریننگ تو اپنی جگہ تھی میں فضا کی بات کر رہا ہوں۔ ہم نے پرسنلٹی کو تربیت کا مرکز بنایا اور کوشش کی کہ کیڈٹس ٹریننگ اسکولوں کے روایتی کھچاؤ اور دباؤ سے آزاد رہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے بیرونی سرگرمیوں کو کافی وقت دیا۔ کوہ پیمائی، ہائکنگ وغیرہ کو اہمیت دی۔ ان سرگرمیوں میں رسمی ضبط و نظم کی جگہ غیر رسمی رکھ رکھاؤ لے لیتا تھا۔ ان سرگرمیوں میں ریف سب سے آگے ہوتے تھے اور مجھے یاد ہے کہ وہ جب اپنی گھمبیر آواز میں ملائی سانگ سناتے تھے تو پہاڑوں میں اس کی گونج ایک عجب سماں پیدا کرتی تھی اور جب دوسرے کیڈٹس بھی ان کی آواز سے آواز ملاتے تو اور بھی لطف آتا۔

راشد: بریگیڈئر رفیق کے کردار کی کن صفات نے آپ کو متاثر کیا؟

قیوم شیر: ریف کی ایک خاص انا تھی، ایک معیار تھا۔ جو کہتا وہ کرتا جو وہ محسوس کرتا یا سمجھتا کہ یہ صحیح ہے خواہ وہ کتنا غیر مقبول یا غیر روایتی کیوں نہ ہو وہ کہہ گزرتا خواہ کسی سینئر کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ نوکری میں اس طرح کی بے باکی اکثر مہنگی بھی پڑتی ہے لیکن ریف نے نوکری کا رویہ کبھی نہیں رکھا۔ لیکن دوست بہت اچھا تھا، بہت ہی اچھا، آپ اس پر اعتماد کر سکتے تھے ہر طرح کے حالات میں۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ پرجوش آدمی تھا اسکی شخصیت میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ فوج کے پیشہ میں میں نے بڑے بڑے باکمال دیکھے ہیں وہ بھی کسی سے کم نہیں تھا لیکن میرے ریف کا حسن اسکے انسانی تعلقات کے پہلو میں تھا۔ ایک بہت پیارا دوست نہ رہا حق مغفرت کرے۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد شعیب اخوندزادہ ایف ایف آر

راشد: میں بریگیڈئر مناظر حسین سنٹر کمانڈانٹ پنجاب رجمنٹ کا ممنون ہوں کہ ان کے توسط سے آپ سے ملاقات ممکن ہو سکی اور آپ کا شکریہ تو بہر حال واجب ہے کہ آپ اس انٹرویو کے لئے آمادہ ہوئے

حالانکہ میرا آپ کا براہ راست تعارف نہیں تھا۔

کرنل شعیب: رفیق صاحب کو میں ایک عظیم آدمی سمجھتا ہوں۔ بحیثیت ایک معلم کے وہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان میدانوں میں کام کرنے والوں کے لئے انکی زندگی ایک روشن مثال رہے گی۔

راشد: آپ ان کو کب سے اور کیسے جانتے ہیں؟

کرنل شعیب: میرا ان سے پہلا تعارف جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ میں ہوا۔ یہ اوائل ۱۹۵۴ء کی بات ہے میں وہاں ایک کیڈٹ تھا اور وہ میجر کے رینک میں چیف انسٹرکٹر تھے۔ میری عمر اس وقت کم وبیش اٹھارہ سال کی تھی۔ پروفیسر صاحب آپ جانتے ہیں کہ عنفوان شباب کی اس منزل میں زندگی کی گہرائیوں میں اور اردگرد کی شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کا ہوش نہیں ہوتا لیکن چیف انسٹرکٹر میجر رفیق کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر تھا کہ مجھ جیسا لاپرواہ نوجوان بھی ان سے گہرا اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا اور وہ نقش آج بھی تازہ ہے۔

راشد: اس تاثر کی نوعیت کیا تھی؟

کرنل شعیب: ان کی فادر امیج تھی، لوگ ڈرتے بھی تھے اور محبت بھی کرتے تھے۔ وہ میری طرح بہتوں کے آئیڈیل تھے۔

راشد: آخر ڈر کی کیا وجہ تھی؟

کرنل شعیب: ان کی نظریں بہت تیز تھیں ہر قسم کی کوتاہی کو فوراً پکڑ لیتے تھے اور جو جھوٹ بولے یا دھوکہ دے اس کو چھوڑتے نہیں تھے۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی۔

راشد: اس کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہے۔

کرنل شعیب: ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ پی ٹی کے پیریڈ میں انہوں نے نوٹ کیا کہ ایک کیڈٹ نے

انڈر ویئر نہیں پہنا۔ اتنا غصہ آیا کہ بجائے اس ایک کو براہ راست ڈانٹنے کے انہوں نے فوراً پورے کورس کو پی ٹی اسکوائر میں فالن کروالیا اور کہا آپ لوگوں میں سے جس جس نے انڈر ویئر نہیں پہنا ہوا ہاتھ کھڑا کرے۔ اب ہوا یہ کہ اس ایک لڑکے کے علاوہ صرف دو ایک ہاتھ ہی اوپر اٹھے (انکا اندازہ یہ تھا اور غلط نہیں تھا کہ دو چار اور بھی ہوں گے)۔ یہ دیکھ کر وہ اور جلال میں آگئے اور حکم دیا ان تین کے سوا جنہوں نے ہاتھ اٹھایا تھا باقی دو قدم آگے آجائیں چنانچہ وہ آگے آگئے اب دوسرا حکم یہ تھا کہ اپنی اپنی نیکریں اتار دیجئے۔

راشد: پھر؟

کرنل شعیب: پھر جو نظارہ نظر آیا ہوگا وہ آپ تصور کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جن لڑکوں نے چیٹ کیا تھا انہیں جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ اسکول سے فارغ کر دیا گیا۔

راشد: فارغ کر دیا گیا؟

کرنل شعیب: جی ہاں فوراً فارغ کر دیا گیا۔ وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح کوئی کیڈٹ بزدلی دکھائے اور وہ اسے نظر انداز کر دیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایک اور قصہ سنئے۔ جس میں ان کا امتحان تھا۔

راشد: اچھا وہ کیا معاملہ تھا؟

کرنل شعیب: ایک اور لڑکا تھا اس کا شمار اس کورس کے ذہین ترین اور اسمارٹ ترین کیڈٹس میں ہوتا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ایک بہت اونچے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اسکے خاندانی اسٹیٹس کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ اس کا باپ اس وقت کی مرکزی حکومت کا ایک وزیر تھا۔ لیکن جب اس نے باکسنگ رنگ میں واضح طور پر بزدلی کا مظاہرہ کیا تو اس کا انجام بھی وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر کسی عام سے لوئر مڈل کلاس کے کیڈٹ کا ہو سکتا تھا۔

راشد: یعنی؟

کرنل شعیب: یعنی کہ انہوں نے اسے جے ایس پی سی ٹی ایس سے خارج کروادیا۔ اس طرح کے ممتاز اور ایک صاحب اقتدار باپ کے بیٹے کو اس طرح دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکنے کا جو ردِ عمل ہوا ہوگا وہ تصور کرنا مشکل نہیں لیکن ان کا احساس انصاف اتنا مضبوط اور ملک سے وفاداری کا شعور اتنا صاف تھا کہ ایسے معاملات میں فیصلہ کرتے انہوں نے کبھی دیر نہیں لگائی اور فیصلہ کرنے کے بعد پچھتائے یا لڑکھڑائے نہیں۔

راشد: جرأت کی بات ہے۔

کرنل شعیب: جرأت بھی قوت ایمان ویقین سے آتی ہے، یہی بنیادی چیز ہے، یہی چیز ان کو عظیم بناتی ہے۔ لیکن یہ قہاری ان کی شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا انکی شفقت اور دردمندی بھی بے حد وحساب تھی۔ جرأت اور حوصلے کی قدر بھی بہت کرتے تھے۔

راشد: اس کی کوئی مثال؟

کرنل شعیب: اس کا خود مجھے تجربہ ہوا۔ انٹر پلاٹون باکسنگ تھی۔ میرا مقابل سخت تھا لیکن میں بھی ڈٹا رہا۔ نتیجتاً لہولہان ہوگیا۔ اتنا کہ سی ایم ایچ کوئٹہ میں داخل کر دیا گیا۔ رفیق صاحب نہ صرف ہر روز مجھے دیکھنے سی ایم ایچ آتے تھے بلکہ انہوں نے مجھے بہت اہم فائنل امتحان سے بھی مستثنیٰ کر دیا۔ یہ جرأت اور حوصلہ مندی کا لحاظ تھا۔

راشد: بہت خوب۔

کرنل شعیب: ہاں لیکن آگے بھی تو سنئے۔ ہسپتال سے خارج ہونے کے تیسرے دن تین دن کی آؤٹ ڈور ایکسرسائز ہو رہی تھی۔ دوسرے کیڈٹس کے ساتھ مجھے بھی جانا پڑا۔ ایکسرسائز جسمانی مشقت کے لحاظ سے بہت سخت ہوتی ہے۔ میری بدقسمتی کہ چیف انسٹرکٹر میجر رفیق کی نظر میں میں تیسرے دن

آیا۔شعیب تم یہاں کہاں ؟ سر، ایکسر سائز کے لئے آیا ہوں ۔ اچھا کہا اور میرے پلاٹون کمانڈر کو وہیں میرے سامنے وہ جھاڑ پلائی کہ حد نہیں کہ شعیب کو اس ایکسر سائز میں شامل کیوں کیا گیا اور اسی وقت مجھے اپنی جیپ میں بیس کیمپ میں بھجوایا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۴ء کا ہے۔

راشد: شعیب صاحب آپ کی نظر میں ان کے کردار کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت کونسی تھی؟

کرنل شعیب: ان کے کردار میں فاروق اعظم کے کردار کی جھلک تھی ۔ جرأت، صلابت اور عدل گستری کے ساتھ شفقت اور مروت شیر وشکر تھی ۔ ان کی اصول پرستی اور بے داغ دیانت قائداعظم کی یاد دلاتی تھی ۔ وہ بعض انسانی کمزوریوں سے خالی نہیں تھے لیکن ایک غیر معمولی انسان ضرور تھے ۔ میں تو انہیں اپنا مرشد سمجھتا ہوں ۔

راشد: تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

کرنل شعیب: میں تو انہیں اب بھی ولی ہی سمجھتا ہوں اس دور کا۔کاش ہمیں رفیق ملتے رہیں۔

راشد: یہ کتاب اسی لئے لکھی جا رہی ہے۔

ملٹری کالج جہلم کی سربراہی کی داستان
رفقاء کار کی زبانی
مسٹر فضل حق حیدری کا انٹرویو

راشد: حیدری صاحب جب بریگیڈئر رفیق کا نام آتا ہے تو آپ کے ذہن میں کون سی پہلی امیج ابھرتی ہے۔

مسٹر حیدری: ان کے پہلے ایڈریس کی ۔ جب ۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو پرانے کالج ہال میں وہ افتتاحی خطاب کے لئے کھڑے ہوئے تو مجھ سمیت سارا اسٹاف بلکہ سارا کالج ہمہ تن سوال تھا لیکن جب جنٹلمین کے بعد

وہ شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کی بارعب پاٹ دار آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور صحیح اور بلیغ انگریزی کا دریا چڑھنا شروع ہوا تو چند لمحوں کے بعد ہم لوگ سحر زدہ ہو چکے تھے اور جب قریب دو گھنٹے کے بعد انکی تقریر ختم ہوئی تو کالج میں ایک نئی سحر طلوع ہو چکی تھی، ایک نئے عہد کا آغاز ہو چکا تھا اور ہم لوگوں کی وہ حالت تھی جو کبھی قدیم یونانیوں کی اوریکل کو سننے کے بعد ہوتی ہوگی۔

راشد: اس خطاب کا کوئی اہم نکتہ؟

مسٹر حیدری: اپنی تقریر کے شروع ہی میں انہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بہت زور دے کر کہا تھا کوئی لیڈر پیدا نہیں ہوتا، ہر ایک بڑا آدمی اپنے آپ کو بناتا ہے۔ مسلسل جدوجہد، انتھک محنت، ناقابل شکست عزم اور اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کا عزم، یہ صفات چاہیئں۔ یہ الفاظ اس یقین اور اس قوت کے ساتھ ادا کئے گئے تھے کہ اسٹاف تو کیا کوئی سست ترین لڑکا بھی ایسا نہ تھا جو اس آواز سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جب وہ تقریر کرنے اٹھے تھے تو بہت سے سوال، بہت سے اندیشے ذہنوں میں تھے لیکن جب وہ تھینک یو جنٹلمین کہہ کر بیٹھے ہیں تو ہر اندیشہ دور ہو چکا تھا، ہر سوال کا جواب مل چکا تھا اور ہر فرد ایک نئے اعتماد کے احساس سے سرشار تھا۔ اپنے اوپر اعتماد، اپنی مادر درس گاہ پر فخر، مادر وطن پر فخر اور اس شخص پر بھی اعتماد جو ان کی قیادت کی ذمہ داری اٹھانے والا تھا۔ ملٹری کالج کے لئے اس خطاب کی ایک تاریخی اہمیت ہے چونکہ یہ طلبہ میں ایک نیا نقطہ نظر، قدروں کا نیا احساس، ذمہ داری اور فرض کی اہمیت کا ایک بلند تر احساس، سزا کے خوف کے روایتی تصور پر نہیں بلکہ عزت نفس اور خودی کے تصور پر مبنی لے کر آیا۔ انکے اس اعلان پر کہ آج سے سزا ختم سب کو حیرت ہوئی کہ کیا عملی طور پر اس کا اطلاق ممکن ہے؟ کیا یہ آئیڈیل ازم یہاں چل سکتا ہے؟ ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال تھے۔ چند مہینوں میں کالج کی دنیا بدل گئی۔ اس نشاۃ ثانیہ کی ابتداء نئے خیالات، نئے تجربات سے ہوئی۔ نئے دور کا سب سے واضح مظہر آنر سسٹم تھا۔ اس سسٹم نے کیڈٹس کے اندر اپنی ذات کا، اپنی شخصیت کا، اپنے امکانات اور اس کے نتیجہ

میں ذمہ داریوں کا ایک نیا شعور پیدا کیا۔اس انقلابی تجربے نے کالج کو ایک نئی منزل سے آشنا کیا۔سب کی سوچوں کے رخ بدل گئے۔متحرک رویوں نے جنم لیا۔ذہن کو جلا دینے کی ایک نئی امنگ پیدا ہوئی۔

ان کی خطابت بے حد مؤثر تھی لیکن اس کی تاثیر ان کے حسن بیان سے زیادہ ان کے حسن نیت میں تھی۔ انہوں نے کسی ایسی چیز کی تلقین نہیں کی جس پر وہ خود عمل پیرا نہ ہوں۔ان کی حیثیت پارس کی سی تھی۔جوان کے قریب آتا تھا سونا بن جاتا تھا۔

کمانڈانٹ کی حیثیت سے ان کی عزت کی جاتی تھی استاد کی حیثیت سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔اور ایک رہنما فرشتہ کی حیثیت سے ان کی تقلید کی جاتی تھی لیکن سب سے بڑھ کر وہ باپ تھے، مربی اور محسن۔ اس ایک لفظ میں سب پہلو آجاتے ہیں۔ان کے فلسفہ تربیت کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ عملی تربیت دی جائے اور باشعور احساس ذمہ داری بیدار کیا جائے۔کوئی فنکشن ہو، کوئی موقع ہو، ان کی پہلی ترجیح طلبہ کی قیادتی تربیت ہوتی تھی۔ ورنہ بہت سے لوگ ایسے موقعوں کو دوسرے غلط یا ثانوی حیثیت کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔طلبہ کے مفاد اور قومی مفاد کو ملحوظ رکھنے ہی میں ان کی جیت تھی۔ یہ جو آج انہیں اتنی عزت سے یاد کیا جاتا ہے اس کا راز بھی یہی ہے کہ وہ کم از کم ان کمزوریوں سے بلند تھے جو عام ارباب اقتدار کے پاؤں کی زنجیریں بن جاتی ہیں۔

راشد: آپ کا اشارہ کن زنجیروں کی طرف ہے؟

مسٹر حیدری: ہمارے اچھے لوگ بھی خوف اور حرص کے دائرے میں بلکہ بھنور میں پھنسے رہتے ہیں۔اے سی آر کا خوف اور اپنی کور کے مفادات کی حرص۔

راشد: حیدری صاحب، آپ کو ان کے کردار کے کس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

مسٹر حیدری: کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک اسٹاف کانفرنس میں ایک صاحب نے ان کے پیشرو کے بارے میں ایک ایسا فقرہ کہا جس سے ان کی تنقیص و

تنقید کا پہلو نکلتا تھا۔ یہ سننا تھا کہ رفیق صاحب فوراً جلال میں آ گئے اور کہا میں اپنے پیشرو کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔ انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے ان حالات میں کالج کے لئے کام کیا۔ آپ اپنا کام کیجئے اور تنقید و تنقیص کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔

راشد: پھر ان صاحب کا ردِ عمل کیا تھا؟

مسٹر حیدری: وہ غریب تو اتنے شرمندہ ہوئے کہ حد نہیں۔

راشد: بات ہی ایسی تھی۔

مسٹر حیدری: اگر دیکھا جائے تو ان غریب کا بھی کچھ ایسا قصور نہ تھا، زمانے کی ریت ہی ایسی ہے کہ بیشتر مقتدر حضرات اپنے پیشروؤں پر تنقید سننا پسند کرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سماجی گروپ میں کچھ درباری تو ضرور ہوتے ہیں۔ وہ اشارہ پا کر سیاہ کو بلکہ سفید کو بھی سیاہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ میں ایک عام بات کہہ رہا ہوں۔ رفیق صاحب کے میں بہت قریب رہا ہوں مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کسی پیشرو رفیق کار یا سینئر پر منفی تنقید کی ہو۔ انہیں اپنے اوپر اور اپنے کام پر اتنا اعتماد تھا کہ انہیں کسی پر پتھر پھینکنے یا کسی کو اس کے قد سے چھوٹا کر کے پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کاش ان کی خلوت و جلوت کی باتیں چپکے سے ٹیپ ہو سکتیں۔ ان کی بیشتر گفتگو تو کالج ہی کے بارے میں ہوتی تھی۔ کالج ان کے لئے ایک مقدس مشن، ایک پیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ کالج کے بعد دوسرا موضوع پاکستان ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مذہب بھی زیرِ بحث آتا تھا۔ یا پھر لائٹ گپ شپ۔ موسیقی کا بھی ذوق تھا۔ ان کے ہاں سی ایم ایچ جہلم کے کرنل رشید ساز و آہنگ کی محفلیں اکثر سجاتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن انہوں نے ذاتیات کو کبھی موضوع نہیں بنایا۔ یہ بھی ان کی بڑائی کا ایک پہلو تھا۔ ان کی اپنی سوچ تھی، اپنا نقطہ نظر تھا، اپنا طریق کار تھا۔ وہ خود (یس مین) بالکل نہیں تھے اور (یس مین) کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، جس سے اختلاف کرنا ہوتا، برملا کرتے۔ اسی طرح کسی کی اصلاح کرنی ہوتی تو اسے بلا کر دوٹوک بات کرتے۔

گھما پھرا کر اشارۃً وکنایۃً بات کرنا ان کا وطیرہ نہیں تھا۔

راشد: حیدری صاحب! ابھی آپ نے کہا کالج کے بعد ان کا موضوع پاکستان ہوتا تھا۔اس کی مثال۔

مسٹر حیدری: وہ کٹر پاکستانی تھے۔ وہ پاکستان کے خلاف مذاق میں بھی ایک لفظ نہیں سن سکتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں جہلم کلب میں اسٹیشن کمانڈر کی میم کو جھاڑ پلانے کا قصہ میں آپ کو کئی بار سنا چکا ہوں۔ان کے آنے سے پہلے یہ کالج ملک معظم حضور شاہ برطانیہ کا ضرورت سے زیادہ وفادار تھا (۱۹۵۱ء کے تربیت کے جوبلی نمبر میں جارج پنجم کی پورے صفحے کی جو تصویر چھپی تھی اسے یاد کیجئے)۔انہوں نے اس ادارہ کی روح کو پاکستانی بنایا۔

راشد: گویا مشرف بہ پاکستان کیا۔

مسٹر حیدری: وہ اس کالج کے ایک ماسٹر بلڈر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

مسٹر عبدالحمید قریشی

جب وہ یہاں کمانڈانٹ ہو کر آئے تو انہوں نے مجھے اپنے استاد کی حیثیت سے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دینا شروع کیا جو بعض اوقات میرے لئے بڑی پریشانی کا باعث بنتا تھا۔اس لئے ایک روز جب انہوں نے مجھے اپنے بنگلے پر دعوت دی تو میں نے اس مسئلے پر ان سے سیر حاصل گفتگو کی اور آخر کار میں نے ان سے یہ معاہدہ کیا کہ بنگلے کے اندر جو مرتبہ وہ مجھے دینا چاہیں دیں لیکن کالج میں ہمارا رشتہ کمانڈانٹ اور انسٹرکٹر کا ہوگا۔ میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ لوگوں کو یہ نہ بتائیں کہ انہوں نے کبھی مجھ سے پڑھا بھی ہے۔لیکن انہوں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اگرچہ خود میں نے کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن وہ اہم شخصیتوں کو بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ مسٹر عبدالحمید قریشی میرے کپور تھلے کے استاد ہیں۔ یہ عظیم انسان کسی کی عزت کرنے یا قدر کرنے سے خائف نہیں تھا۔کام سے انہیں عشق تھا۔ذمہ داری کا احساس جتنا اور جیسا ان کو تھا اس کی نظیر کم از کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ایک

بار میں کوئی ڈیڑھ بجے رات ان کے بنگلے کے لان سے ان سے رخصت ہوا اور مین گیٹ کے راستے سے سرائے میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ رات بھیگ چلی تھی، فضا میں ہلکی سی خنکی تھی اس لئے ذرا آہستہ قدم اٹھاتا چلا۔ جب میں خود محمود غزنوی ہاؤس کے پیچھے کی طرف پہنچا تو دیکھا کہ رفیق صاحب ہاؤس سے نکل رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ حالانکہ ان دنوں ان کے ایک پاؤں میں پلاسٹر بھی لگا ہوا تھا فٹ بال کھیلتے ہوئے پاؤں میں کوئی چوٹ آ جانے کی وجہ سے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ میرے اٹھتے ہی تیزی سے ہاؤس چیک کرنے روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر جگہ، ہر وقت ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان میں جسمانی توانائی غیر معمولی تھی۔ بہت کم وقت سو کر یا آرام کر کے وہ بہت زیادہ کام کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ، نپولین وغیرہ کے بارے میں پڑھا تھا کہ بہت کم سوتے تھے اور انتھک تھے۔ یہ صفت میں نے رفیق صاحب میں اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ میں اکثر ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا ہوں۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے کسی کی برائی کی ہو۔ حالانکہ ایسے لوگ تھے جو ان میں کیڑے نکالتے تھے۔ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے انہیں کسی نہ کسی موقعہ پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے سامنے بھی کسی کو کسی کی برائی کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بنیادی طور پر نڈر آدمی تھے اور بزدلی کے ہر مظاہرے سے انہیں نفرت تھی۔ ان کی آخری علالت کے دوران ایک آدھ بار ان کی عیادت کو گیا۔ اس وقت میں نے یہ بات نوٹ کی وہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بہت کم بات کرتے تھے۔ اکثر بیماروں کی عادت ہو جاتی ہے کہ وہ عیادت کرنے والے سے اپنی بیماری اور علاج کی تفصیلات بیان کرتے رہتے ہیں۔ رفیق صاحب نے شدید بیماری کی حالت میں بھی اپنے آپ کو یا اپنی بیماری کو موضوع گفتگو کبھی نہیں بنایا۔ اگر عیادت کے لئے آنے والا ملٹری کالج سے وابستہ رہا ہوتا تو اس سے بیشتر وقت کالج کی باتیں کرتے رہتے۔ ورنہ پاکستان اور عالم اسلام زیر بحث رہتا۔

مسٹر ایوب خان کی یادیں

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کی صبح نو بجے ان کا لیکچر تھا۔ ہر طرف ہلچل تھی کہ نئے کرنل کا پہلا ایڈریس ہے جانے کیا کہیں گے۔ اس وقت کیمسٹری ہال کالج ہال کا کام دیتا تھا، وہاں لیکچر تھا۔ پونے نو بجے کے قریب میں اسٹاف روم کے سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ سامنے ڈرائینگ ماسٹر قاضی عبدالحکیم صاحب صوفے پر دوہرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ ان پر دمے کا شدید دورہ پڑا ہے۔ بمشکل انہوں نے اتنا کہا کمانڈانٹ صاحب سے کہو میرا کوئی بندوبست کریں، مجھے میرے گھر کے قریب سی ایم ایچ بہاولپور داخل کروائیں۔ ان کو یہ بھی بتانا کہ اس وقت میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ قاضی صاحب کی حالت اتنی غیر تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ چونکہ وقت بہت کم تھا، میں سیدھا ہال گیا۔ وہاں سب لوگ بیٹھ چکے تھے۔ رفیق صاحب باہر گھڑی پر نظر رکھے کھڑے تھے۔ اسٹاف افسر بمعہ سی آئی دروازے پر تھے۔ میں نے جاتے ہی کہا۔ سر مجھے فوری طور پر آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ مجھے ایک طرف لے گئے تو میں نے مختصراً انہیں صورت حال سے آگاہ کی، اور قاضی صاحب کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''تھینک یو مسٹر ایوب۔ آپ بیٹھئے''۔ میرے اندر کی طرف رخ کرتے ہی انہوں نے اسٹاف افسروں کو اشارہ کیا۔ اس عرصے میں وقت ہو چکا تھا۔ زیادہ انہوں نے ایک منٹ اور لیا ہوگا۔ (غالباً تمام زندگی میں یہ پہلا ایک منٹ ہوگا جب وہ لیٹ ہوئے ہونگے) اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ اور اپنی مشہور تین گھنٹے کی تقریر کی جو کالج میں ایک نئے تاریخی دور کا نقطہ آغاز تھی۔ میں تقریر بھی سن رہا تھا اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ یہ تو تقریر میں محو ہیں غریب قاضی صاحب کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے تقریر کے اختتام پر تقریباً سوا بارہ بجے ایس ایم نے بتایا کہ قاضی صاحب کو جیپ پر بٹھا کر ایک آدمی کے ساتھ سی ایم ایچ بہاولپور روانہ کیا جا چکا ہے۔ جب تین چار ماہ کے بعد قاضی صاحب صحت یاب ہو کر لوٹے تو اب مسئلہ انکی طویل چھٹی اور تنخواہ کا تھا۔ اب وہ اس مسئلے

سے پریشان تھے اور خاصے پریشان تھے۔ رفیق صاحب نے کہا قاضی صاحب یہ آپ کا دردسر نہیں۔آپ بچوں کے کورس پر توجہ دیجئے اور کمی پوری کرادیجئے۔ یہ مسئلہ مجھ پر چھوڑ دیجئے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ یہ انکی خوئے دلنوازی تھی۔کام کی قدر بھی کرتے تھےاور انسان کی بھی۔

۱۹۵۶ء کے اواخر میں جب سویلین انسٹرکٹرز کو بھی کمیشن کرنے کی کاروائی شروع ہوئی تو انہوں نے انتہائی کوشش وکاوش سے اے جی جنرل امراؤ کو قائل کیا کہ سب کو ان کی سینارٹی سے کمیشن کیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے جنرل امراؤ یکایک مشرقی پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے ان کی اسکیم پر جزوی طور پر عمل ہوسکا۔ کچھ کمیشن ہوگئے اور کچھ رہ گئے۔ جو رہ گئے تھے ان کے بارے میں جی ایچ کیو کی تجویز تھی کہ انہیں فوری طور پر کالج سے فارغ کردیا جائے۔اس کے لئے احکامات بھی جاری ہونے لگے تھے کہ پھر رفیق صاحب آڑے آئے اور انہوں نے ان احکامات کو منسوخ کروایا۔ نہ صرف منسوخ کروایا بلکہ انتہائی تگ ودو کرکے سویلین اساتذہ کو مستقل بھی کروایا۔اور جب یہ سب کچھ ہوگیا تو نہایت خاموشی سے ہمیں بتایا کہ آپ لوگ مستقل کردیئے گئے ہیں۔ میں چونکہ ان دنوں چھٹی پر ہنگو میں تھا اس لئے انہوں نے مجھے وہاں اطلاع دی۔اس طرح کہ جیسے یہ کام ازخود ہوگیا ہے۔اس کا ذرا کریڈٹ نہیں لیا۔ وہ اتنے بڑے تھے کہ انہیں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

اب میں دوچار باتیں ان کے انتظامی رویوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔ٹرن آؤٹ کو وہ جتنی اہمیت دیتے تھے وہ سب کو معلوم ہے اس لئے کپڑوں کو اکثر چیک کرتے۔ جب لڑکوں نے باربار بتایا کہ سر، دھوبی بنڈل نہیں لایا تو انہوں نے ادھر بھی توجہ دی۔ دھوبیوں کے کپڑے لانے لے جانے کا پروگرام بنایا۔ متعلقہ افراد کو اس کی تعمیل کی ہدایت کی اور اس پروگرام کی ایک کاپی جیب میں رکھ لی۔ایک دن ہمارے ہاؤس کے کچھ لڑکوں کو انہوں نے چیک کیا۔ان کا جواب وہی کہ دھوبی کپڑے نہیں لایا۔ وہ ہاؤس میں آئے اور ہاؤس ماسٹر مسٹر مظہر صاحب سے پوچھا۔انہوں نے تصدیق کی کپڑے واقعی دودن

لیٹ ہیں حالانکہ انہوں نے دھوبی سے رابطہ قائم کیا ہے اور اے او لیفٹیننٹ شعیب کو بھی اطلاع دی ہے۔ رفیق صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور چلے گئے لیکن وہ کہیں اور نہیں گئے۔ سیدھے دھوبی گھاٹ پہنچے۔ وہیں اے او کو بھی بلا لیا اور جیب سے پروگرام نکالا۔ پھر جو ڈرامہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ وہ لوگ کرسکتے ہیں جو ان کے باز پرس کرنے کے طریقے سے واقف ہیں۔ دوسرے روز اے او لیفٹیننٹ شعیب نے مظہر صاحب سے بڑا گلہ کیا۔ اس گلہ سے ہمیں کچھ اندازہ ہوا کہ ان کی کتنی کھچائی ہوئی ہوگی۔ ان کی انتظامی صلاحیت بے پناہ تھی، کہا کرتے تھے حکم دے دینا، آرڈر نکال دینا آسان ہے اصل مرحلہ اور اصل کام ان کی تکمیل و تعمیل ہے اور یہ فن ان کو آتا تھا اور بہت اچھی طرح آتا تھا۔

سخت لیکن ضروری اقدام کے لئے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم تھی۔ دوسرے دور میں جب وہ آئے تھے تو کالج کی ڈسپلنی حالت تکلیف دہ اور خطرناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ اس صورت حال کے پس منظر میں انہوں نے تمام اساتذہ کے تعاون سے ہر لڑکے کی کارکردگی، صلاحیت او رکردار کا جائزہ لیا اور اتفاق رائے اس امر پر ہوا کہ ستر پچھتر لڑکوں کو کالج سے فارغ کر دینا ہی ان کے اور کالج کے مفاد میں ہوگا۔ یہ رائے تو ہم سب کی تھی لیکن آخری فیصلہ تو ان ہی کو کرنا تھا جو انہوں نے بادل نخواستہ کیا۔ اور جب ایک بار فیصلہ کرلیا تو اس سے ہٹے نہیں۔ مجھ سے ایک بار انہوں نے کہا بھی مسٹر ایوب، اتنے بہت سے لڑکوں کو بیک وقت نکالنا میری زندگی کا کٹھن ترین فیصلہ تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس سے کتنے لڑکے اور کتنے خاندان متاثر ہونگے۔ لیکن مجھے اس کا بھی شعور تھا کہ اگر کالج کو پاک وصاف نہیں کیا گیا تو پھر اس سے دس گنا زیادہ پورے ایک ادارہ کا نقصان ہوگا۔ قومی مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ یہ سخت مگر ضروری قدم اٹھایا جائے۔

جہاں انہوں نے یہ تطہیر کی وہاں بے شمار تعمیری تدابیر بھی کیں۔ لڑکوں کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کو ہی بدرجہا بہتر نہیں بنایا، ان کے کھانے پینے کے معیار، کپڑے اور رہنے سہنے کی سہولتوں کو بھی بہتر بنایا۔

یہاں میں ایک مثال لڑکوں کی ''کٹ'' کی دیتا ہوں۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ان کے دوبارہ آنے سے پہلے ڈسپلن ہی کی نہیں۔ لڑکوں کی کٹ کی بھی بُری حالت تھی۔ ایک عرصے سے کنڈمنیشن بورڈ نہیں ہوا تھا۔ کپڑے، چادریں، غلاف بُو دینے لگے تھے۔ میں رابرٹس ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر تھا۔ میں نے ہاؤس آفیسر صاحب سے کہا کہ آپ کبھی کسی ڈارمیٹری کے اندر جا کر بھی دیکھیں کہ صفائی اور کٹ کی کیا حالت ہے۔ وہ کچھ زیادہ نازک مزاج اور نفیس طبع تھے۔ انہوں نے شان بے نیازی سے کہا! ایوب صاحب چھوڑیئے۔ میں ڈارمس کی بُو برداشت نہیں کر سکتا اور شائد اسی لئے انہوں نے کبھی ہاؤس کے صحن سے برآمدہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن جب رفیق صاحب آئے اور انہوں نے اپنی پالیسی تقریر میں ''کٹ'' اور اسکی فوری تبدیلی کا تذکرہ حتمی الفاظ میں کیا اور کہا ''ہاؤس آفیسرز اور ہاؤس ماسٹرز خود قابل تبدیل کپڑوں اور سامان کی فہرستیں تیار کریں۔ تو دوسرے دن ان صاحب نے خود مجھ سے کہا ایوب صاحب آپ بھی سہ پہر کو آ جایئے گا۔ آج (کٹ) کا حساب کتاب کرنا ہے۔ میں دل ہی دل مسکرایا۔ رفیق صاحب نے ان حضرت کو کس مصیبت میں پھنسایا۔ جو ڈارم کی بُو برداشت نہیں کر سکتے تھے، وہ میلے پھٹے پرانے کپڑوں کی بو کیسے براداشت کریں گے۔ مختصر یہ کہ کٹ کنڈمنیشن پریڈ کا سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ تھوک کے بھاؤ کپڑے بدلے گئے۔ دوسرے روز نئے کپڑوں میں لڑکوں کی چھب اور اکڑ دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ گھنٹوں کی اس کارروائی میں وہ خود موجود رہے اور لڑکوں کے نئے کپڑے تک اپنے سامنے فٹ کرائے۔

اب وہ ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں جن کے بغیر ان کی شخصیت کی تصویر مکمل نہیں ہوگی۔ یہ قصہ این ڈی احمد صاحب کی الوداعی دعوت کا ہے۔ آفیسرز میس میں کھانے کے بعد محفل جمی ہوئی تھی۔ یاران محفل چہک رہے تھے۔ رات بھیگ رہی تھی اور میں بور ہو رہا تھا۔ جب نیند کا غلبہ زیادہ ہوا تو سر کو دو ایک جھٹکے لگے۔ اتفاق سے ٹھیک اس وقت رفیق صاحب کی مجھ پر نظر پڑی وہ سرور کے موڈ میں تھے۔ دیکھتے ہی

بھڑک اٹھے'' مسٹر ایوب اب تو محفل رنگ پر آ رہی ہے اور آپ کو نیند آ نے لگی ہے''۔ میں بیزار بیٹھا تھا، میرے منہ سے نکل گیا، مجھے محفل کے اس طرح رنگ پر آ نے سے دلچسپی نہیں اور نہ میں رات کو دیر تک جاگنے کا عادی ہوں۔ میرا اتنا کہنا تھا گویا رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ سب سناٹے میں آ گئے اور رفیق صاحب غصے سے اٹھ کر باہر جانے لگے۔ کچھ لوگوں نے ان کو منانے کی کوشش کی، کچھ نے میرے لتے لئے۔ ایک نیم لفیٹین صاحب کچھ زیادہ آ گے بڑھے اور انہوں نے فقرہ چست کیا۔ جو لوگ آ داب محفل نہیں جانتے انہیں یہاں ہونا ہی نہیں چاہیے۔ یہ بات انہوں نے اس وقت کہی جب رفیق صاحب دروازے سے نکل کر برآ مدہ میں قدم رکھ رہے تھے۔ لیکن اس برہمی کی حالت میں بھی انہوں نے یہ فقرہ سن لیا۔ ایک دم پلٹے اور ان صاحب سے سرزنش کے لہجے میں کہا۔ تمہیں اس معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ پھر خود ہی آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور کہا'' مسٹر ایوب ٹھیک ہی کہتے ہیں واقعی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''مسٹر ایوب آئی گو یوفل مارکس۔'' انکے اس رویے سے میرا حوصلہ بھی بڑھا میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ سر آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں صاف اور سچ کہو میں نے جو میرا احساس تھا صاف صاف بیان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اس کی قدر کرینگے۔ یہ سن کر وہ میرے پاس آئے مجھے گلے لگایا اور پھر حاضرین کی طرف رخ کر کے، حضرات، یہ بات یہاں ختم ہوتی ہے اور یہ فقرہ انہوں نے انتہائی نرمی اور مروت سے کہا۔ سب کو خوشگوار حیرت اور مسرت ہوئی ۔ یہ واقعہ ان کی جذباتیت اور ہوش مندی اور شائستگی و مروت کی ایک منہ بولتی مثال ہے۔ مولوی محمد حسن صاحب جو خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اکثر اس واقعہ کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ واقعہ ان کی پوری شخصیت کا غماز ہے۔ اس سے ان کی پوری شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت میں کرم نوازی کا عنصر دوسرے عناصر پر غالب تھا۔ اس کو بھی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

رفیق صاحب اپنی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈائری رکھتے تھے۔ اس میں ہر کام نوٹ کرتے رہتے تھے اور

جب تک وہ کام ہو نہ جائے اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔۱۹۵۲ء کے اواخر میں میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے کالونی کے نئے کوارٹرز میں منتقل ہونے کی اجازت دی جائے انہوں نے کہا۔ایوب صاحب آپکو معلوم ہے کہ ابھی تک کالونی کے کوارٹرز پورے طور پر مکمل نہیں ہوئے کچھ کام باقی ہے۔اگر آپ اسی حالت میں وہاں جانا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے جواب دیا جی ہاں اس حالت میں بھی مجھے وہاں جانا منظور ہے۔ چنانچہ میں وہاں منتقل ہوگیا اس وقت تک وہاں بجلی تک نہیں آئی تھی صرف پانی کا نلکا تھا۔دوتین دن بعد کرنل صاحب شام کو میرے کوارٹر پر آئے۔اور پوچھا آپ یہاں کیسا محسوس کررہے ہیں۔ میں نے کہا سر، فلاں فلاں چیز کی کمی ہے۔فلاں کام مکمل ہونا باقی ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ تکلیف ہے۔اگر رفیق صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آپ کوتو معلوم تھا کہ کام ابھی نہیں ہوا۔ یہ جانتے ہوئے بھی آپ اپنی خوشی سے یہاں آئے ہیں اب شکایت کس بات کی، انتظار کیجئے۔لیکن رفیق صاحب تو رفیق صاحب تھے۔انہوں نے اپنی چھوٹی سی ڈائری نکالی اور جو کام ہونا باقی تھا اور جو چیزیں لگنا باقی تھیں ان سب کو نوٹ کرلیا دوسرے دن انہوں نے اے او کو وہ کام نوٹ کروایا اور خود بھی ایم ای ایس کے افسروں سے بات کی۔اب ایم ای ایس کا اپنا ایک طریقہ اور کام کرنے کی رفتار ہوتی ہے۔ظاہر ہے یہ کام دو چار دن میں پورا ہونے والا نہیں تھا۔لیکن ہوا یہ کہ چند روز کے بعد سے اسٹاف روم میں چائے کی بریک میں وہ ہرروز مجھ سے پوچھتے مسٹر ایوب ! کچھ کام ہوا۔ میں کہتا۔نہیں سر۔ یہ سلسلہ ہفتہ بھر چلتا رہا۔بلگرامی صاحب قبلہ بڑے ظریف الطبع تھے انہیں مذاق سوجھا۔کہنے لگے ایوب صاحب اور رفیق صاحب کا معاشقہ ہوگیا ہے روز انہی کو پوچھتے ہیں۔ میں بھی دل میں شرمندہ تھا کہ نامکمل گھر میں بیکار شفٹ ہوا۔اب ان کو پریشان کررہا ہوں۔ یا اس سے بہتر تھا کہ میں انہیں بتاتا ہی نہیں۔مختصر یہ کہ جب تک انہوں نے میرے گھر کو ٹھیک نہیں کروالیا ایم ای ایس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

یہ تو ایک واقعہ ہے۔ اسٹاف کے ہر رکن، بلکہ کالج کے ہر ملازم کا وہ اتنا ہی خیال کرتے تھے۔ اگر ان سب واقعات کو اکٹھا کیا جائے تو اپنی جگہ ایک کتاب بن سکتی ہے۔ اب آخر میں میں یہ بتاتا ہوں کہ بقول ان کے انہیں کالج کیوں چھوڑنا پڑا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ کالج میں دوسری بار پوسٹ ہوکر آنے لگے تھے تو انہوں نے جی ایچ کیو سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کالج کے معاملات میں بے جا مداخلت نہیں کرینگے۔ کچھ عرصہ تک وہ اس عہد پر قائم رہے پھر انہوں نے کالج کے معاملات میں خاص طور پر داخلوں کے مسئلہ میں دخل اندازی شروع کردی۔ یہ اختلاف زیادہ بڑھا تو ڈائریکٹر صاحب نے بات ڈی جی ایم ٹی جنرل حمید تک پہنچائی اور شکایت کی کہ یہ میرا حکم نظرانداز کر رہے ہیں۔ ڈی جی ایم ٹی نے انہیں بلا بھیجا۔ یہ گئے تو وہ بھرے بیٹھے تھے۔ چھوٹتے ہی کہا۔ آرمی میں ڈسپلن پہلی ضرورت ہے اور اس موضوع پر ایک لمبی تقریر جھاڑی۔ اس کے جواب میں انہوں نے اپنے دلائل پیش کئے اور فائل سے جی ایچ کیو کی یقین دہانی نکال کر دکھائی اور بتایا کہ اس طرح مداخلت سے نتائج پر کیا اثر پڑے گا۔ ڈی جی صاحب جلال میں آ گئے اور گرم ہوکر کہا کچھ بھی ہو آپ کو حکم ماننا ہے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو کرنل صاحب نے بالکل رسمی انداز سے دو قدم پیچھے ہٹ کر ٹھک سے جنرل صاحب کو سیلوٹ کیا۔ آل رائٹ سر! اور پھر کہا میں فوری طور پر اپنی پوسٹنگ چاہتا ہوں۔ اور انہیں پوسٹ آؤٹ کر دیا گیا۔

رفیق صاحب نے اپنے اوپر ملٹری کالج میں بہت Strain ڈالا۔ جب ۱۹۵۵ء میں آئے تو تاب وتوانائی سے بھرپور تھے۔ سارے بال سیاہ تھے۔ لیکن جب چار سال بعد ۱۹۵۹ء میں کالج سے روانہ ہوئے تو بالوں میں چاندی چمکنا شروع ہوگئی تھی اور ہلکی سی دمے کی شکایت بھی جسے ان سے بہت قریب رہنے والے ہی محسوس کر سکتے تھے۔ انہوں نے بہت exert کیا۔ بڑائی کی کچھ قیمت ہوتی ہے۔ لیکن ان کا ہر نقش قدم ایک چراغ بن گیا ہے۔ بات کو ختم کرنے سے پہلے ان کی دو ایک اور غیر معمولی خصوصیتوں کا ذکر کرنا چاہونگا۔ اول تو یہ کہ بہت کھلا ذہن تھا۔ ہر ایک کی سنتے تھے۔ رینک یا اقتدار کے

ساتھ لوگوں کا برخود غلط ہو جانا عام ہے لیکن وہ خود صاحب الرائے اور صاحب اختیار ہوتے ہوئے بھی دوسروں سے رائے اور تجویزیں مانگتے تھے اور اکثر ان کو قبول بھی کر لیتے تھے۔ یہ بھی کم ظرف کی بات نہیں۔ میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ ملٹری کالج کے لئے ان کی حیثیت ایک تحفہ خداوندی کی سی تھی۔ ورنہ یہ جگہ بہت سوکھ چکی تھی اور خزاں کی گرم ہواؤں کی زد میں تھی۔

بریگیڈئر (ریٹائرڈ) محمد شفیع (سابق ڈی اے ای) کا تجزیہ

۱۹۵۲-۵۳ء میں جب میں ملٹری کالج جہلم میں بطور اکیڈیمک انسٹرکٹر اور ہاؤس آفیسر متعین تھا تو مرحوم بریگیڈئر (اس وقت لیفٹیننٹ کرنل) محمد رفیق کی کمان میں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اپنے تقریباً تیس سالہ دور ملازمت میں مجھے کئی جگہ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو وقت میں نے مرحوم کی رہنمائی میں ملٹری کالج میں گزارا وہ غالباً سب سے زیادہ صبر آزما، مشقت طلب لیکن نتیجہ خیز تھا۔ ہر روز محسوس ہوتا تھا کہ ماحول میں ایک بین اصلاح کی صورت نمودار ہو رہی ہے۔ چنانچہ اپنے دیگر رفقاء کار کی طرح ایک احساس حصول مقصد تھا جو ہم سب کو کشاں کشاں رفیق صاحب کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

جونہی رفیق صاحب نے زمام کار سنبھالی اس کے بعد ہفتوں، مہینوں میں نہیں بلکہ دنوں کے اندر اندر ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کارکن کو بمعہ کیڈٹوں کے یہ محسوس ہوا کہ اب پچھلی سہل انگاری کے طریقوں سے کام نہیں چلے گا۔ اور فوری اور ٹھوس کاروائی ہی سے رفیق صاحب کی تشفی کی جا سکتی ہے۔

رفیق صاحب کی شخصیت میں ہیبت اور کشش پہلو بہ پہلو موجود تھیں۔ اچھا کام سرانجام دے کر ان کے سامنے سرخرو ہونے میں گہری خوشی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی کوتاہی پر ان کی سرزنش کا خوف بھی سر پر سوار رہتا تھا۔ انکی غیر معمولی طور پر مؤثر شخصیت کے اجزائے ترکیبی کیا تھے؟ اس موضوع پر اپنا تجزیہ پیش کرتا ہوں۔

تاب وتوانائی

میرا خیال ہے کہ ان کی پرکاری میں ان کی ظاہری صورت وہیبت کو بھی اتنا ہی دخل تھا جتنا کہ باطنی سیرت اور صاف ذہن کو۔ وہ ایک گٹھے ہوئے ورزشی جسم کے مالک تھے۔ رنگ گو قدرے سانولا مگر نکھرا ہوا تھا۔ چہرے کے نقوش ستے ہوئے آنکھیں بالخصوص بڑی چمکدار تھیں جن میں بڑی جاذبیت تھی۔ اکثر و بیشتر ان کے چہرے بشرے پر ایک خوش آمدیدانہ قسم کی مسکراہٹ غالب رہتی۔ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ جسم گوشت پوست کا نہیں بلکہ فولاد کا بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ان کی قوت کار اور قوت برداشت بھی غیر معمولی تھی۔ ان کا زیادہ وقت کالج میں گھومنے پھرنے میں گزرتا تھا۔ بہت تیز چلتے تھے لیکن چال میں ایک قسم کا وقار اور تمکنت تھی۔ دفتر میں بہت کم وقت گزارتے تھے۔ اس پھرتیلے پن کی وجہ سے ہر شخص اپنی جگہ چوکنا رہتا تھا کہ معلوم نہیں کس وقت آدھمکیں اور ٹرخانے والوں کی موقعہ پر گردن دبوچ لیں۔

کھلا ذہن

ان کی کامیابی کا دوسرا راز ان کا کھلا ذہن تھا۔ وہ ہر کس و ناکس کی اچھی تجویز کا خیر مقدم کرتے تھے اور اس پر اولین فرصت میں عمل کر کے اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں نے اپنے لمبے عرصہ ملازمت میں بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کے دل و دماغ کے دریچے تازہ جھونکوں کے لئے اس درجہ کھلے ہوں۔ انہوں نے کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ میں عقل کل ہوں حالانکہ یہ وہ کمزوری ہے جو عموماً ارباب اختیار و اقتدار میں عہدے اور منصب کی بلندی کے تناسب سے بڑھتی جاتی ہے اور آخر میں لے بیٹھتی ہے۔ رفیق صاحب اس کمزوری سے بدہی طور مبرا تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ٹیم ورک کے قائل تھے اور اپنے رفقاء کار کی موزوں تجویزوں اور مشوروں کو اپنے لائحہ عمل میں جذب کر کے وہ ٹیم سپرٹ بھی پیدا کر سکتے تھے۔ اپنے اسی رویے کی وجہ سے وہ اپنی ٹیم کے ہر فرد سے ان کی صلاحیتوں کی آخری حد تک کام لے سکے اور اپنے ماتحتوں کے تجربوں کے نچوڑ کو کام میں لا کر اصلاح احوال کی وہ کامیاب کوشش کی جو آمرانہ

بند ذہن کے رویے سے ممکن نہیں تھی۔ لیکن کھلے ذہن سے یہ مراد نہیں کہ وہ کوئی موم کی ناک تھے کہ دوسرں کی رائے اور مشوروں کے رحم وکرم پر ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے اپنے تصورات بہت واضح تھے اپنی ترجیحات کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور ان کی اپنی قوت تمیز بہت تیز اور قوت فیصلہ بہت مستحکم تھی۔ باتوں سے یا عالمانہ بحثوں سے انہیں چکر نہیں دیا جا سکتا تھا۔ انہیں اصول اور فرع کا فرق معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کہاں اڑنا ہے کہاں دبنا ہے، کس کی بات سننی اور کس کو لتاڑنا ہے۔ میں رفیق صاحب کا اسی لئے قائل ہوں کہ شریف النفس اور کریم النفس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سنگ خارا بھی تھے۔ مومن کی فراست بھی رکھتے تھے۔ پتے باز، چالاک، خودغرض انسان خواہ کسی بہروپ میں آئے وہ اسے فوراً پہچان لیتے تھے۔ میں نے ان سے جو بات سیکھی تھی وہ یہی تھی کہ ضروری نہیں کہ بھلا آدمی کمزور بھی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مضبوط آدمی آمرانہ رویہ بھی رکھتا ہو۔

انسان دوست رویہ

وہ بہت سخت گیر تھے۔ غلطی کی صورت میں ان کی گرفت سے بچنا تقریباً محال تھا۔ لیکن وہ مردم آزار ہرگز نہیں تھے۔ ان کی کامیابی کی تیسری وجہ انکی کمانڈ کی بابت انسان دوست رویہ تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں پر جہاں سختی کرتے وہاں ان کی حتی الامکان مدد کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ان کے پہلے دور کمان میں جس کی رفتار دوسرے دور میں زیادہ تیز تھی، انہوں نے سب سٹاف کو خصوصاً چار ہاؤس ماسٹروں کو (جو ہمہ وقتی انسٹرکٹرز کے فرائض بھی انجام دیتے تھے) اتنے گونا گوں کام سونپے کہ ان سے عہدہ برآ ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ تنگ آ کر ہم ہاؤس ماسٹروں نے ایک لمبا چوڑا چارٹ بنایا جس میں تمام قسم کی ڈیوٹیوں کی تفصیل اور ان کی کماحقہ ادائیگی کے لئے درکار وقت کا مفصل حساب لگایا جس سے معلوم ہوا کہ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں کے مقابلے میں بشمول کم از کم جسمانی حوائج کے ۲۶ گھنٹے درکار ہیں۔ ہم یہ عرض داشت لے کر جب رفیق صاحب کی خدمت میں وفد کی صورت میں حاضر ہوئے اور کہا

ہمارے حساب میں اگر مبالغے سے کام لیا گیا ہے تو وہ نکال دیں اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اب تو ہمارے پاس اپنی بیویوں سے بات کرنے کا وقت بھی نہیں رہ گیا ہے۔ تو خوب ہنسے اور فی الفور اوقات کار میں مناسب حد تک تخفیف کر دی۔ اس قسم کے کئی اور واقعات سے ان کے ہمدردانہ رویے کی عکاسی ہوتی ہے۔

نوکری برائے خدمت

ایک اور خاصیت جو ان کی قیادت کو دوسروں سے ممیّز کرتی ہے وہ نوکری برائے نوکری نہیں بلکہ نوکری برائے خدمت کا اصول تھا۔ مرحوم اس بات کا اپنے آپ کو سختی سے پابند سمجھتے تھے کہ حکام بالا کے ناجائز دباؤ کے نیچے آ کر وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے مستحق افراد کی حق تلفی ہوتی ہو۔ آخری بار جب گھوڑا گلی کالج میں جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد پرنسپل بنا دیئے گئے تھے میری ان سے ملاقات ہوئی تو مرحوم نے انکشاف کیا کہ ملٹری کالج میں میرٹ کی بنا پر داخلے کے اصول میں اوپر سے ناروا خلاف ورزی اور غیر مستحق لڑکوں کو ان پر ٹھونسنے کے خلاف احتجاج کے طور پر انھوں نے کمانڈ سے علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ بعد میں دباؤ ڈالنے والوں نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی ان سے کیا۔ میرے یہ تاثرات ان کے پہلے دور قیادت کے بارے میں ہیں جو ۵۳-۱۹۵۲ء میں تقریباً سال بھر جاری رہا اس سے دو سال بعد جب ایک برطانوی نژاد پرنسپل کے زیر سایہ ملٹری کالج کی کشتی بری طرح گرداب میں پھنسی تو اس سے نکالنے کے لئے ایک بار پھر رفیق صاحب جیسے تجربہ کار کھویے کا سہارا لینا پڑا۔

ان کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ قوت تحریر و تقریر دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنا مافی الضمیر مختصر اور واضح لفظوں میں بیان کرنے پر قادر تھے۔ سامع یا قاری کو کسی قسم کی غلط فہمی نہیں رہتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ مروت اور مخالفوں کے ساتھ فراخدلی سے پیش آتے تھے۔ انکا کشادہ سینہ کینہ اور گھٹیا جذبات سے پاک تھا۔ اکڑفوں والوں کی خوب خبر لیتے اور گرے ہوؤں پر شفقت

کرتے۔

بڑے مہمان نواز تھے۔ان کے دسترخوان پر ہر قسم کے لوگ نظر آتے۔

قومی خزانے کو امانت تصور کرتے اور کبھی اپنی ذات کے لئے اس سے فائدہ نہ اٹھاتے کاش کہ ان جیسی بے داغ اور بے باک ملازمت زیادہ لوگوں کے حصے میں آئے۔

بلگرامی صاحب کے تاثرات

بریگیڈئر رفیق مرحوم کی سیرت وکردار کو ہم قرآن حکیم ہی کے الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں۔

(اشداء علی الکفار رحماء بینھم)

یعنی کافروں کے لئے وہ پتھر کی چٹان۔آپس میں رحم دل، سراپا رحمت وشفقت۔کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے۔کسی کی کم کسی کی زیادہ۔مگر جو کسی قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا تھا وہ بریگیڈئر رفیق تھے۔نہ وہ جعفر ہوسکتے تھے نہ صادق۔ بلکہ اپنے دور کے ہر جعفر و صادق سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

ملٹری کالج میں دو بار بحیثیت کمانڈنگ آفیسر آئے۔دونوں دفعہ کالج کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کے لئے انتظامی قابلیت کے لحاظ سے ان کا جو درجہ تھا وہ اگر کسی سربراہ مملکت کو بھی نصیب ہوتا تو اس کے لئے باعث فخر ہوتا۔

میرا اور اقبال صاحب کا ان کے ہاں اچھا خاصا آنا جانا تھا۔لیکن میں نے انہیں کسی ملازم پر غصہ کرتے یا سختی سے پیش آتے نہیں دیکھا۔ایک دفعہ ایک ملازم نے ایک قیمتی سیٹ کا برتن اپنی لاپرواہی سے توڑ دیا۔ہم سمجھے اب اس کی خیر نہیں۔انہوں نے صرف اتنا کہا۔مسٹر۔یہ تم نے کیا کیا۔رفیق صاحب کے لائف سٹائل سے یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا تھا کہ اندر سے کتنے روایتی اور مشرقی ہیں۔اس امر کی وضاحت میں ایک واقعہ سے کرونگا ایک بار چوہان صاحب، اقبال صاحب اور میں نے یہ سازش کی کہ

کسی طرح گھیر گھار کے رفیق صاحب کو بھی برج کلب کا ممبر بنانا ہے۔ چنانچہ اقبال صاحب نے اپنے مخصوص سفارتی انداز میں اس بات کو چھیڑا۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ حسن طلب کا رخ کس طرف ہے۔ مسکرائے، میں برج میں آپ کا ساتھ ضرور دیتا لیکن جوانی کے زمانے سے میں نے ماں جی سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ کبھی جوا نہیں کھیلوں گا۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتا ہوں لیکن اگر آپ مجھے اپنے کلب کا خاموش ممبر بنا سکیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ چنانچہ انہیں کلب کی اعزازی رکنیت دے دی گئی۔ اگر کبھی ان کا کوئی برج باز دوست آجاتا تو ہم لوگ بلائے جاتے اور لمبی محفل ہوتی اور وہ روایتی میزبان کا کردار ادا کرتے۔

یہ آخری واقعہ جو میں لکھ رہا ہوں لاہور کا ہے ایک بار ان سے ملنے گیا تو ایک نیا انکشاف ہوا۔ وہ ایک باریش بزرگ سے جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے، گھنٹہ سوا گھنٹہ گفتگو کرتے رہے، صاف اور سلیس اردو میں لیکن اس تمام عرصے میں انہوں نے انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا حالانکہ سیاسی، اقتصادی بحث تھی اس میں انگریزی اصطلاحوں کا آجانا ناگزیر تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ رفیق صاحب کسی چیز میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے تھے۔ زبان میں بھی نہیں۔

میر کارواں کی یاد میں

پروفیسر عین الدین علوی کے تاثرات

ہندوستان اور پاکستان کے طول وعرض میں بہت سے اچھے انسانوں، غیر معمولی انسانوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ غیر ملکیوں کے جوہر قابل کو دیکھنے اور ان سے مستفید ہونے کے موقعے بھی ملتے رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے وہ افراد بہت کم نظر آئے جن کے لئے دل احترام سے جھک جاتا ہو، جن کے پاس بیٹھ کر روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہو، جنہیں "ارتقاء" کا نشان کہا جا سکے۔ بریگیڈئر رفیق انہیں چند غیر معمولی انسانوں میں سے ایک تھے۔ کسی شخص کی بڑائی ناپنے کا پیمانہ میرے خیال میں

یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے کتنا بے پرواہ اور کسی بڑے مقصد میں کتنا منہمک رہتا ہے۔ مرحوم اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ انہیں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ وہ قیادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

اگر ایک راہنما کی لازمی صفتیں یہ ہیں کہ وہ:

خیال کو جلد جلد عمل کا روپ دے سکتا ہو۔

دوسروں سے جو کام لینا چاہتا ہو اسے پہلے وہ خود کر کے دکھائے۔

اپنے ہر منصوبے کی عملی تفصیلات اوروں سے پہلے مرتب کر لیتا ہو۔

سختیوں اور صعوبتوں کا ایسی خوشی سے سامنا کرے جیسے یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو۔

تو بریگیڈئر رفیق یقیناً ایک راہنما تھے کیونکہ یہ تمام اوصاف ان کی ذات میں جمع تھے۔ جلال کے ساتھ جمال اور قہاری کے ساتھ دلبری کا جو مظاہرہ میں نے ان کی شخصیت میں دیکھا وہ کہیں اور بہت کم نظر آیا۔

مقصد کی لگن

پہلی ہی ملاقات میں یہ محسوس ہوا کہ وہ اس قسم کی شخصیت ہیں جو ایک دھن میں مگن رہتی ہے، ایک خیال میں سرشار۔ انکی یہ دھن، یہ جذبہ غالب ملٹری کالج کو مثالی بنانے کا تھا۔ وہ تعلیم اور اسکے مقاصد کا نہایت بلند تصور رکھتے تھے۔ وہ انسانیت کی بہترین قدروں کو یہاں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ یقیناً اس ادارے کے "معمار اعظم" تھے۔ تقسیم ہند کے بعد اس کالج کے سربراہوں میں ان کی شخصیت بہت بلند و بالا نظر آتی ہے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے اس کالج کو پبلک سکول کا روپ دینے کے لئے شب و روز محنت کی اور بڑی خوش اسلوبی سے یہ دشوار کام کر کے دکھا دیا۔ یہ کام ایک ایسا صاحب نظر ہی کر سکتا تھا جو فلسفہ تعلیم کی روح سے آشنا ہو اور عملی دشواریوں سے نمٹنا جانتا ہو۔ ہر دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ انہوں نے اپنی ذات کو کالج میں گم کر دیا تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ کالج نے سمٹ کر ان کا پیکر اختیار کر لیا تھا۔

تعلیم کا محرم اسرار

کسی قوم کو واقعی ایک قوم کے سانچے میں ڈھالنا تعلیم کا ہی کام ہوتا ہے۔ تعلیم کا مشن اتنا ہی وسیع ہے جتنی خود کائنات۔ اسے ایک طرف علم کے بے کراں سمندر کی غواصی بھی کرنی ہے تو دوسری طرف آدمیوں کو انسان بنانا ہے اور یہی تعلیم کا سب سے مشکل مرحلہ ہے جسے مغربی ممالک بھی اپنی ترقیوں کے باوجود سر نہیں کر سکے۔

ایک تعلیمی ادارے کا کام صرف طلبہ کے ذہنوں میں معلومات کا "خم" انڈیل دینا اور نئی باتوں کے انکشاف کی ترغیب دینا ہی نہیں، ملٹری کالج جیسا ادارہ تہذیب کا امین بھی ہوتا ہے۔ وہ صرف سوچنا اور کھوج لگانا ہی نہیں سکھاتا اس کا کام مستقبل کی تصویر بنانا اور مستقبل کی بنیادیں رکھنا بھی ہے۔ رفیق مرحوم تعلیمی ادارے کی اس تہہ بہ تہہ نوعیت سے بھی اچھی طرح آشنا تھے۔ اوپر میں نے کہا ہے کہ وہ ایک ہی دھن میں سرشار تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کا واحدانی ذہن کچھ محدود اور یک طرفہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن وہ اس خامی کا شکار نہیں ہوئے۔

ان کی شخصیت ہمہ گیر اور بسیار پہلو بھی تھی۔ بہترین انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ ان کی شخصیت میں ایک لوچ بھی تھا اور بہت سی انسانی خوبیاں بھی۔ ان میں ایک مقناطیسی کشش تھی کہ جہاں وہ ہوتے حاضرین کی توجہ انہیں کی طرف رہتی۔

شہرت سے بے پرواہ

ان کے سامنے ایک ایسا نصب العین تھا جو رفعت میں آسمان کو چھوتا تھا اور یہ تھا اچھے انسانوں کی تخلیق۔ یہ ان کا جنون بن گیا تھا۔ ان کے نزدیک کالج کی ٹیموں کا فتح مند ہونا، ٹرافیاں جیتنا، امتحانات میں امتیازی پوزیشنیں لینا، مختلف میدانوں میں شہرت حاصل کرنا (یعنی وہ تمام چیزیں جو آج کل کسی تعلیمی ادارے کی کامیابی کا ثبوت سمجھی جاتی ہیں) اتنی اہم نہیں تھیں جتنا طلبہ کا کردار اور ان کی شخصیت۔

اچھے خاصے بااصول انسان اور قد آور منتظمین کو ایک کمزوری میں اکثر مبتلا دیکھا گیا ہے۔ ان کے مقصد کتنے ہی تعمیری ہوں ان کی پرامید نگاہیں اخبار کے کالموں اور ریڈیو، ٹی وی کے پروگراموں کی طرف بھی لگی رہتی ہیں۔ اگر پبلیسٹی ہو جائے تو تسکین کا احساس ہوتا ہے اور اگر ذرائع ابلاغ خاموشی اختیار کر لیں تو ایک تشنگی رہ جاتی ہے بلکہ بعض حضرات کے یہاں تو کارکردگیوں کا پروگرام اور پبلیسٹی کا پروگرام متوازی چلتے ہیں۔ لیکن رفیق صاحب اس اعتبار سے بھی عظیم تھے۔ ان کے نزدیک اصل چیز تعلیمی و تربیتی جدوجہد تھی، شہرت اور نام و نمود کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

طلبہ میں جو صفتیں پیدا کرنے کے لئے وہ جنون کی حد تک کوشاں تھے وہ تھیں ہمیشہ سچ بولنا اور کسی سے خوف نہ کھانا۔ سچائی اور دلیری، انہی دو بنیادی صفتوں پر وہ سب سے زیادہ زور دیتے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں کردار کے ستون یہی ہیں۔ انہوں نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں یہ صفتیں پھل پھول سکیں۔ وہ جب اور جس کیڈٹ میں ان کا مظاہرہ دیکھتے اس کا اعتراف اور حوصلہ افزائی کرنا نہ بھولتے۔ ان کے برعکس خصائص یعنی جھوٹ اور بزدلی کو وہ کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتے تھے۔

اس زمانے میں باکسنگ ہر کیڈٹ کے لئے لازمی تھی ایک بار ایک کیڈٹ نے باکسنگ رنگ میں بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ حریف کے حملوں سے خوف زدہ ہو کر بار بار منہ چھپانا اور پیٹھ دکھانا اور میدان چھوڑ چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ پہلے تو انہوں نے اسکی سوئی ہوئی غیرت کو بیدار کرنے کی کوشش کی، دل بڑھایا لیکن جب اس کا رویہ کسی طرح نہ بدلا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کیڈٹ عزم اور کردار کی اس پختگی سے محروم ہے جو فوج کے افسر کے لئے لازمی ہے چنانچہ انہوں نے اسے گھر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

حسن عمل کے ساتھ حسن خیال

وہ بے حد عمل پسند اور متحرک انسان تھے۔ لیکن ان کی عملیت میں بھی خیال پرستی کی ایک جگمگاہٹ ہوتی تھی۔ ان کا ذہن ہر وقت نئے خیالوں، نئے اداروں اور منصوبوں سے لبریز رہتا تھا۔ لیکن وہ خیالوں کی

دنیا میں ہی کھوئے رہنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان خیالوں اور ارادوں کو عمل کا روپ دینے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ ہر نئے خیال کے اندر کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جسے عملی شکل دی جاسکتی ہے۔ وہ اسی پہلو کو مجسم کر کے دکھانے کے لئے بے تاب رہتے تھے اور ایسا کرنے کی ان میں زبردست صلاحیت تھی۔ مارکس نے کہیں کہا تھا کہ فلسفیوں نے دنیا کو سمجھنے کی کوشش تو بہت کر لی، اب انہیں دنیا کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بریگیڈئر رفیق بھی ایک ''جان بیتاب'' رکھتے تھے جو فرسودہ اور بے ہودہ چیزوں کو یکسر بدل دینا چاہتی تھی۔

دل کو گرمانے کا سلیقہ

لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جو لوگ بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ عموماً اپنے ماتحتوں میں اپنی جیسی لگن، تبدیلی کی آرزو اور ذوق شوق پیدا نہیں کر پاتے۔ مگر رفیق جیسا میر کارواں جس کی

''نگہ بلند، سخن دلنواز، جان پرسوز''

وہ دلوں کو گرمانا خوب جانتے تھے۔ ان کا ذاتی جوش و ولولہ اڑ کر لگنے والی چیز تھی۔ وہ ٹھنڈے پتھروں میں چنگاریاں پیدا کر دکھاتا تھا۔ ان کے اندر دوسروں میں لگن اور ذوق شوق بیدار کرنے والی جو صفات تھیں ان میں سے دو میرے خیال میں بہت اہم تھیں۔ ایک ان کا ہر منصوبے کے ساتھ پورا خلوص، دوسرے طلبہ و اساتذہ کی محنت اور کاوشوں کا بھرپور اعتراف اور داد و تحسین جس کے بعد ان کی ہمت دو چند ہو جاتی تھی۔ ان سے دو چار باتیں کر لینے کے بعد دشوار ترین کام بھی آسان نظر آنے لگتے تھے۔

جمہوری مزاج

ان کے کردار میں قابل رشک پختگی تھی اور یہی پختگی ان کے راستے میں مشکلات کی دیواریں بھی کھڑی کر دیتی تھی۔ ڈسپلن کا معاملہ ہو تو وہ سفارش یا دباؤ کے سامنے چٹان بن جاتے تھے۔ شائد اسی لئے بعض سطح بین نگاہوں کو ان کا انداز آمرانہ نظر آتا تھا۔ لیکن درحقیقت جمہوریت پسندی اور کشادہ ظرفی ان کا

مزاج تھی۔ وہ اچھے مشورے نہایت فراخ دلی سے قبول کر لیتے تھے، اظہار خیال کی پوری آزادی دیتے تھے، اساتذہ کو بھی اور طلبہ کو بھی۔ اس سلسلے میں وہ بعض دوسرے کمتر صلاحیتوں والے حضرات کی طرح کسی کمپلیکس کا شکار نہیں تھے۔ مہینے میں ایک بار (اور ضروری ہو تو اس سے بھی پہلے) اسٹاف کے ساتھ کانفرنس ان کا معمول تھا جس میں نئے منصوبوں کی ضروریات، پرانے منصوبوں پر عملی کام کا جائزہ، کیڈٹوں کی انفرادی کامیابیوں اور کوتاہیوں پر بے جھجک بحث و گفتگو ہوتی تھی۔ کانفرنس کے دوران اساتذہ کے پیش کردہ مفید مشورے نہایت مستعدی سے سنے اور منظور کئے جاتے تھے۔ ان پر جلد از جلد عمل شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح ان اساتذہ کو درسگاہ کے معاملات میں اپنی شرکت کا خوش آئند احساس پیدا ہوتا تھا اور درسگاہ سے ان کی وابستگی بڑھتی تھی۔

خوشی اور برہمی ذاتی نہیں اصولی تھی

وہ ذاتی اور نجی قسم کی ملاقاتوں میں تواضع اور مشرقی خوش خلقی اور میزبانی کا دلآویز نمونہ تھے۔ لیکن سرکاری اور منصبی امور میں ان کو کسی ایسی بات پر سمجھوتے کے لئے آمادہ کرنا بے حد مشکل ہوتا تھا جسے وہ نامناسب سمجھتے ہوں۔ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی پر چشم پوشی بھی ایک ایسی ہی چیز تھی۔

ایک ہاؤس ماسٹر نے اپنا تجربہ ہمیں سنایا کہ وہی کرنل رفیق جو دو گھڑی پہلے ان سے نہایت دوستانہ اور ملاطفت آمیز گفتگو کر رہے تھے، جب ایک بظاہر معمولی سی فروگزاشت پر دفتر میں بلا کر درشت لہجے میں باز پرس کرنے لگے تو وہ (ہاؤس ماسٹر) حیران رہ گئے اور انہیں شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ لہجے کی یہ غیر متوقع درشتی ذرا دیر پہلے کی دلآویزی کے مقابلے میں کچھ اور بھی زیادہ تلخ محسوس ہوئی۔ اس ذہنی چوٹ سے آفاقہ پانے میں انہیں خاصہ وقت لگا۔ لیکن ان کے اس طرز عمل کا سب سے خوبصورت پہلو یہ ہے کہ اس قسم کی سرزنش کے بعد ان کا رویہ دوبارہ اس طرح متوازن ہو جاتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کیوں کہ ایسی کسی برہمی کے پیچھے ذاتی کدورت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

ایک اور ہاؤس ماسٹر جنہوں نے محض برادرانہ ہمدردی کے جذبے کے تحت ایک رفیق کار کی تائید وحمایت ایک ایسے معاملے میں کی تھی جس پر کرنل صاحب اس پر برہم تھے، روایت کرتے ہیں کہ جب کرنل صاحب کو یہ پتہ چلا کہ میں اس معتوب افسر کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتا ہوں اور کرنل صاحب کے فیصلے کو غیر منصفانہ سمجھتا ہوں تو میں نے اندازہ لگایا کہ جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے، میرے بارے میں ان کا رویہ مخالفانہ اور انتقامی ہو جائے گا اور عنقریب مجھے بھی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ان نتائج کے لئے آمادہ کرلیا تھا۔لیکن جب اس معاملے پر ان کے ساتھ گفتگو ہوئی تو میں ان کے اعلیٰ ظرف اور ان کے بڑے دل کا قائل ہوگیا۔میرے ساتھ ان کے رویہ میں قدورت کا شائبہ بھی نہیں آیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سرے سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

ایک ماہر تعلیم

اگرچہ وہ معروف معنوں میں تعلیم کے آدمی نہیں تھے۔ان کا تعلق انفنٹری سے تھا۔مگر درحقیقت وہ تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے وہ پی ایم اے اور جے ایس پی سی ٹی ایس جیسے تربیتی اداروں سے وابستہ رہ چکے تھے۔ تعلیم کے اصول ونظریات اور نفسیات کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس شعبے میں ایسی بصیرت پیدا کرلی تھی جو محض تعلیم وتدریس کی ڈگریوں سے نہیں آتی۔

کالج کے مشن میں انقلابی تبدیلی

ایک بڑا آدمی جہاں بھی ہو سب سے پہلے وہاں کی فکری اساس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بریگیڈئر رفیق نے ملٹری کالج کی فکری بنیادوں میں ایک صحت مند تبدیلی پیدا کی۔ان سے پہلے کالج میں مرکزی حیثیت اور بنیادی اہمیت فوجی ڈسپلن کی تھی۔انہوں نے کالج کی تاریخ میں پہلی بار کیڈٹ کی شخصیت کو درس گاہ کا مرکز ومحور قرار دیا۔ان کے خیال میں کالج کی تمام سرگرمیوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ کیڈٹ کی پوشیدہ صلاحیتیں آشکار ہوں۔کالج کے مشن کے بارے میں نقطہ نظر ایک انقلاب سے کم نہیں تھا۔ان کے

زیادہ تر اقدامات اور منصوبے اسی نئے مقصد کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ وہ کیڈٹوں میں پیش قدمی اور خود فکری کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ موقع دیتے تھے۔ آنر سسٹم، ہاؤس کورٹس (طلبہ کی عدالتیں)، پریفیکٹوں کی عزت و احترام، ان سب اقدامات کا یہی مقصد تھا۔ وہ ڈسپلن کو محض حکم کے ذریعے نافذ کرنے کے قائل نہ تھے۔ وہ طلبہ کے دل میں ڈسپلن کی پابندی کا شوق و جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کے لئے انہوں نے وہی راہیں، وہی تدبیریں اختیار کیں تھیں جو ایک روشن دماغ ماہر تعلیم اختیار کر سکتا تھا۔

وہ عزت نفس کے احساس کو ایک بہت بڑی محرک طاقت مانتے تھے۔ اسی لئے وہ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے تھے کہ کیڈٹوں میں اپنی عزت کا احساس پوری طرح بیدار ہو جائے۔ آنر سسٹم کا نفاذ اسی کوشش کا ایک حصہ تھا۔ یہ اقدام بھی ابتدائی مرحلوں میں تھا اور کامیابی کی راہ پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ٹھوس نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ طلبہ ایسی حرکتوں سے احتراز کرنے لگے تھے جن سے ان کی عزت اور آن پر حرف آئے۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر پردہ ڈالنے کی بجائے جرأت کے ساتھ اس کا اعتراف کر لیتا تھا۔ طلبہ میں سچ بولنے کی جرأت، قانون کا احترام، بے خوفی اور دیانت داری جیسی صفات ابھرنے لگیں تھیں۔ لیکن اسی دوران ان کا تبادلہ ہو گیا اور پھر اس مفید تجربے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سخت کوشی کا فلسفہ

بڑا آدمی وہ ہے جس کی نگاہ آسان راستہ چھوڑ کر دشوار کا انتخاب کرتی ہے۔ جسے شدید خطروں سے دست و گریباں ہو کر لطف و مسرت ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کسی شخص میں عام لوگوں سے جس قدر زیادہ صعوبتیں جھیلنے کی ہمت اور صلاحیت ہو گی وہ اسی قدر بڑا لیڈر ہو گا۔ بریگیڈئر رفیق مرحوم کو اس معیار پر پرکھا جائے تو وہ ایک بڑے لیڈر تھے۔ وہ لیڈر ہی نہیں ''لیڈر ساز'' تھے۔ اس کالج کے سابق طلبہ سے پوچھ کر دیکھئے کہ انہوں نے کس طرح پتھروں کو تراش کر ہیرا بنا دیا۔ کس طرح سینکڑوں کیڈٹوں میں قائدانہ

صلاحیتیں پیدا کر دیں۔ جن طلبہ نے ان کے عزم، حوصلے اور سخت کوشی کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور شب وروز مشقوں کا لطف اٹھایا وہ فولاد اور چٹان ہو گئے۔ تلخی ایام ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔ جو حالات ایک اوسط صلاحیت والے آفیسر کے لئے حوصلہ شکن کہے جا سکتے ہیں وہ رفیق کے بنائے ہوئے آفیسروں کے لئے ایک معمولی چیز ہوتے تھے۔ کیونکہ رفیق کی تربیت سے "تلخ زندگانی" ان کے لئے انگبیں بن گیا تھا۔ صبح پی ٹی پر "زمستانی ہوا" کے تھپیڑے کھانا، سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہانا، اکثر جان لیوا گرمی میں پنکھا چلائے بغیر اپنا کام جاری رکھنا، ٹرانسپورٹ موجود ہوتے ہوئے بھی میلوں پیدل چلنا، یہ وہ سپاہیانہ عادات تھیں جن پر وہ خود بھی کاربند تھے اور دوسروں کو بھی کاربند دیکھنا چاہتے تھے۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ اساتذہ جب اکٹھے بیٹھتے تو زبانیں شکوہ وشکایت میں رواں ہو جاتیں۔ ان کی سخت کوشی اور سخت گیری پر تبصرے ہوتے۔ اس شخص نے ہمیں مشقت میں ڈال دیا ہے، مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن آخر میں جب یہ خیال آتا کہ ہر افسر کھیلوں پر ہفتے میں دو بار ڈیوٹی دیتا ہے، پریپ میں ہر افسر کی باری دس پندرہ روز بعد ہی آتی ہے لیکن یہ شخص ہر روز کھیلوں پر موجود ہوتا ہے اور پریپ کے وقت بھی بلا ناغہ حاضر۔ اسی طرح صبح کو وہ سب سے پہلے بیدار ہوتا اور رات کو سب کے بعد بستر پر جاتا ہے، تو ہر شکوہ سنج خود ہی اپنے شکوے پر نادم ہو کر رہ جاتا۔

ہمدردی ودم سازی

کیڈٹوں کی شخصیت کی نشوونما اور ڈسپلن کے بعد جس چیز کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے وہ ماتحتوں کی ضروریات اور بنیادی آسائشوں کا اہتمام تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کی اس قدر عزت اور احترام کرتے تھے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ جس طرح ایک اچھے ڈاکٹر کے زندگی بخش رویے سے مریض کو آدھی شفا ہو جاتی ہے اسی طرح ان کا انداز گفتگو ہمت وحوصلہ بڑھا دیتا تھا اور دل موہ لیتا تھا۔ ان کی تقریر کا انداز بھی بڑا موثر اور دلپذیر تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقرے جن میں یقین اور اعتماد کا زور ہوتا تھا، دل سے نکلتے اور

دل میں اترتے تھے۔

احترام قانون کا تصور

قانون اور ضابطوں کی پابندی کرانے میں وہ بڑے سخت گیر تھے۔ ان کا طریقہ یہی تھا کہ جو کام دوسروں سے کرانا چاہتے تھے اسے خود اوروں سے پہلے کرتے تھے۔ قانون پر خود سختی سے کاربند ہوتے اس کے بعد دوسروں سے اس کا مطالبہ کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں بہت سی خامیوں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ قانون کا احترام کرنا نہیں جانتے۔ رفیق صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر قانون کی اہمیت کا احساس بیدار ہو جاتا تھا۔ ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کو آٹھ دس رفیق میسر آ جائیں تو ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ مگر رفیق تو ایک ہی تھا۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہم یہ بھی کہتے تھے کہ کالج کی مختصر بساط اس قدر متحرک اور پرعزم شخص کے لئے ''ظرف بقدر شوق'' نہیں۔ اسے کچھ اور وسعت چاہیے۔ ایسا شخص تو کم از کم ایک صوبے کا انتظامی سربراہ ہونا چاہیے۔

سزا کے بارے میں نقطہ نظر

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ڈسپلن کے لئے تشویش اور نفسیاتی طریقوں سے پورا کام لیتے تھے لیکن جن ہنگامی حالات میں انہوں نے ملٹری کالج کی کمانڈ دوبارہ سنبھالی تھی، ان میں وہ قانون شکنی کو سنگین چیز سمجھتے تھے۔ اس لئے ایسی نوبت بھی آ جاتی تھی کہ سزا دینا لازمی ہو جاتا تھا۔ کسی سنگین قصور یا قانون شکنی پر وہ کیڈٹوں کو بید زنی کی جسمانی سزا بھی دیتے تھے اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کے عینی شاہدوں کو دوبارہ ویسے قصور کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ میں ذاتی طور پر سزا کے اس طریقے کو تعلیم کے تمام اصولوں کے خلاف سمجھتا ہوں اور میں نے اس بارے میں ان کے سامنے ایک سے زیادہ بار اظہار خیال

بھی کیا۔ بہر حال اس سلسے میں ان کا اپنا نقطہ نظر تھا۔ ان کے نزدیک اگر کوئی فرد رضا و رغبت سے ڈسپلن پر آمادہ نہ ہو اور اسے درسگاہ سے خارج کرنے میں بھی ضوابط کی رکاوٹیں حائل ہوں تو پھر ماحول کو مزید بگاڑنے سے بچانے کے لئے تشدد کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ بہر حال سزا کے بارے میں دو دبستان فکر ہمیشہ رہے ہیں، ایک حامی دوسرا مخالف۔ اور شائد ہمیشہ برقرار رہیں گے۔

اس تمہید کے بعد جو بات میں کہنے والا ہوں اس پر میں خود بھی تعجب کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ ایسے کیڈٹ جو بید زنی کی سزا کے جسمانی اور ذہنی کرب سے گزرتے تھے وہ بھی پکا یقین رکھتے تھے کہ اس سزا میں ذاتی عناد یا نفرت کا عنصر قطعی نہیں ہے اور یہ کہ ان کو سزا اس لئے ملتی تھی کہ وہ اس کے مستحق ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم نے یہ عجیب اور رقت آمیز سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ۱۹۵۳ء میں پہلی کمانڈ کے بعد تبادلے کے وقت ایک ایسا کیڈٹ جس نے یہی سزا پوری شدت کے ساتھ جھیلی تھی ان کو پھولوں کا ہار پہنانے کے لئے سب سے آگے تھا اور اس کی آنکھوں میں عقیدت و احترام کے آنسو تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقریباً ایک سال کے اندر جب ڈسپلن مستحکم ہو گیا تو یہ جسمانی سزا ختم ہو گئی اور اگلے دو اڑھائی سال میں شائد ہی کبھی اس کی نوبت آئی ہو۔

لوہے کے اندر ریشم

ان کی شخصیت کو سطحی نظر سے دیکھنے والے کبھی اس کی صحیح پیمائش نہیں کر سکتے۔ انکا اندازہ شائد یہ ہو کہ وہ درشت مزاج، مروت سے بے نیاز اور مذہبی شعائر سے بیگانہ تھے۔ لیکن ان کے ظاہری "زرہ بکتر" کے اندر ایک بڑا احساس اور گرم دل دھڑکتا تھا۔ وہ دوسروں کے دکھ اور تکلیف کو اپنے دکھ کی طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ قانون اور اصول کے جتنے سخت تھے انسانی تعلقات میں اتنے ہی بامروت اور نرم دل تھے۔

مذہبی شعور

اگرچہ وہ مذہبی ظواہر کے پابند نہیں تھے لیکن ان کو قریب سے دیکھنے والے خوب جانتے تھے کہ ان کے دل میں اسلام کی عظمت کا جو احساس اور اس کی جس قدر محبت تھی وہ ہزار ہا دینداری کا دعویٰ رکھنے والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان اور توکل رکھتے تھے اور رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انسانیت کا عظیم ترین معلم سمجھتے تھے۔ ان کا دل حضور ﷺ کی محبت سے لبریز تھا۔ رمضان کا وہ خصوصی احترام کرتے تھے، پورے روزے رکھتے اور پابندی سے مسجد میں تراویح پڑھتے تھے۔

سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایک اور غلط فہمی بھی ہوتی تھی۔ وہ لباس اور وضع اور طرز معاشرت سے "صاحب بہادر" کا پورا نمونہ نظر آتے تھے۔ لیکن اندر سے بڑے کشادہ ظرف تھے اور چھوٹی سے چھوٹی حیثیت کے آدمی کا احترام کرنے والے تھے۔ وہ "درجہ چہارم" کہلانے والے ملازمین کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ان کی محنت ومشقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اس قابل قدر روایت کا آغاز کیا تھا کہ میلاد النبیؐ کی تقریب میں بڑے کھانے میں افسروں اور کیڈٹوں کے شانہ بشانہ "درجہ چہارم" کے تمام ملازمین بھی شریک ضیافت ہوں۔ یہ اسی عظیم ہستی کے درس مساوات کا ایک عملی مظاہرہ تھا جس کے میلاد کا جشن ہو رہا تھا۔ افسوس کہ یہ روایت بھی ان کے بعد جاری نہ رہ سکی۔

ایک کمزوری

یہ بھی کوئی راز نہیں ہے کہ مے نوشی ان کی ایک کمزوری تھی۔ ایسی کمزوری جس کا انہیں پوری طرح احساس تھا۔ انہوں نے ہمارے سامنے اعتراف کیا کہ اسے ترک نہ کرسکنے کی ذمہ دار ارادے کی کمزوری ہے۔ لیکن یہ بات بھی ان کی دوسری خصوصیات کی طرح بڑی تعجب انگیز ہے کہ یہ عادت کبھی فرائض کی انجام دہی میں خلل انداز نہیں ہوسکی۔ کبھی تو ایسا اتفاق بھی ہوا کہ شغل ناؤ نوش چار بجے صبح تک چلتا رہا۔ لیکن پانچ بجے وہ حسب معمول اوروں سے چند منٹ پہلے پی ٹی گراؤنڈ میں موجود تھے اور اس قدر چست و چاق کہ تکان یا بے خوابی کے کوئی آثار نہیں۔ بعض دوسرے کمانڈنگ افسروں کے برعکس انہوں نے کبھی

نہ چاہا کہ ان کے ماتحت پینے میں ان کا ساتھ دیں۔ ایک بار ایک نوجوان افسر نے طلب خوشنودی کے شوق میں خواہش ظاہر کی تو فوراً اس کی حوصلہ شکنی کر دی اور اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

ذریعہ تعلیم کے بارے میں نقطہ نظر

وہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنے کے حامی تھے اور اس میں تبدیلی کے پیہم اور مدلل مطالبے کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل اس کی حمایت میں یہ ہوتی تھی کہ انگریزی کا ذریعہ تعلیم ہونا طلبہ کے لئے ایک چیلنج ہے اور اردو میڈیم کے مقابلے میں مشکل تر نصب العین پیش کرتا ہے جس کے لئے طلبہ کی بہترین صلاحیتوں کو سرگرم عمل ہونا پڑتا ہے۔ میں ذاتی طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں جس کے دلائل پیش کرنا اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ مجھے کبھی کبھی اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مرحوم سے تبادلہ خیال کا اتفاق ہوتا رہا۔ ظاہر ہے میں انہیں ان کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کی یہ خوبی قابل داد ہے کہ باوجود اس کے اس مسئلے پر ان کے خیالات ایک طبعی میلان کی شکل اختیار کر چکے تھے اور یہ ان کی "پالیسی" کا معاملہ بن گیا تھا پھر بھی انہوں نے میرے تردیدی دلائل پر کبھی ناگواری خاطر کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ان کو پوری رواداری سے سنتے تھے۔ نقطہ نظر کے اختلاف کا احترام ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

طلبہ سے آگاہی

وہ ایک مثالی پرنسپل کی طرح بڑے باخبر تھے۔ اپنے ایک ایک طالب علم کے خاندانی حالات سے آگاہ، اس کی مصروفیات، اس کے میلانات، اس کی ترقی یا تنزل پر نگاہ رکھنے والے۔ انکی یہ صفت اکثر ہاؤس ماسٹروں کو بھی حیرت میں ڈال دیتی تھی اور خود کیڈٹوں کو بھی۔ ہر کیڈٹ کا یہی خیال تھا کہ اس پر ان کی خصوصی توجہ ہے۔ ان کے بے شمار شاگرد ہیں جو پر جوش انداز میں اعتراف کرتے ہیں کہ ان میں کردار اور صلاحیتوں کی اگر کوئی خوبی ہے تو وہ کرنل رفیق کی دی ہوئی ہے۔ کتنے ہی افسر ہیں جو کہتے ہیں کہ ان

کی شخصیت کرنل رفیق کی تخلیق ہے۔

اصول کی خاطر قربانی

ہمارے ملک میں اس قحط الرجال کے زمانے میں بھی قابلیت، ذہانت، ذکاوت اور تیزی اور طراری کی کمی نہیں ہے۔ اگر کمی ہے تو اس چیز کی جسے اصول پرستی اور راست کرداری کہتے ہیں۔ بریگیڈئر رفیق مرحوم ان کمیاب انسانوں میں سے تھے جو اصولوں اور راستی کی خاطر بڑی سے بڑی تکلیفیں اٹھانے اور خطروں کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

وہ ملٹری کالج میں دوبار کمانڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی پہلی کمانڈ ۵۳-۱۹۵۲ء میں دس ماہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی صرف اس لئے کہ ان سے ایسا طرز عمل اختیار کرنے پر اصرار کیا گیا تھا جسے وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ دوسری بار انہیں کالج کی کمانڈ ۱۹۵۵ء میں اس وقت سونپی گئی جب کہ چند اسباب و عوامل کی بدولت طلبہ میں تشدد، قانون شکنی اور سرکشی کے مظاہرے سامنے آنے لگے تھے۔ ڈسپلن کا قصر لڑکھڑانے لگا تھا اور قریب تھا کہ زمین بوس ہو جاتا۔ اس صورت حال میں اگر کسی ایک شخص کی طرف پر امید نگاہیں اٹھتی تھیں کہ وہ اس گرتی ہوئی عمارت کو نہ صرف سنبھال سکتا ہے بلکہ دوبارہ اس کی شاندار روایت کو زندہ کر سکتا ہے، تو وہ کرنل رفیق تھے۔ اور واقعی انہوں نے اپنے دور سربراہی میں ساڑھے تین سال تک شبانہ روز محنت سے کالج کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ ان کو ایک دشوار ترین کام دیا گیا تھا۔ ایک سخت بیمار ادارے کو دوبارہ صحت مند بنانا اور دوسرے اس کی فوجی روایات اور آثار کو تبدیل کر کے پبلک سکولی نظام کے سانچے میں ڈھالنا۔ اس کام کے دوران بڑے سخت مقام آئے۔ بڑے نازک مرحلوں سے واسطہ پڑا۔ لیکن وہ ان مراحل سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔ انہوں نے اس دوران اونچی سے اونچی سفارش یا دباؤ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور بالآخر اس پختگی اور استقامت نے ان کو ۱۹۵۹ء میں دوبارہ کمانڈ سے محروم کر دیا جبکہ ان کے کئی قابل قدر منصوبے جو پبلک سکولی نظام کی

بنیاد مضبوط کرنے کے لئے بے حد اہم تھے تشنہ تکمیل رہ گئے۔
اس دوسری کمانڈ کے دوران علی الصبح سب سے پہلے پی ٹی گراؤنڈ پر موجود ہونے والا، کھیلوں اور پریپ کا ہر روز بہ نفس نفیس مفصل معائنہ کرنے والا، شام کو میس میں محفل آراء ہونے والا کرنل رفیق راتوں کو اکثر ایک ایک بجے تک دفتر میں بیٹھ کر انتظامی منصوبوں کی تفصیلات بھی مرتب کرتا اور ارباب اختیار کو پرزور اور پختہ دلائل سے اپنے منصوبوں، درس گاہ کی ضروریات اور مطالبات پورے کرانے کے لئے مراسلے بھی لکھتا تھا۔

آخر تک سرگرم

اس میں بلا کا دم خم تھا۔ لیکن شب و روز کی شدید محنت آخر رنگ لانے لگی۔ تکان کے اثرات نمودار ہونے لگے۔ برانکائٹس کا موذی عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ قدرت کی طرف سے تنبیہ تھی کہ کام کی بے پناہ رفتار میں وقفوں کی ضرورت ہے لیکن آرام کا لفظ اس غیر معمولی انسان کی لغت میں نہیں تھا۔ وہ فطرت کے اس سگنل سے بے نیاز سرگرم کار رہا۔ چنانچہ یہ تکلیف مستقل شکل اختیار کر گئی۔ پھر مشرقی پاکستان کے نامساعد ماحول میں گزارے ہوئے دو سال۔ اس کے بعد لارنس کالج گھوڑا گلی کی سربراہی جہاں ناموافق کوہستانی آب و ہوا اور چڑھائی کی مشقت جیسے اسباب نے مرض کو شدید تر کر دیا اور پھر اس نے ضیق النفس کی صورت اختیار کر لی۔

افسوس!

کون کہہ سکتا تھا کہ صحت، چستی اور توانائی کا یہ پیکر ایک کھنڈر بن کر رہ جائیگا۔ آخر میں دل کا عارضہ بھی ہو گیا جس کا دوسرا دورہ پیغام اجل ثابت ہوا۔

لیکن غیر معمولی بات یہ ہے کہ علالت اور مرض کی شدت کے باوجود ان کے حوصلے نے کبھی شکست نہیں کھائی۔ زندگی کے بارے میں ان کا رویہ آخر تک پر امید، روشن، مطمئن اور مثبت رہا۔ وہ کبھی مایوسی کا

شکار نہیں ہوئے۔ نہ اپنی ذات کے بارے میں، نہ ملک وقوم کے بارے میں۔

بسیار شیوہ ہاست.....

ہم نے تو ان کو تعلیمی ادارے میں کام کرتے دیکھا۔ لیکن ان کی شخصیت بسیار جہت یعنی صلاحیتوں سے بھرپور تھی۔ ملٹری کالج میں ان کی شخصیت کے کئی ایسے جوہر ہماری نظروں سے اوجھل رہے جو خالص فوجی ماحول میں، بلکہ میدان جنگ میں ہی نمایاں ہو سکتے تھے۔ ان کے ہونہار شاگردوں نے جو اس وقت فوج میں اہم کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ہمیں بتایا ہے کہ کالج سے تبادلے کے بعد جب وہ شمال مغربی سرحد پر تعینات تھے تو باجوڑ کی مہم میں انہوں نے بروقت پیش قدمی کر کے اور خود نہایت اہم فیصلے کر کے کس بے جگری اور اعلیٰ جنگی فہم وفراست ومہارت کا نمونہ پیش کیا۔ اگر وہ اس موقع پر خود فکری، پیش قدمی اور برمحل فیصلے میں پس وپیش سے کام لیتے تو ہماری فوج کا نہ جانے کتنا جانی نقصان ہونا تھا اور سپاہیوں کے حوصلے پر جو زہریلا اثر پڑتا اس کا تو اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان کی دلیری نے جوانوں میں ایک نئے عزم کی لہر دوڑا دی۔ وہ عزم جس کے قدم فتح کے سوا کسی منزل پر نہیں رکتے۔ یہی موقعے ہوتے ہیں جب قیادت اپنے آپ کو منوا لیتی ہے۔

دو محبوب

ہم نے یہی دیکھا کہ دیارِ غیر۔ ملایا۔ میں پیدا ہونے والے اس پرجوش پاکستانی کے دو ہی محبوب تھے۔ ایک پاکستان، دوسرا ملٹری کالج، اگر ان کا بس چلتا تو پاکستان کے ہر نوجوان کو آفاق گیر بنا دیتے۔

پاکستان کی آن کے بارے میں وہ کس قدر حساس تھے اس کی ایک چھوٹی سی مثال وہ واقعہ ہے جو محبّ گرامی حیدری صاحب نے سنایا تھا۔ جہلم کلب میں کچھ انگریز اور بیشتر پاکستانی افسر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کلب کے ماحول میں آپ جانتے ہی ہیں کہ گفتگو محتاط نہیں ہوتی۔ پیمانہ وصہبا کے زیر اثر زبانیں کچھ اور بھی آزاد اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک انگریز سینئر افسر کی بیوی اپنے انگریز

ہم نشین سے باتیں کرتے ہوئے پاکستانیوں کے بارے میں ایک توہین آمیز لفظ کہہ بیٹھی جو دور بیٹھے ہوئے کرنل رفیق کے کانوں تک پہنچ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی آواز گونجی " کس نے پاکستان کی توہین کی ہے؟"

معاملہ کافی سنجیدہ ہوگیا اور ماحول میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ کرنل رفیق نے کہا کہ خاتون اپنے الفاظ واپس لے۔ ادھر انگریز افسروں نے دفاع پر کمر باندھی۔ کچھ پاکستانی افسروں نے بھی معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے ان کا ساتھ دیا۔ لیکن کرنل رفیق اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک اس خاتون نے بر سر عام معافی نہیں مانگ لی۔

ملٹری کالج سے بھی ان کا جذباتی لگاؤ غیر معمولی تھا۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے ملٹری کالج کو خیر باد کہا تھا۔ لیکن کالج کے واقعات اور کیڈٹوں کی بہت سی تفصیلات آخر تک ان کے حافظے پر نقش تھیں۔ جب بھی کالج کے سابق طلبہ یا ہم اساتذہ میں سے کوئی ان سے نیاز حاصل کرنے جاتا تو پرانی یادوں کا البم ان کی نگاہوں کے سامنے کھل جاتا اور اکثر جذبات میں ایسا مدوجزر برپا ہوتا کہ رقت طاری ہو جاتی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ملٹری کالج کی سربراہی کا زمانہ ان کے بہترین دنوں میں سے تھا۔ کالج کی ترقی اور کامیابیوں کا ذکر سنتے تو روحانی خوشی محسوس کرتے تھے۔ کالج کی بہتری اور ترقی کی تجاویز آخری ایام میں بھی ان کے ذہن میں موجود تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس درسگاہ کو کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ ترجیحات بدلتی رہیں۔ لیکن انہوں نے کالج کو جو نصب العین دیا تھا، جو سماجی اور اخلاقی قدریں عطا کی تھیں، جن روشن راہوں سے آشنا کیا تھا۔ وہ ہمیشہ جستجو کرنے والوں کی راہنمائی کرتی رہیں گی۔

محسوس کر رہا ہوں کہ مرحوم کی شخصیت کا یہ خاکہ طویل تو ہو گیا مگر ابھی تشنہ ہے۔ ایک بڑے انسان کی شخصیت کو چند سطروں یا صفحوں میں سمیٹنا آسان نہیں۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے۔ اس لئے قلم کو روکتا ہوں۔

کیپٹن (ریٹائرڈ) سید واصف علی کے تاثرات

راشد: سر، رفیق صاحب کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

سید صاحب: ان کے کردار میں فاروقی انداز تھا۔ گرم دم جستجو نرم دم گفتگو۔ جلال و جمال، دیانت وفراست کا یہ حسین امتزاج کسی کسی میں ہوتا ہے۔ وہ قائداعظم کی قبیل کے آدمی تھے۔ وہی شان، وہی تمکنت، وہی جرأت، وہی حرارت۔ (گفتار میں کردار میں اللہ کی برھان) ان کے لئے بھی کہا جاسکتا ہے۔

ان میں ایک خاص طرح کی عاجزی اور خاکساری بھی تھی۔ وہ اپنی تعریف کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو پروجیکٹ کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کتاب کا جواز یہی ہے کہ ان انسانی اور اخلاقی قدروں کو اجاگر کیا جائے جن کی وہ علامت تھے۔

راشد: ان کے تعلیمی رول کے بارے میں کچھ فرمایئے۔ بحیثیت معلم کے آپ نے انہیں کیسا پایا؟

سید صاحب: اگرچہ وہ سکہ بند استاد نہیں تھے۔ معلّمی کی کوئی رسمی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر معلم اور مصلح تھے۔ تعلیم و تعلم کے اسرار و رموز پر ان کی عارفانہ نظر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عملی طور پر ان سے بڑا ماہر تعلیم کم از کم مجھے اپنی زندگی میں نہیں ملا۔ کتابی باتیں دہرانا اور بات ہے لیکن فلسفہ تعلیم اور طریق تعلیم کا ادراک ہونا اور چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت مینتھڈ افسر پی ایم اے میں، بحیثیت چیف انسٹرکٹر جے ایس پی سی ٹی ایس میں اور بحیثیت کمانڈنٹ ملٹری کالج میں اور بحیثیت پرنسپل گھوڑا گلی کالج میں وہ کامیاب رہے۔ ان کی حیثیت پارس پتھر کی سی تھی جس کو لگا کندن بنادیا۔

راشد: جے ایس پی سی ٹی ایس کی کوئی خاص یاد؟

سید صاحب: اس زمانے میں کوئٹہ میں ایک شیکسپیئر سوسائٹی تھی۔ اس نے کئی ڈرامے سٹیج کئے تھے۔ ایک دفعہ رفیق صاحب مجھے ایک ڈرامہ میں لے گئے۔ غالباً اوتھیلو تھا۔ یوں بھی انہیں مطالعہ کا شوق تھا۔

انگریزی تو قلم برداشتہ لکھتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے۔ آخر میں ایک بہت اہم خصوصیت کا ذکر کروں گا۔ وہ یہ کہ مرحوم برخود غلط بالکل نہیں تھے۔ اپنی بلانوشی کے زمانے میں بھی بنیادی طور پر مذہبی انسان تھے اور مذہبی قدروں پر ان کا بڑا پختہ یقین تھا۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ نامعقول آدمی معقول شاعر نہیں ہوسکتا۔ میں کہتا ہوں کہ لامذہب آدمی معقول قائد نہیں ہوسکتا۔ رفیق صاحب نے مجھ سمیت بے شمار انسانوں کو اپنے کردار سے متاثر کیا اور ان کے کردار کو بقدر ظرف پختہ کیا یہ کوئی معمولی کام اور کارنامہ نہیں۔

میجر (ریٹائرڈ) عبدالعزیز ہاشمی اے ای سی

ملٹری کالج میں، میں چند سال انسٹرکٹر اور پھر چیف انسٹرکٹر رہا۔ یہ ادارہ مجھے اس حوالے سے عزیز ہے کہ یہاں مجھے میرا ہیرو ملا۔ وہ شخصیت جس نے کم از کم مجھ گنہگار کے دل میں عزم فاروقی اور عدل فاروقی کی یاد تازہ کردی۔

کرنل رفیق کی (اس زمانے میں وہ لیفٹیننٹ کرنل تھے اس لئے اضطراری طور پہ اس طرح نام ذہن میں آتا ہے) خصوصیت تھی کہ وہ جزئیات میں جاتے تھے۔ انہوں نے کیڈٹس کو حکم دے رکھا تھا کہ موزوں پر گارٹر استعمال کریں تاکہ موزے نیچے نہ گریں۔ اور ان کی ایک یہ عادت بھی تھی کہ چھوٹے سے چھوٹا حکم دے کر اس کو چیک ضرور کرتے تھے۔ چنانچہ کیڈٹس کے لباس کی پڑتال پر گارٹر بھی دیکھے جاتے تھے۔ یہی ہدایت اسٹاف کو بھی تھی کہ وہ موزوں پر گارٹر استعمال کریں اسی طرح پریپ کے وقت اسٹاف کو ربر سول کے جوتے پہننے کی ہدایت تھی تاکہ کیڈٹس ڈسٹرب نہ ہوں۔ میری عادت گارٹر استعمال کرنے کی نہیں تھی دو ایک بار میرے موزے نیچے دیکھ کر میرے احباب نے کہا بھی۔ ہاشمی، کرنل صاحب نے چیک ضرور کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ تم گارٹر لے لو۔

میں نے سنی ان سنی کردی۔ ایک روز سٹاف روم میں میرے پاؤں کی طرف غور سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ

آج پیشی ہوگی۔لیکن کوئی بلاوا نہیں آیا۔کئی دن، بلکہ کئی ہفتے گزر گئے۔میں بھول بھال بھی گیا کہ ایک روز باتیں کرتے کرتے رک گئے اور بڑی خوشدلی سے کہا۔ہاشمی لڑکوں کے ڈریس انسپیکشن میں گارٹر ضرور دیکھا کرو۔جوتے پر موزے پڑے اچھے معلوم نہیں ہوتے۔میں سمجھ گیا کہ ان کا اصل مطلب کیا ہے۔

اس واقعہ سے میں یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ ان کی ترجیحات کا بھی ایک نظام تھا۔وہ کم اہم باتوں میں کچھ انتظار کرلیا کرتے تھےلیکن کسی ایسی فروگذاشت کی جس کا اثر لڑکوں پر پڑنے کا احتمال ہو وہ قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے۔

آخر میں مرحوم ومغفور کی ایک اور صفت کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں قوت برداشت بھی بہت زیادہ تھی۔ہمارے دوایک ساتھی تھے جوان کے فلسفہ تربیت اور طریق تربیت سے متفق نہیں تھےاور ان سے کھلے دل سے تعاون نہیں کرتے تھے۔ان کی کمزوریوں کا بھی انہیں علم تھا۔لیکن یہ انہیں کا ظرف تھا کہ انہوں نے ان کمزوریوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔واقعہ یہ ہے کہ جہاں سرکاری معاملوں میں وہ سخت گیر تھے ذاتی معاملوں میں ان کا رویہ عفوودرگزر تھا۔دوسروں کی نہیں کہتا۔میں تو انہیں اپنا مرشد سمجھتا ہوں۔اور میں ایک مفکر کے اس خیال سے متفق ہوں کہ آج کل کے درویش اور اولیاء دفتروں، تعلیمی اداروں، کارخانوں، اسپتالوں اور تجربہ گاہوں میں بھی ملتے ہیں یا ملنے چاہئیں۔

بریگیڈئر عنایت الرحمٰن صدیقی

میں اس امر کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ۱۹۵۷۔۱۹۵۸ء میں جب میں ملٹری کالج میں ایک لیفٹیننٹ تھا مجھے کچھ عرصہ بریگیڈئر رفیق کی زیر قیادت کام کرنے اور کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا۔پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک کامیاب سربراہ ایک موثر منتظم اور ایک عظیم قائد ہی نہیں بلکہ وہ ایک خاص طرز تربیت وتعلیم کے حامل بھی تھے جسے رفیقیت کہا جا سکتا ہے۔

انسان کی طرح ادارہ بھی ایک جسم ہوتا ہے۔ پھول پتے، درودیوار، فرش اور پردے، تعلیمی نتائج اور ہم نصابی سرگرمیاں ان سب کی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے اور ضرورت بھی۔ لیکن ادارہ کی ایک روح بھی ہوتی ہے، اس کا ضمیر بھی ہوتا ہے، اس کا کردار بھی ہوتا ہے۔ جس چیز کو میں رفیقیت کہتا ہوں وہ یہ تھی کہ انہوں نے اس ادارے کی روح کو تازہ کیا۔ اس کو اسلامی اور قومی آب ورنگ دیا۔ شعوری طور پر اس کی اخلاقی حس بیدار کی۔ طلبہ کی قدروں اور رویوں کو اولیت دی۔ ان کی شخصیت کی نشوونما کو فوقیت دی اور ظواہر کو ثانوی سمجھا اور ثانوی حیثیت دی۔ ایسا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ قدروں اور رویوں کی تربیت دقت طلب ہی نہیں دیر طلب کام ہے۔ یہ کوئی دکھانے کی چیز نہیں نہ اس کے نتائج فوری طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ امتحانی نتائج، مقابلوں میں جیتی ہوئی ٹرافیاں، درودیوار کی آرائش، پھول پتیوں کا حسن، یہ سب چیزیں فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ یہ سب چیزیں نظر آنے والی ہیں۔ اگر مقصد صرف خوش کرنا اور نام آوری ہو تو ان چیزوں پر تھوڑی سی توجہ دینے سے بہت چوکھا رنگ آسکتا ہے اور بڑی واہ واہ ہوسکتی ہے۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ جن لڑکوں نے بہت اچھے نمبر لئے ہیں، بہت سی ٹرافیاں جیتی ہیں وہ اندر سے کیسے ہیں ان کا ذہن کتنا روشن، کتنا تخلیقی ہے، ان کی قدریں، ان کے رویے کیا ہیں۔ بحیثیت ایک انسان اور ایک پاکستانی کے ان میں کتنا وزن ہے۔ وہ عملی زندگی میں صرف کامیاب ہوں گے یا دنیا کو ان سے، ان کے علم سے، ان کے تجربے سے، ان کے عہدے سے کوئی فرق پڑے گا۔

رفیق صاحب نے اس پہلو پر زور دیا۔ اس نوعیت کی تربیت کو اولیت دی اور مکمل تعلیم کو (ٹوٹل ایجوکیشن) کے تصور کو عملی طور پر بروئے کار لائے یا لانے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی کو میں رفیقیت کہتا ہوں۔ ان کی ذاتی مثال قدروں اور رویوں کی تربیت کا سب سے موثر ذریعہ تھی۔ صبح کے تڑکے سے رات گئے تک وہ کالج میں متحرک نظر آتے۔ جزئیات پر نظر رہتی تھی۔ ان کی ترجیحات بہت واضح تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اطاعت میں مے وانگبیں کی لاگ نہیں تھی۔ زندگی ہی میں نہیں نوکری میں بھی

ہزاروں خواہشات ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔لیکن ان کی بظاہر صرف ایک ہی خواہش تھی کہ ہر لڑکا اندر سے بدلے۔اتنا گہرا" کمٹ منٹ "ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے۔یہ ان کی بے لوث محبت اور بے باک صداقت کا ثمر ہے کہ آج ان کا نام زندہ ہے۔اور کام بھی زندہ ہے۔ورنہ مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے۔ان کے ایک چراغ سے کتنے چراغ روشن ہوئے۔اصل چیز تو ادارہ کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔میں نے پرنس چارلس کے گارڈن اسٹون پبلک سکول میں پڑھایا ہے۔دیکھنے میں شان و شوکت سے خالی تھا۔عمارت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ایٹن اور ہیرو کو بھی میں نے دیکھا ہے۔انہوں نے اپنی قدامت کی نشانیوں کو باقی رکھا ہے۔جن ڈیسکوں اور میزوں پر چرچل ایسے آدمیوں نے کبھی نام کھودے تھے ان پر اب شیشے کی تختیاں لگی ہیں۔اور اب بھی ان سکولوں کو ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مبرا رکھا گیا ہے۔ایک اجنبی کو بھی صاف نظر آ جاتا ہے کہ یہ ادارہ اوپر سے نہیں اندر سے دیکھنے کی چیز ہے اور اسکی توانائی کا سرچشمہ بھی ان دیکھی چیزوں میں ہے۔

آخر میں، میں ان کے طریق کار کی دو ایک مثالیں دوں گا۔مجھے یاد ہے کہ ایک سٹاف میٹنگ میں طلبہ کے نتائج زیر بحث تھے کہ ایک صاحب نے لڑکے کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں سپارک یا شعلہ نہیں ہے۔اس تبصرہ پر رفیق صاحب نے جو تبصرہ کیا وہ قابل غور ہے۔انہوں نے کہا آپ تعلیم کے ماہر ہیں آپ پیشہ ور استاد ہیں آپ کو بہتر معلوم ہوگا کہ کسی لڑکے کو سپارک ایسے مبہم لفظ سے مسترد کر دینا سائنٹیفک طریقہ نہیں۔آپ اس کے غبی یا نا اہل ہونے کی ٹھوس مثال دیجئے۔میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔یہ کہہ کر انہوں نے اپنی ڈائری نکالی جس پر ہر لڑکے پر ان کے مشاہدات اشاروں کی شکل میں درج تھے۔میں نے اسے پی ٹی پر دیکھا ہے۔ٹھیک ٹھاک پی ٹی کر رہا تھا۔سردی تھی لیکن ہاتھ بغل میں دیئے ہوئے نہیں تھے۔میس میں، میں نے دیکھا اس نے اپنے سینئرز کو

پہلے سر وکیا۔ یہ سب مشاہدات تو کچھ اور کہتے ہیں۔ میرا مقصد آپ کی ہمت شکنی نہیں آپ نے کچھ کہا تو ہے کچھ دلچسپی تو لی ہے۔ اس لڑکے کو اپنی توجہ کے قابل تو سمجھا۔ یہ مثبت رویہ ہے اور کسی پر کچھ نہ کہنے سے، کسی کا نوٹس ہی نہ لینے سے، بحث میں حصہ ہی نہ لینے سے یقیناً بہتر ہے۔ اس لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اپنے طلبہ میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی آپ سے بلکہ سب اساتذہ سے درخواست کروں گا کہ لڑکوں کو مختلف زاویوں سے دیکھیں اور کسی لڑکے کے بارے میں اچھی یا بری جو بھی رائے قائم کریں وہ مختلف النوع ٹھوس مشاہدات پر مبنی ہونی چاہیے۔ اور اس کو واضح الفاظ میں استعارہ کے بغیر پیش کیا جائے۔

یہ خود ان کے طریق کار کی ایک مثال ہے۔ وہ اپنے رفقاء کار کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو خوب سمجھتے تھے اور ہر ایک سے اس کا بہترین پہلو نکال لینا ان کو خوب آتا تھا۔ ایک لیڈر کا امتحان یہ بھی ہوتا ہے کہ اس نے خود کس پائے کے لیڈروں کی تربیت کی ہے جو اس کے کام کو جاری رکھ سکیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بعض بہت ہی کامیاب قائد محض اس لئے دوررس نتائج پیدا نہیں کر سکے کہ وہ خود تو چاند سورج تھے لیکن اپنے پیچھے کوئی ستارہ بھی نہیں چھوڑا۔ رفیق صاحب نے اپنے سٹاف میں اور اپنے طلبہ میں بھی قیادت کے جوہر پروان چڑھائے جو اپنے اپنے دائرے میں حسب توفیق "رفیقیت" کو زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں۔ میں ان کی نظر کی کیمیا اثری کا بڑا قائل ہوں۔ ذرّہ کو آفتاب بنانا ان کو آتا تھا۔ اس کی مثال میں خود اپنے حوالے سے دینا چاہتا ہوں۔ ۱۹۵۷ء میں کیپٹن مرتضٰی کے تبادلہ پر انہوں نے مجھ سے کہا۔ صدیقی تم رابرٹس ہاؤس سنبھالو میں اس وقت لیفٹیننٹ تھا۔ رابرٹس ہاؤس سینئر ہاؤس تھا اور پرابلم ہاؤس تھا۔ میں جھجکا کہ اتنی بڑی ذمہ داری کو میں اٹھا سکوں گا یا نہیں۔ بہر حال ان کے اعتماد کو بھی میں ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا بہت بہتر سر، اور ہاؤس کا چارج لے لیا۔ اب یہ ذمہ داری میرے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں نے پہلے روز ہی لڑکوں کے ذاتی فائل دفتر سے نکلوائے اور رات کو ان کو

لے کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کمرہ کا قصہ ہے جہاں اب راشد صاحب کا ڈرائینگ روم ہے۔ رات کے گیارہ بجے، بارہ بجے، ایک بجا، میں فائلوں میں محو تھا کہ کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دل میں کہا لو آئی اب کوئی مصیبت، ہاؤس میں کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہوگا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی کہا کم ان اور جناب جب دروازہ کھلا تو اپنی خاص چھڑی ہاتھ میں لئے کرنل رفیق صاحب نظر آئے۔ پوچھا اتنی رات گئے کیا ہو رہا ہے۔ فائل تو سامنے کھلے پڑے تھے۔ میں نے کہا سر، فائلیں دیکھ رہا ہوں۔ ایک دم بولے صدیقی میں نہ کہتا تھا کہ تم یہ کام کر لوگے یہی تو اسپرٹ ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت دیر تک میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کی یہ خاص عادت تھی کہ وہ جونیئر سٹاف کی خاص طور سے ہمت افزائی کرتے تھے اور ان کو مختلف النوع کام دے کر ان کی راہنمائی کر کے ان کی شخصیت کے امکانات کو بروئے کار لانے میں مدد دیتے تھے۔ یہ بھی تخلیقی عمل ہے۔ آخر میں یہ بھی کہوں گا کہ اس میں میری کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہ ایک ایک کے کام اور لگن کی قدر کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان کے فیض تربیت سے بقدر ظرف ہر ایک نے حصہ پایا۔ مجھے یقین ہے کہ ملٹری کالج کی تاریخ میں دور رفیقی قطب ستارہ کی طرح ہمیشہ تابندہ رہے گا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

لیفٹیننٹ کرنل غلام رسول تسنیم اے ای سی

یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے جب میری بیگم بیمار ہوئیں تو انہیں سی ایم ایچ داخل کرنا پڑا۔ اس کے بعد معمول کے رعایتی چارجز کاٹے گئے۔ اس پر آڈٹ نے اعتراض کر دیا کہ آفیسر کی عمر شادی کی مراعات ملنے کی حد سے کم ہے۔ اس لئے پورے چارجز کاٹے جانے چاہیے تھے جو خاصی رقم بنتی تھی۔ کرنل رفیق نے یہ دلیل دے کر کہ یہ آفیسر کمشن سے پہلے شادی شدہ تھا اس لئے یہ ان مراعات کا حق دار ہے با قاعدہ یہ

کیس لڑا۔ بہت سی نظیریں پیش کیں۔ کافی دنوں یہ کیس چلتا رہا۔ آخر میں جب یہ کیس تھرو ہو گیا تو مجھے بلا کر صرف یہ بتایا کہ آڈٹ کے کچھ اعتراضات تھے جن کو رفع کر دیا گیا ہے۔ آپ کا استحقاق مستند ہے۔ اس لئے جب کبھی ضرورت ہو اس حق سے استفادہ کریں۔ ان کے بتانے کے انداز سے مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ کیس کتنا مشکل تھا۔ دوسرے دن میں قدوس صاحب اکاؤنٹینٹ کے دفتر میں لڑکوں کے پاکٹ منی کے سلسلہ میں گیا تو انہوں نے کہا تسنیم صاحب مبارک ہو۔ آپ کا کیس تھرو ہو گیا ورنہ سی این ای کیس کے طور پر آپ کو بڑا تاوان بھگتنا پڑتا۔ یہ دیکھئے سامنے فلیگ لگا فائل پڑا ہے۔ اس وقت میں نے وہ لمبی چوڑی خط و کتابت دیکھی جو انہوں نے اس سلسلہ میں کی تھی۔ پھر مجھے جب ان کی لاپرواہی سے اس کیس کے بارے میں خیال آیا تو اور حیرت ہوئی۔ یہ ان کی شخصیت کا خاص انداز تھا کہ بڑے سخت ٹاسک ماسٹر تھے اور Perfectionist تھے۔ ہر کام کے اعلیٰ ترین معیار سے کم تر پر خوش کیا راضی بھی نہیں ہوتے تھے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں خود بھی سرگرداں رہتے تھے اور دوسروں کو بھی سرگرداں رکھنے کی بڑی تندہی سے کوشش کرتے تھے۔ لیکن دلداری میں بھی کم نہیں تھے۔ دوسروں کے درد کا درماں کرنے میں بے انتہا تگ و دو کرتے تھے اور وہ بھی ماں جیسے رویے کے ساتھ خاموشی سے، بغیر احسان جتلائے، بغیر کریڈٹ لئے۔ اللہ اکبر! کیا انسان تھا۔ میں ان کی عظمت کے اس پہلو کو خاص طور پر سلام کرتا ہوں۔

تصورات و تاثرات

سعید راشد فیضی

میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جتنا بڑا کام ہو اتنا زیادہ Involvement چاہتا ہے۔ ادارے، خاص طور پر وہ ادارے جو قومی اہمیت رکھتے ہوں اور تعمیری اور تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہوں انکی سربراہی مشکل ذمہ داری ہے جس سے ایک عام کیریر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جس کی اپنی

Commitments ہوتی ہیں۔ کیریر کو بنانا ہے، آگے بڑھنا ہے اس کی نظر "اے سی آر" پر، اوپر کے افسروں پر، "اپنی کور" کے مفادات پر تو ہوگی۔ یہ تو تقاضے یا Compulsions ہوئے نوکری کے۔ پھر خاندان ہے، بیوی بچے ہیں، پھر گھر بنانا ہے، Assets بڑھانے ہیں، بچوں کی تعلیم کو دیکھنا ہے، ان کے مستقبل کو محفوظ بنانا ہے وغیرہ وغیرہ ہزار بکھیڑے ہیں۔ ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اس طرح ترجیحات یعنی Priorities کچھ اس طرح مرتب ہوتی ہیں کہ ادارہ کی سربراہی دوسرے ذاتی مقاصد Ends کے حصول کا ایک ذریعہ یعنی Means بن جاتی ہے۔ پردہ پڑا رہتا ہے یا ڈالا جاتا ہے خدمت کا یا کام کا۔ لیکن اصل مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ حال کچھ تعلیمی اداروں کا ہی نہیں قومی زندگی کے دوسرے شعبوں کا بھی ہے۔

قومی نوعیت کے تعلیمی و تربیتی ادارے Quality کے لحاظ سے اسی وقت بلند ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جب انہیں ایسے سربراہ ملتے ہیں جو TOTAL INVOLVEMENT دے سکتے ہوں۔ جن کی پہلی ترجیح یعنی پہلی محبت ادارہ ہو۔ جو عام کیریر آفیسرز کی کمزوریوں کا شکار نہ ہوں۔

ملٹری کالج جہلم ہی کو لیجیے اس ادارہ کو قائم ہوئے ساٹھ برس ہوئے ہیں۔ اس طویل عرصے میں صرف دو نام ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پاکستان کی تاسیس سے پہلے ٹی ایچ اسٹیپنگ کا اور پاکستان بننے کے بعد بریگیڈئر رفیق کا۔ آپ دونوں کی زندگی "لائف سٹائل" کو دیکھئے۔ اسٹیپنگ خاندان اور کیریر کی دوسری زنجیروں سے بالکل آزاد تھا۔ بیوی ہاؤس کیپنگ کرتی تھی۔ ایک بیٹا تھا جو لندن میں رہتا تھا کبھی یہاں نہیں آیا۔ کیریر کی زنجیروں کا حال یہ تھا کہ دس برس یہاں رہا۔ اس سے کئی جونیئر کرنل بریگیڈئر پروموٹ ہوئے۔ خود اسے پروموشن آفر بھی ہوئی لیکن اس نے ایم سی کی کرنیلی (اور اس ادارہ کے ذریعے تاج برطانیہ کی خدمت) کو ترجیح دی۔ پھر وہ براہ راست کمانڈر انچیف سے تھر و تھا۔ اس پر دس "باس" بیٹھے ہوئے نہیں تھے اگر تھے بھی تو اسے ان کی پرواہ نہیں تھی (چونکہ اسے نوکری کی پرواہ نہیں تھی)۔ یہی حال

بریگیڈئر رفیق کا تھا۔ وہ بھی اندر سے درویش تھے۔ انہوں نے کیریر کے تقاضوں یعنی Compulsions کی گھاس کی پتی برابر بھی پرواہ نہیں کی۔ ان کا کردار، ان کی Courage of Conviction اس درجہ اور اس پائے کی تھی کہ انہوں نے اپنے ضمیر کے Terms پر کمانڈنٹی کی اور جب ان پر اوپر سے پابندیاں عائد کی گئیں تو انہوں نے بجائے جھکنے کے چھوڑنا مناسب سمجھا۔ وہ درویش صفت انسان تھے اور Personal Commitment کے معاملہ میں بھی بے نیاز تھے۔ ان کا تعلق یعنی Involvement ایک مشنری کا تعلق تھا۔ اسی ضمن میں قومی سطح کے تعلیمی و تربیتی اداروں، خاص طور پر پبلک اسکولوں کے اساتذہ کے بارے میں بھی چند معروضیات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ ان اداروں میں عام اداروں کی طرح صرف اچھے انسٹرکٹر یا معلم ہی نہیں چاہیئں جو نصاب کو اچھی طرح پڑھا سکیں بلکہ پانچ سات استاد ضرور اس Calibre، شخصیت اور Devotion کے ہونے چاہیئں جو اپنے اپنے شعبہ یا مضمون میں ایک حوالہ بن سکیں اور جو کسی نصابی یا ہم نصابی سرگرمی میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہوں تا کہ انکے شاگرد ان کے حوالے سے تعلیم کے معیاروں کا ادراک کر سکیں اور اپنے آپ کو دریافت کر سکیں۔

اس نکتے کو میں دو ایک مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ حیدری صاحب مرحوم کو لیجئے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ کالج میں آئے اور (ایک آدھ سال کے وقفے کے ساتھ) ۱۹۶۹ء کے اواخر میں اسے خیر باد کہا۔ ۱۱۸۷ جنرل اقبال نے ان سے ۱۹۴۳ء کچھ دنوں پڑھا تھا۔ ۹۹۳ بریگیڈئر محمد صادق خان چیئر مین گورنرز انسپیکشن ٹیم بھی اسی طرح انہیں دنوں کچھ عرصہ ان کے شاگرد رہے۔ ۱۹۸۲ء میں تقریباً چالیس سال کے بعد جب میں نے ان دونوں سے جرأتوں کے نشان اور کالج ہسٹری کے سلسلے میں انٹرویو لیا تو کالج کا نام آتے ہی ان کی زبان پر بے ساختہ پہلا نام حیدری صاحب تھا۔ شاگرد کیڈٹ سے جنرل بن جائے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے، دنیا دیکھے، خود اعلیٰ سے اعلیٰ اداروں میں تربیت حاصل کرے اور کسی استاد کو کسی حوالے کے

طور پر یاد کرے تو وہ "کے جی آر آئی ایم سی" کا ایک استاد ہو۔ وہ بھی تربیتی آمریت
کے دور کا تو بات ہوئی ناں، اسے کہتے ہیں شخصیت۔ جس کسی نے ملٹری کالج Regimentation
میں ان سے انگریزی پڑھی ہے وہ اس تجربے کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ اس پڑھائی کے مواد Contents
سے تو غالباً ایک آدھ سال بعد ہی آگے نکل گیا تھا۔ جس چیز کا Impact باقی تھا وہ ان کے پڑھانے کا
انداز، معیار اور سب سے بڑھ کر شخصیت جو رویوں، قدروں اور لائف سٹائل سے بنتی ہے۔ (تصور کیجئے
کہ حیدری صاحب کے بعض شاگرد آج بھی ان کے Talent ہی نہیں ان کی نفاست کو بھی یاد کرتے
نہیں تھکتے)۔ اسی طرح ان کے ڈرامے لوگوں کو بھلائے نہیں بھولتے۔ اردو میں یہ حیثیت عین الدین
علوی کو حاصل رہی ہے۔ انکے حوالے سے ان کے طلبہ جانتے ہیں کہ علم کی گہرائیاں کیا ہوتی ہیں؟ ادب
کیا چیز ہے، تنقید کیا ہوتی ہے۔ تحریر کا حسن کسے کہتے ہیں۔ طنز ومزاح کا معیار کیا ہے۔ تقریر و تمثیل کے گر
کیا ہیں۔ اسی طرح ہر قابل ذکر ادارے کے اپنے اپنے رفیق، حیدری اور علوی ہوتے ہیں اور ہونے
چاہئے تاکہ ان کے حوالے سے طلبہ کی زندگی کی بنیادی قدروں، رویوں، شخصیت کے جمال وکمال، فن
کی افقوں اور علم کی سرحدوں کا کچھ شعور لاشعوری طور پر ہوتا رہے اور پھر وہ اپنے آپ کو
Discover کرنے کی منزل سے Develop کرنے کے مقصود کی طرف ذوق وشوق سے بڑھ
سکیں اور یہی تمام تعلیم وتربیت کا مقصد وحید ہے۔ اس پایہ اور کردار کے اساتذہ کمیاب تو ہیں نایاب نہیں
ہیں۔ ڈھونڈنے والوں کی البتہ کمی نظر آتی ہے۔ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں اس قلیل یعنی Breed کے
کارپردازوں کی پیداوار (معاشی معنوں میں) قومی منصوبہ بندی کا ایک لازمی جزو ہونا چاہیے۔ مجنوں نہ
رہے تو صحرا کا کیا بنے گا؟

مختصر یہ کہ اگر قومی اداروں کو خاص کر اعلیٰ سطح کے قومی تعلیمی اداروں کو بچانا ہے اور پاکستان کو
پروان چڑھانا ہے تو ان کی سربراہی کے لئے "رفیقوں" کو ڈھونڈھنا پڑے گا۔ اور ان میں پڑھانے اور

ہاؤس ماسٹری کرنے کے لئے "حیدریوں" اور "علویوں" کی ضرورت پڑتی رہے گی۔

اب میں بریگیڈئر رفیق کے طریق قیادت کے بارے میں چند ذاتی تجربات کے حوالے سے کچھ عرض کروں گا۔ اپنے دوسرے دور میں چارج لینے کے چند دنوں کے بعد انہوں نے تمام سٹاف سے ملاقات کی تھی۔ جب میری باری آئی تو دو چار رسمی جملوں کے بعد ہی انہوں نے یہ پوچھ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ آپ کے گھر میں بے بی کب متوقع ہے۔ پھر مزید کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں تنہا ہیں آپ فکر نہ کریں میں نے میٹرن (مسز کارنیلس) کو بتا دیا ہے کہ وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر چیک کرلیا کریں اور ڈیلیوری تک چھٹی نہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ غالباً آپ کیس مشن ہسپتال جہلم میں کروانا چاہتے ہیں اس کے لئے میں نے شعیب (لیفٹیننٹ شعیب اے او) سے بھی کہہ دیا ہے کہ ایمبولینس آپ کے لئے ریزرو رکھیں۔ اس کے بعد کالج کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو انہوں نے میز کی دراز سے ایک لفافہ نکالا۔ شائد آپ کو کچھ پیسوں کی ضرورت پڑے۔ آسان قسطوں میں اکاؤنٹینٹ کو واپس کر دیجئے گا۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۵۵ء کی صبح یہ وہی تھے جنہوں نے مجھے کلاس سے بلا کر بچی کے پیدا ہونے کی مبارک باد دی اور کہا کہ آپ کلاس چھوڑ کر ابھی ہسپتال جائیں۔ میں پیریڈ کا انتظام کرتا ہوں۔ یہ توجہ صرف میرے لئے مخصوص نہیں تھی۔ میٹرن کو حکم تھا کہ آل رینکس کے گھروں کا چکر لگاتی رہے۔ چنانچہ وہ ہر روز صبح دس بجے انکو بریف کرتی تھیں کہ صحت وصفائی سے متعلق کہاں کیا پرابلم ہے اور اس کو ترجیحی بنیادوں پر حل کیا جاتا تھا۔ انکی ہمدردی کے "ریڈار" کی پہنچ دور دور تک تھی۔

ایک حدیث پاک ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک بار ایک صحابی کو مسجد نبویؐ سے بلی کے نوزائیدہ بچے نکال پھینکنے سے منع فرمایا تھا۔ اس حدیث کو سن کر علامہ اقبال کا تبصرہ یہ تھا۔ مادرانہ شفقت (مدرہڈ) رسالت کا جزوِ عظیم ہے۔ رسالت قیادت کی بلند ترین صورت ہے چنانچہ کوئی قیادت بغیر مادریت کے

عنصر کے موثر نہیں ہوتی۔

اوائل نومبر ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں ایک روز صبح سویرے اسکین ہاؤس کے پیچھے جونیئر اسکاؤٹس یعنی کبس کو کالج کے سالانہ فنکشن کے لئے تیاری کرا رہا تھا لیکن ان کے پاؤں نہیں ملتے تھے۔ رفیق صاحب بھی سامنے کھڑے تھے اتنے میں سامنے اسکین ہاؤس میں میرے گھر کا دروازہ کھلا اور بشیر (میرا ملازم لڑکا) دوڑتا ہوا آیا اور بیگم کا یہ پیغام پہنچایا کہ بچی کو کوئی تکلیف ہے آپ آئیں۔ بشیر نے یہ پیغام تقریباً سرگوشی کے انداز میں دیا تھا لیکن وہ سمجھ گئے کہ کوئی بات ہے۔ فوراً مجھ سے کہا کہ مسٹر راشد آپ گھر کو اٹینڈ کریں۔ ان کے اسٹیپ میں ٹھیک کرواتا ہوں۔ رفیق صاحب نے ایک مہم شروع کی تھی کہ ہر لڑکا سٹیج پر آئے اس کے لئے ہر کلاس کو اپنا علیحدہ ڈرامہ کالج میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ ایک رات میں اپنی کلاس ہفتم سی کے ڈرامے کا ریہرسل کروا رہا تھا کہ وہ حسب دستور ریہرسل دیکھنے آ گئے اسی روز اتفاق سے ریہرسل میں دیر لگی اور مجھے نیند کے دو ایک جھونکے آئے انہوں نے دیکھا تو فوراً کہا۔ "مسٹر راشد آپ آرام کریں۔ باقی ریہرسل میں لے لوں گا۔"

اب ان کی اصول پرستی کے دو واقعہ سناتا ہوں۔ اسکین ہاؤس کے آنرشاپ میں ایک لڑکا بار بار گھپلا کر رہا تھا اور اس کی دوسری حرکتیں بھی قابل تعزیر تھیں۔ آخر کار مجھے اس کی رپورٹ کرنا پڑی۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا تعلق دو دو تین تین اسٹارز کی فلیگ کاروں کے گھرانے سے ہے۔ لیکن انہوں نے معمول کے مطابق چھان بین کی اور اسے قصوروار پا کر اس کا پتہ کاٹ دیا۔ پھر کیا کچھ طوفان نہ آیا ہوگا لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ اسی کیس کے سلسلے میں ہاؤس کی آبزرویشن بک لئے دفتر میں بیٹھا تھا کہ فلیگ اسٹاف ہاؤس مری سے جی او سی نے فون کیا۔ وہ اپنے ان دو رشتہ دار بچوں کا رزلٹ جاننا چاہتے تھے جنہوں نے انہیں دنوں داخلے کا امتحان دیا تھا۔ انہوں نے بغیر تکلف بتا دیا کہ ایک میرٹ لسٹ پر ہے دوسرا معیار پر پورا نہیں اتر سکا۔ اور فون رکھ دیا۔

ارسطو نے تو صرف اپنی خیالی ریاست میں جسٹس (عدل) کو بنیاد بنایا تھا۔ رفیق صاحب نے عملی طور پر ایسا کر دکھایا۔

تاج بگلر کی زبانی

راشد: پہلے تو آپ اپنی کہانی سنائیں۔

محمد تاج: پورا نام راجہ محمد تاج ہے، کریالے کا رہنے والا ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۱ء تک ۷/۲۲ پنجاب رجمنٹ میں نوکری کی۔ ۱۹۳۳ء میں کالج میں ملازم ہوا۔ اور ۱۹۶۶ء تک ۳۳ سال یہاں کالج میں بہت سی ڈیوٹیاں کیں۔ بگلر رہا، کمانڈنٹ کے دفتر کا خاص چپڑاسی تھا۔ آفیسرز میس اور کمانڈنٹ کے بنگلے پر بھی کچھ عرصے کام کیا۔ لیکن کالج میں مشہور تاج بگلر کے نام سے ہوا۔ چونکہ شروع کے سولہ سترہ سال بگلری کی اور اسی میں نام پیدا کیا۔

راشد: وہ کس طرح؟

تاج: میں ٹائم کا بہت پابند تھا اور بہت زوردار بگل بجاتا تھا

راشد: وہ بگل پھٹنے کا کیا قصہ ہے؟

تاج: یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ سیلی صاحب میجر کمانڈنٹ تھے کہ ایک روز صبح میں نے پوری سانس سے جو بگل بجایا تو بگل پھٹ گیا۔ مغنی صاحب کوارٹر ماسٹر تھے۔ انہوں نے سٹور سے دوسرا بگل نکلوا دیا۔ بگل پھٹنے کی بڑی خبر بنی۔ کمانڈنٹ نے پانچ روپے انعام بھی دیا تھا۔ نئے لڑکے بالے جو کالج میں داخل ہوتے تھے۔ مجھ سے پوچھتے تھے کیوں چاچا یہ خبر ٹھیک ہے۔ پھر کہتے چاچا ہمیں بگل پھاڑ کے دکھاؤ۔ میں ہنس کر ٹال دیتا۔

راشد: اب کرنل رفیق کی بات کرتے ہیں۔

تاج: میں نے کالج میں بہت دنیا دیکھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ جو کام انہوں نے کیا وہ کسی اور نے نہیں

کیا۔

راشد: مثلاً؟

تاج: مثلاً کالج کا ٹرن آؤٹ ٹھیک کیا۔

راشد: ڈسپلن؟

تاج: جی ہاں ڈسپلن۔ ٹائم کے بہت پابند تھے۔ صبح کی پی ٹی پر سب سے پہلے آتے تھے۔ چٹی پینٹ، چٹی بنیان، چٹے جوتے، چٹی جرابیں پہنتے تھے۔ افسروں کی پی ٹی سب سے پہلے ہوتی تھی اس پر وہ سب سے پہلے آتے تھے۔ ادھر وہ موسیٰ ہال والی گراؤنڈ میں قدم رکھتے ادھر میں بگل بجاتا۔ ایک روز وہ سامنے نظر نہیں آئے میں نے بگل بجا دیا۔ وہ ایک منٹ بعد میں آئے۔ پوچھا پہلے بگل کیوں بجا دیا۔ میں نے اپنی ٹائم پیس آگے کر دی۔ انکی اپنی گھڑی ایک منٹ پیچھے تھی۔ وہ گھڑی انہوں نے کلائی سے اتار کر فرش پر دے ماری۔ انکے اردلی نے بتایا کہ اس دن سے وہ ایک گھڑی غسل خانے میں بھی رکھنے لگے تھے۔ میں نے کچھ دنوں ان کے بنگلے پر بھی کام کیا۔

راشد: انکے رہن سہن کے بارے میں کچھ بتائیے؟

تاج: یہ اس زمانے کی بات ہے جب سٹاف کی چائے کا حاجی غلام رسول کا ٹھیکہ تھا۔ میں چائے بناتا تھا اور دلاور افسروں کو پیش کرتا تھا۔ ایک روز چائے کی پیالی پر کوئی نشان تھا۔ کرنل صاحب نے زور سے چمچہ پیالی پر مارا "یہ کیا ہے" اور اٹھ کر چلے گئے۔ اور حکم دیا دفتر آؤ۔ دفتر گیا تو بابو قدوس صاحب اکاؤنٹینٹ نے کہا کہ کرنل صاحب نے ایک روپیہ جرمانہ کیا ہے۔ میں نے کہا میرا قصور نہیں۔ میں نوکری چھوڑ دوں گا لیکن جرمانہ نہیں دوں گا۔ انہوں نے یہ بات جا کر کرنل صاحب کو بتائی۔ انہوں نے کہا تاج سے کہو بنگلے پر آئے۔ سہ پہر کو بنگلے پر گیا تو انکے اردلی سردار خان نے کہا کرنل صاحب نے ایک روپیہ دیا ہے جاؤ جرمانہ ادا کر دو۔ میں پھر اکڑ گیا۔ میں نے کہا میں نہ روپیہ لوں گا نہ جرمانہ ادا

کروں گا۔ یہ بات سردار خان نے اندر جا کر بتا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد کرنل صاحب نے مجھے بلایا اور کہا" مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمہارا قصور نہیں تھا۔ میں نے غصے میں جرمانہ کر دیا ہے۔ اب میں واپس نہیں لے سکتا۔ میری بات جائے گی۔ تم یہ پانچ روپے لے لو۔ جرمانہ ادا کر دو بات ختم کر دو" میں نے کہا یہ بات ہے تو میں جناب کا تابعدار ہوں یہ نوٹ میں نہیں لوں گا، لیکن جرمانہ ادا کر دوں گا۔ میں جب چلنے لگا تو کرنل صاحب کو میں نے سردار سے کہتے سنا۔" جو آدمی کام میں تگڑا ہو وہ غصہ بھی کرتا ہے۔ نکما ہر بات پی جاتا ہے۔"

راشد: بڑے پتے کی بات ہے۔

تاج: جی ہاں۔ وہ کام کی قدر کرتے تھے اور آدمی کو پہچانتے تھے۔ غلط آدمی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ فرمان نائی بہت گندہ رہتا تھا۔ بار بار کہنے پر اس نے اپنی حالت نہیں بدلی تو اسے چلتا کر دیا۔ ایک لانگری رابرٹس ہاؤس کے میس میں مٹر چھیلتے ہوئے مٹر کے دانے کھا رہا تھا۔ وہ جالی دار کھڑکی کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے اس کی انہوں نے فوراً چھٹی کر دی لیکن کام والے ایماندار آدمیوں کے نخرے بھی اٹھاتے تھے۔ جب میں میس میں کام کرتا تھا تو ایک بار میں نے انہیں ٹوک بھی دیا تھا۔

راشد: وہ کیا واقعہ تھا؟

تاج: میس میں مہمانوں کا کھانا تھا۔ کھانا مجھے لگوانا تھا۔ وہ برتنوں کی الماری کھول کے برتنوں کو نکال نکال کر ان پر انگلی پھیر کر ان کی گرد چیک کرنے لگے۔ میں نے کہا جناب الماری کے برتن چیک کرنا انصاف نہیں آپ میز کے برتنوں کو دیکھنا اگر گرد ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ میرے ٹوکنے پر وہ الماری کا پٹ بند کر کے ڈائننگ ہال میں چلے گئے۔ پھر روشنی میں ایک ایک پلیٹ کو چیک کیا۔ جب ہر پلیٹ کو شیشے کی طرح صاف اور چمکتا ہوا پایا تو ویل ڈن ویل ڈن بولا۔ اور پانچ روپے انعام دیئے۔ ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں۔

راشد: جی۔

تاج: وہ یہ کہ وہ کالج کی حد میں اور گھر کے اندر اور ہوتے تھے۔ جب کرنل صاحب بریگیڈئر ہو کر لارنس کالج کے پرنسپل تھے۔ میں ان سے ملنے کے لئے ان کے بنگلے پر گیا۔ جپھا مار کر ملے۔ گھر میں مہمان بنا کر ٹھہرایا۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور بٹھایا۔ چلتے وقت بار بار کہا۔ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ نیا بریگیڈئر آ گیا ہے میں لاہور میں جا رہا ہوں۔ وہاں آنا۔ افسوس ہے کہ میں پھر لاہور نہ جا سکا۔ اور پھر سنی تو انہونی سنی۔

نادر خان مالی کا انٹرویو

راشد: پہلے تو آپ اپنے بارے میں بتائیں۔ کالج میں کب سے ہیں۔ کیا کام کر رہے ہیں۔

نادر خان: نام تو نادر خان ہے مشہور نادرا ہوں۔ ۱۹۵۲ء کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو مالیوں میں بھرتی ہوا تھا۔ جب سے آج تک مالی کا کام کر رہا ہوں

راشد: کرنل رفیق صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔

نادر خان: بڑے چنگے غریب پرور تھے جی۔

راشد: انکے چنگے پن اور غریب پروری کی کوئی مثال۔

نادر خان: کالج کے ایک پرانے لانگری شفیع خان نے سودی کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ کالج ہی کے کلاس فوروں کو بھاری سود پر قرضہ دیتا تھا۔ بعض لوگوں کی تو آدھی آدھی تنخواہ شفیع کی تھیلی میں چلی جاتی تھی۔ چیزیں بھی گروی رکھتا تھا۔ اس سے سارے عاجز تھے۔ کرنل رفیق ہفتے کے ہفتے دربار کرتے تھے۔ وہاں کسی نے بتایا کہ ہم تو شفیع کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں۔ دربار کے بعد کرنل صاحب کے حکم سے بابو قدوس اکاؤنٹینٹ نے شفیع کو بلوایا۔ سارے قرضوں کا حساب لیا۔ اس کا سارا پیسہ کلاس فوروں کی طرف سے ادا کیا اور اس کو وارننگ دی کہ آئیندہ کسی کو سودی قرض دیا تو خیر نہیں۔ پھر کرنل صاحب کے حکم سے ہمارا ایک فنڈ کھولا گیا۔ ہر بندے کے ہر مہینے تین روپے کٹتے تھے۔ اس فنڈ سے ہمیں ضرورت کے وقت

بغیر سود کے قرض مل جاتا تھا۔اور بال بچوں کی شادی بیاہ، اور غمی کے موقعوں پر کرنل صاحب علیحدہ سے رقم دلواتے تھے۔کسی کی حالت زیادہ پتلی ہوتی تو اسے اپنے پاس سے بھی کچھ دے دیتے تھے۔اس کے علاوہ کلاس فوروں کے گھر والوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔آپ کو یاد ہوگا کرنل صاحب صبح شام گھوڑے پر کالج کا چکر لگاتے تھے۔ ہر جگہ جاتے تھے۔راستے میں کلاس فور کا کوئی بچہ بالا ملتا تو گھوڑا روک کر اس سے دو ایک باتیں کرتے۔ پوچھتے کوئی تکلیف تو نہیں۔اسی طرح میٹرن صاحبہ بھی کلاس فوروں کے گھروں کا چکر لگاتی تھیں۔این سی اوز کے کوارٹرز میں جاتی تھیں۔صفائی بھی چیک کرتی تھیں اور بیماروں کی خبر کرنل صاحب کو دیتی تھیں۔

راشد: یہ تو ایک بات ہوئی۔دوسری طرف بھی تو دکھایئے کہ کام لینے میں کیسے تھے؟

نادر خاں: جناب اس کا کیا پوچھنا۔کام لینے میں بھی کتنے سخت تھے اس کا کیا بتاؤں۔ ہر شخص ڈرتا رہتا تھا اگر ذرا سی بھی سستی کی تو مارا جاؤں گا۔کیوں کہ ہر چیز کی خود چیکنگ کرتے تھے۔سنتری، چوکیدار کیا مجال کہ سو جائے یا ادھر ادھر ہو جائے سخت کھچائی کرتے تھے۔بے ایمانی پر کھڑے کھڑے نکال دیتے تھے۔ وحید وغیرہ تین باربروں نے کچھ بالوں کی مشین کا چکر چلایا تھا۔انہوں نے تینوں کو چلتا کیا۔

راشد: کوئی اور بات؟

نادر خان: صاحب کو پھولوں کا بہت شوق تھا وہ سال کے سال پھولوں کی نمائش کرواتے تھے۔قادر بخش مالی کو انہوں نے چغہ پہنا کے انعام دیا تھا۔اس نے گل داؤدی اتنے بڑے بڑے اگائے تھے کہ کوئی حساب نہیں۔اس زمانے میں سرکلر روڈ پر پھول ہی پھول ہوتے تھے۔ہاں ایک اور بات یاد آئی انہوں نے کلاس فوروں کی تعلیم کے لئے رات کو ایک گھنٹے کی کلاس بھی لگوائی تھی۔

صادق مسیح ہیڈ سویپر کا انٹرویو

راشد: صادق آپ کا پورا نام کیا ہے۔کب نوکری شروع کی؟

صادق: صادق مسیح میرا پورا نام ہے، ۱۹۵۱ء میں چوتھے مہینے کی نو تاریخ کو میں نے کلاس فور کی حیثیت سے نوکری شروع کی تھی۔ اب ہیڈ سو پیر ہوں۔ میں نے کرنل رفیق کے دونوں دور دیکھے ہیں۔

راشد: کرنل صاحب کیسے تھے؟

صادق: گورا ٹائپ آدمی تھے۔ زیادہ تر انگلش میں گٹ پٹ کرتے تھے۔ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ صفائی کا بہت شوق تھا۔ سختی ہماری آتی تھی۔ کالج میں آتے ہی انہوں نے صفائی کا چکر چلایا۔ برسوں کا گند اٹھوایا۔ ہم غریبوں کو بڑی عزت دی اور بڑا سہارا دیا۔

راشد: وہ کیسے؟

صادق: بڑے کھانے میں وہ سو پیرز سمیت تمام کلاس فوروں کو بلاتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار دن کا بڑا کھانا دفتر کے سامنے (وہاں جہاں آجکل لائبیریری ہے) ہوا تھا۔ یہ انہیں کی شان تھی کہ انہوں نے ہمیں اتنی عزت دی۔ غریب پرور بہت تھے۔ جب کبھی لڑکے چھٹی جاتے تھے اس دن کا سارا فریش راشن وہ کلاس فور میں بانٹ دیتے تھے۔ ہم لوگ انتظار کرتے رہتے تھے کہ کب لڑکے چھٹی جائیں۔

راشد: لیکن سخت بھی تو تھے۔

صادق: کام لینے میں بڑے سخت تھے اور بڑی سخت سزا دیتے تھے۔ ٹارچ سوٹی کے ساتھ راتوں رات گھومتے رہتے تھے۔ مجال ہے کوئی چوکیدار سونا تو دور کی بات ذرا ادھر ادھر ہو جائے۔ ہمیں حیرانگی تو یہ ہوتی تھی کہ وہ سوتے کس وقت تھے۔ ان کے آنے سے پہلے کالج میں ادھم مچا ہوا تھا۔ انہوں نے لڑکوں کو ٹائٹ کر کے رکھ دیا۔ کیا مجال کہ رات کو ہاؤس سے باہر کوئی لڑکا نظر آ جائے۔ مارنے پر آتے تو مارتے بھی بہت تھے، سوٹی تک ٹوٹ جاتی تھی۔

راشد: سنا ہے کہ آپ لوگوں کے ہاں انہوں نے چائے بھی پی تھی۔

صادق: ہمارے کوارٹروں کا چکر اکثر لگاتے رہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے لال کے گھر چائے بھی پی

تھی۔ایسے بندہ پرتو انسان جان بھی دے سکتا ہے۔ان کے جانے کے بعد تو ہمیں بہت ذلیل کیا گیا۔
خود مجھ بے گناہ پر جو مار پڑی وہ خدا کسی کو نہ پڑوائے۔

راشد: ہم کرنل رفیق کی بات کر رہے تھے۔

صادق: ویسا بندہ پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

یادوں کے دریچے
عالمگیرینز کے تاثرات

۸۷۸ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد اصغر راجہ

’’اصغر! پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ آپ کو رفیق صاحب سے کب نیاز حاصل ہوا؟‘‘

''میں ملٹری کالج کا، اولڈ بوائے ضرور ہوں، ۸۷۸ میرا کالج نمبر ہے۔ کالج میں ان کے آنے سے بہت پہلے میں کالج کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ پھر بھی مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ میں ان کے اولین شاگردوں میں سے ایک ہوں''۔

''وہ کیسے؟''

''وہ اس طرح کہ ۱۹۵۰ء میں جب وہ پی ایم اے میں میتھڈ آفیسر تھے تو میں وہاں زیر تربیت تھا۔ قاسم کمپنی میں وہ ہماری میتھڈ آف انسٹرکشن کی کلاس لیتے تھے''۔

''اس زمانے کا کیا تاثر ہے؟''

آپ جانتے ہیں کہ نوجوانی میں آدمی IDEALIST ہوتا ہے۔ اس کی نظر بلندیوں پر ہوتی ہے۔ کوئی کمتر چیز تو آنکھوں میں جچتی نہیں۔ پھر اس زمانے کے پی ایم اے میں ایک سے ایک بڑھ کر انسٹرکٹر تھا۔ ان میں سے کئی تو بعد میں جنرل ہوئے۔ اس GALAXY میں میجر رفیق کا اپنا ایک مقام تھا، منفرد اور ممتاز۔

''کس طرح؟ اس امتیاز اور انفرادیت کی کچھ مثالیں دے سکیں تو اچھا ہو''۔

''ان کی شخصیت کا impact بہت تھا۔ اس میں ان کے ٹرن آؤٹ، بیئرنگ اور لائف سٹائل سب عناصر کا دخل تھا۔ پڑھاتے بھی خوب تھے، اپنے کام میں یکتا تھے۔ لیکن میں انکی انسٹرکٹری کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ نصاب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ کوئی بھی کور کر سکتا ہے''۔

''اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ آپ نے ان سے کیا سیکھا۔ یا انہوں نے آپ کی زندگی میں کیا کنٹری بیوٹ کیا تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟''

''اس سوال کے جواب میں یہ کہوں گا کہ ان کا کنٹری بیوشن میری زندگی میں یہ ہے کہ اس زمانے میں جب تیشہ وتلوار کے پیشے میں نووارد تھا۔ اس وقت رفیق صاحب ایک آفیسر کی امیج کا حوالہ بنے۔

دل نے کہا دیکھو اصغر، افسر ایسا ہوتا ہے۔ بعد کو اس امیج میں توسیع ہوتی رہی لیکن فریم ورک وہی رہا جس کی صورت گری رفیق صاحب کے حوالے سے ہوئی تھی''۔

''پی ایم اے کے بعد بھی ان سے کبھی رابطہ رہا؟''

ان کا تعلق پنجاب رجمنٹ سے تھا۔ ہمارا آبائی تعلق بھی اسی رجمنٹ سے ہے۔ میرے انکل کرنل خورشید عالم سے انکے قریبی تعلقات تھے۔ اس رشتے سے وہ اکثر ہمارے گاؤں ڈومیلی بھی آتے رہتے تھے اور چونکہ ملٹری کالج میں میرے بھائی کرنل حسن اختر اور کرنل گلستان ان کے شاگرد رہے تھے اس حوالے سے بھی انکی باتیں سنتا رہتا تھا۔ ایک دو بار میں جنرل حمید کے اسٹاف آفیسر کی حیثیت سے کالج میں آیا تو انہیں کانفرنسوں ہی میں مشغول پایا۔ کام میں وہ سخت گیر تھے اور ان کے کام کا ٹیمپو بہت تیز تھا پھر ان سے لارنس کالج میں نیاز حاصل ہوا۔ جب میرا بیٹا شہریار وہاں پڑھتا تھا۔ اس وقت ان کی صحت خاصی گر چکی تھی اسکے باوجود انہوں نے لارنس کالج کو ایک قومی ادارہ بنانے کے لئے وہاں دوررَس نتائج کے حامل بعض اہم اصلاحی اقدامات کئے۔

''مثلاً یہ کہ آزادی کے بعد بھی اس کا نام لارنس کالج ہی چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے اسے پائن ہلز کالج کا نام دیا۔ یہ صرف ظاہری کی تبدیلی نہیں تھی۔ باطن کی بھی تھی''۔

''وہ کیسے؟''

''وہ اس طرح کہ انہوں نے شعوری طور پر اس کا رشتہ اس دھرتی سے جوڑا۔ اور طلبہ میں پاکستانی ہونے کا جذبہ ابھارا۔ انہوں نے وہاں اصولوں کی برتری کے اصول کو بھی مستحکم کیا''۔

۱۳۹۴ میجر (ریٹائرڈ) عمر حیات

یہ واقعہ اواخر دسمبر ۱۹۵۲ء یا اوائل ۱۹۵۳ء کا ہے۔ میں برڈوڈ ہاؤس کی ڈارم نمبر ۶ کا سیکشن کمانڈر تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس وجہ سے اس دن پریپ صبح اور ہاؤس میں ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیوں میں پریپ میں

نہانے چلا گیا اور جب واپس آیا تو ۱۵۲۰ اعظم کی لاکر میں سے تیل کی شیشی نکال کر سر میں تیل ڈالا۔ پھر کنگھا کرنے لگا۔ تولیہ لپیٹے ہوئے بڑے مزے سے ایک لاکر سے دوسرے لاکر جا کر وہاں آئینہ دیکھا۔ بال ٹھیک کیئے۔ مجھے بعد کو پتہ چلا کہ اس تمام عرصے میں کرنل رفیق آخری دروازے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ زاویہ ایسا تھا کہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے اور میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈارم کی غیر معمولی خاموشی سے مجھے کچھ شبہ ہوا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے جب میں نے مڑ کے دیکھا تو میری ان سے آنکھیں چار ہوگئیں۔ اس وقت میں کنگھا کر رہا تھا۔ میرا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ لیکن خلاف توقع انہوں نے کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ گئے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہاؤس ماسٹر یا ہاؤس آفیسر کسی سے بھی کچھ نہیں کہا کہ یہ کیسا سیکشن کمانڈر ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب لڑکوں کو آئے دن سخت سزائیں ملتی رہتی تھیں۔ میں نے یہ واقعہ ظاہر کرنے کیلئے لکھا ہے کہ وہ سزا ضرور دیتے تھے لیکن یہ دیکھ کر کہ کس نے کیا غلط کام کس نیت سے کیا تھا۔ میں چونکہ اسپیشل پاس کر چکا تھا اور عموماً ان کے رائٹ سائڈ رہتا تھا اس لئے انہوں نے میری غیر ذمہ داری کو نظر انداز کر دیا۔ کرنل رفیق نے آتے ہی آؤٹ ڈور مشاغل میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ شکار کلب کے آفیسر انچارج راؤ عبدالوہاب تھے۔ ان کے ساتھ کئی بار ترکی کی پہاڑیوں میں شکار کیلئے گئے۔ ۱۷۰۰ افضل بھی شکار پارٹی کا ممبر تھا۔ رائڈنگ بھی ہابی کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ ۱۵۲۳ کاظم، ۱۶۲۳ اختر، ۱۶۵۶ منصور، ۱۷۱۰ یونس اور میں اس رائڈنگ کلب کے ممبر تھے۔ کرنل رفیق خود بھی اچھے رائڈر تھے۔ صبح سویرے پی ٹی پر اکثر گھوڑے پر آتے تھے اور اکثر شام کو کالج کے سارے علاقے کا چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ آتے ہی انہوں نے ڈسپلن کو کافی کھینچا تھا، سینئرز سے بھی کافی باز پرس ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود اندر سے ہمارا احساس کشادگی اور پھیلاؤ کا تھا اور بہت سی نئی باتوں کی ہما ہمی سے بجائے بیزار ہونے کے ہمیں کچھ حاصل کرنے کی خوشی اور فخر تھا۔ ۱۹۵۵ء میں، میں پی ایم اے میں تھا۔ میں کسی مختصر چھٹی پر پنڈی آیا۔ بس اسٹینڈ کے قریب یکا یک ملاقات ہوگئی۔ دیکھتے ہی پہچان

لیا۔ ہیلو عمر حیات کیسے ہو، کورس کیسا جا رہا ہے۔ میں نے کہا سر، شکر ہے، آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہے بس آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے۔

''وہ کیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''پاسنگ آؤٹ قریب ہے میں کس آرم میں جاؤں''۔ انہوں نے دریافت کیا۔ ''کس آرم نے تمہیں کالج میں نامزد کیا تھا اور خرچہ اٹھایا تھا۔ یہ اس کا حق ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''نامزد تو مجھے آرمرڈ نے کیا تھا لیکن وہاں کا خرچہ بہت ہے اور میں انفنٹری ٹائپ ہوں''۔ فرمانے لگے ''عمر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وفاداری کا تقاضا کیا ہے، باقی چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خرچے کی بات آدمی پر ہے کون کہاں کتنا خرچہ کرتا ہے۔ میرے خیال سے تو تمہیں اپنی آبائی یونٹ میں جانا چاہیے۔ یا کم از کم کوشش تو کرو۔'' انکے یہ کہنے پر بھی میں نے آرمرڈ کو دوسری چوائس رکھا۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے آرمرڈ ہی میں بھیجا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔ افسوس ہوا تو اس بات کا کہ انکے کہنے پر میں نے آرمرڈ کو پہلی چوائس پر کیوں نہ رکھا۔ انکا جملہ ''دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وفاداری کا تقاضا کیا ہے''۔ زندگی کے کئی مرحلوں میں مجھے یاد آیا۔ اور ہر بار مجھے اس سے نئی روشنی ملی۔ ملک وقوم سے وفاداری کا سبق ہم نے ان ہی سے سیکھا۔ ان سے پہلے ہم چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات کے کنوئیں میں گرے پڑے ہوئے تھے اور افق پار کی دنیا کی خبر نہیں تھی۔

۱۹۶۹ بریگیڈئر منظور حسین، امتیازی سند

''آر ایس ایم منظور، کیا بات ہے، کیوں روتے ہو؟''

''سر، پی اے، اسپیشل کا رزلٹ نکلا ہے''۔

''مجھے معلوم ہے، پھر؟''

''سر، میں پھر فیل ہو گیا ہوں''۔

’’تو کیا روتے کیوں ہو؟ آفیسر روتے نہیں‘‘۔

’’سر، اسپیشل تو پاس ہوتا نہیں، آفیسر کیسے بن سکوں گا‘‘۔

’’ایک آدھ بار کا فیل ہونا کوئی چیز نہیں، تم اس کی پرواہ مت کرو، میں نے تمہیں کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم افسر بنو گے اور بہت اچھے افسر بنو گے، جاؤ حوصلہ کرو پھر امتحان دو، پھر کوشش کرو‘‘۔

یہ ہے وہ گفتگو جس نے بلا مبالغہ میری زندگی کا رخ بدل دیا اور پس منظر اس گفتگو کا یہ ہے کہ جب میں دوسری بار پی اے اسپیشل کے امتحان میں فیل ہوا تو میں بے انتہا مایوس ہوا۔ مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ دل بیٹھا جاتا تھا کہ شائد قسمت میں کمیشن نہیں، سپاہی بھرتی ہونا لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خودکشی کرلوں، کالج سے بھاگ جاؤں، کیا کروں۔ کیڈٹ آفیسر ہونے کی وجہ سے ناکامی اور بے عزتی کا احساس اور شدید ہوگیا تھا۔ میں شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا۔ اتفاق سے رابرٹس ہاؤس میں میرے کمرہ کے سامنے سے مسٹر سعید راشد گزرے۔ انہوں نے حسب عادت مجھے آواز دی۔’’ منظور کیا ہورہا ہے‘‘۔ میں سامنے آیا تو میری بری حالت تھی۔ انہوں نے پوچھا‘‘۔ خیر تو ہے؟’’ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے میری بہت ہمت بندھائی اور مشورہ یہ دیا کہ جاؤ کرنل صاحب سے ملو۔ آج اتوار تو ضرور ہے لیکن ابھی ابھی میں نے انہیں دفتر جاتے دیکھا ہے۔ راشد صاحب کے مشورے میں مجھے روشنی کی کرن نظر آئی اور میں وردی پہن کے کرنل رفیق کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور پھر وہ گفتگو ہوئی جو میں نے اوپر نقل کی ہے۔ ان کے یہ الفاظ کہ میں نے تمہیں کام کرتے دیکھا ہے مجھے یقین ہے کہ تم ضرور افسر بنو گے، میرے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ رفیق صاحب کے جنت میں درجات بلند کرے وہ بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے مجھے ہی نہیں بہت سے درماندہ کیڈٹوں کو روشنی دی۔ مجھ جیسے بہت سے طلبہ جو پس منظر میں پڑے دل شکستگی کا شکار تھے انہیں رفیق صاحب نے نئی زندگی دی۔ میرا خیال ہے کہ اگر ریکارڈ دیکھا جائے تو جتنی

ترقی کرنل رفیق صاحب کے زمانے کے اوسط درجے کے لڑکوں نے کی اتنی ترقی شائد کسی اور دور کے اس قبیل کے لڑکوں نے نہ کی ہوگی۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

کوئی مجھ سے پوچھے کہ ایک جملہ میں بتاؤ کہ کرنل رفیق کا کارنامہ کیا ہے تو میں بلاتوقف کہوں گا کہ انہوں نے گرتوں کو تھاما۔ یہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ یہ کرنل رفیق کی ہمت افزائی کا اعجاز تھا کہ انکے کالج چھوڑنے سے پہلے میں نے پی اے اسپیشل، پی ایم اے کا تحریری امتحان اور آئی ایس ایس بی سارے ٹیسٹ بیک جست کامیابی سے پاس کئے اور جب میں انکی خدمت میں آئی ایس ایس بی کلیر کر لینے کی خوشخبری لے کر حاضر ہوا تو وہ اس طرح خوش ہوئے جیسے انکے اپنے بیٹے نے کوئی بڑی کامیابی حاصل کی ہو۔ پھر کہا'' ۔ منظور کبھی مایوس نہ ہونا۔ یاد رکھو کوشش میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

۱۴۷ کرنل محمد افضل جنجوعہ

وہ اپنے اصولوں میں بظاہر بے رحم Ruthless ضرور تھے۔ ان کی انتہا پسندی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا فلسفہ تربیت واضح تھا۔ کہ کالج کے مفاد کی خاطر فرد کو قربان کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ جب بھی ایسا موقعہ آتا وہ خطا کار کی قطعاً کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اس وقت مجھے اس لڑکے کا نام یاد نہیں آ رہا جو کالج سے بھاگ گیا تھا۔ پھر اسے انہوں نے کسی قیمت پر قبول نہیں کیا بڑی بڑی اونچی سفارش آئی۔ لیکن وہ اپنے فیصلہ پر اڑے رہے۔ جب اس لڑکے کی غریبی کی دلیل آئی تو انہوں نے جواب دیا اچھے سے اچھے سکول میں اس کی تعلیم کے اخراجات میں اٹھاؤں گا لیکن کالج کے ڈسپلن کو نہیں ٹوٹنے دونگا۔ اسی طرح سزا کا معاملہ تھا۔ میں نے انکا پہلا دور دیکھا ہے۔ سنا ہے کہ دوسرے دور میں وہ کافی بدل گئے تھے۔ لیکن پہلے دور میں بعض قصوروں پر بے تحاشا سزا دیتے تھے۔ قصوروار کی

رعایت کرنے کو وہ قومی اور اجتماعی وفاداری کے منافی سمجھتے تھے۔اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اپنے اصولوں کو انہوں نے نہایت دیانتداری سے عملی جامہ پہنایا بغیر کسی رو رعایت کے۔آج کونٹری کی سزا کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔انہوں نے کونٹری دی۔بغیر کسی جھجک کے دی کیونکہ وہ اجتماعی ڈسپلن اور خطا کار کی اصلاح کیلئے اس کو ضروری سمجھتے تھے۔لیکن یہ ان کے کردار کا صرف ایک پہلو تھا۔ انکی اصل شخصیت انکے کام میں تھی۔اس کی صرف ایک مثال دونگا۔ڈیری فارم سے صبح کا دودھ مکھن چار بجے آتا تھا۔بحثیت ڈیوٹی کیڈٹ آفیسر کے جب بھی میں اس کی چیکنگ کیلئے ملک روم گیا۔اکثر ان کو وہاں موجود پایا۔ڈیوٹی آفیسر بھی ہفتے میں ایک بار آتا تھا۔لیکن وہ ہفتے میں کم ازکم تین چار بار خود چیک کرنے آتے تھے۔ان کی اس بات سے میں نے خود اتنا اثر لیا کہ اپنی تیس سالہ فوجی زندگی میں ہمیشہ انکی اس مثال کو سامنے رکھا۔ڈیوٹی کو صرف ڈیوٹی نہ سمجھا بلکہ اس سے بہت آگے جا کر کام کرنا کم از کم میں نے انہی سے سیکھا۔

۱۵۰۰ میجر محمد صفدر

ہر شخص کو سمجھنے، اس کی شخصیت کی تہہ میں اترنے کا ایک لمحہ ہوتا ہے۔ میں نے کرنل رفیق کو اس وقت پہچانا جب ۸۰ے۱ محمد رقیب کی حادثاتی موت پر میں نے ان کے ردعمل کو دیکھا۔جو حالت کسی باپ کی اپنی جوان اولاد کی ناگہانی موت پر ہوتی ہے ان کی اس وقت وہ حالت تھی۔اس سے پہلے میں ان کو ایک سخت ڈسپلن کے پابند کی حیثیت سے جانتا تھا۔اس واقعہ کے بعد میری رائے ان کے بارے میں بدل گئی۔ رقیب کے ہاکی کھیلتے ہوئے سر میں چوٹ لگی تھی۔اس ہاکی گراؤنڈ میں جہاں آج کل موسیٰ ہال کے سامنے فوارہ ہے۔۲۵ کی لائن پر ۱۳۳۴ ارشید نے تقریباً ۳۰ گز کے فاصلے سے ہٹ لگایا تھا۔گیند غیر متوقع طور پر اچھلی اور رقیب کی کنپٹی پر جا لگی۔ چوٹ سے اس کی آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔ وہ اپنے پیروں سے اسکین ہاؤس تک آیا۔لیکن ہسپتال جا کر بے ہوش ہوا تو پھر ہوش میں نہیں آیا۔ یہ سارا واقعہ میری آنکھوں

کے سامنے ہوا اس لئے زیادہ متاثر تھا۔ پھر رفیق صاحب نے اس واقعہ سے جو اثر لیا اور جس طرح رقیب کی تیمارداری کی پھر اس کے جنازہ پر میں نے ان کی جو حالت دیکھی اسے مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں کیڈٹس سے کتنا تعلق ہے۔ کالج سے یہ گہرا جذباتی تعلق ہی ان کی کامیابی کی بنیاد بنا۔ خوبیاں ان میں اور بہت سی تھیں جن کی وجہ سے لڑکے ان کی سخت گیری کے باوجود ان سے بھاگتے نہیں تھے۔ لیڈرشپ کیا ہوتی ہے اس کا جو معیار انہوں نے قائم کر کے دکھایا تھا وہ آج بھی میرے لئے اور غالباً ان کے دور کے ہر عالمگیرین کیلئے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنے کو تو وہ انفینٹری کے تھے لیکن انہوں نے پہلی بار پی ٹی، ڈرل سے زیادہ تعلیمی سرگرمیوں کو اہمیت دی۔

۱۵۰۵ تنویر احمد سید

تنویر: رفیق صاحب کے بارے میں تمہارا کیا تاثر کیا ہے؟

سر، رفیق صاحب، حیدری صاحب وہ شخصیتیں ہیں جن پر جتنا بھی کہا جائے لکھا جائے کم ہے۔ اب ایسے استاد کہاں سے آئیں گے۔ جو ڈرامے انہوں نے پروڈیوس کئے اور جس طرح انگریزی انہوں نے پڑھائی آج کل کے طلبہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے فن کے ''جینس'' تھے۔ رفیق صاحب اپنے دائرے میں طاق تھے۔

''اس کی کوئی مثال''

ایک مثال دیتا ہوں۔ جو فوری طور پر میرے ذہن میں آ گئی ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کے اواخر کا ہے۔ میں آ کنلک ہاؤس کی کچن ڈیوٹی پر تھا اور آ کنلک ہاؤس کے راشن روم میں راشن کا رجسٹر کھولے راشن کا حساب کر رہا تھا۔ آپ نے دیکھا ہے لیکن بہت سے پڑھنے والوں کو علم نہ ہوگا کہ آ کنلک ہاؤس کچا ہاؤس تھا اور اس کا میس اس کے پیچھے تھا۔ اور راشن روم اس کا آخری کمرہ تھا۔ سنسان اور ویران، آس پاس کا علاقہ بھی یوں ہی پڑا تھا۔ وہ سرِشام گھوڑے پر سوار وہاں آ گئے اور اتر کر سیدھے میرے پاس

آئے۔

''کیا ہو رہا ہے۔ تنویر'' سر، حساب کر رہا ہوں۔ بہت خوش ہوئے۔ میرے شانے تھپتھپائے۔ ایسا احساس فرض چاہیے۔ تنویر مجھے یقین ہے کہ تم زندگی میں بہت ترقی کرو گے۔ جاتے جاتے اتنا اور کہا۔ ''کیپ دی کچن کلین'' اور گھوڑے پر سوار ہو کر کالج کے کسی اور کونے کھدرے کو دیکھنے چلے گئے۔ ان کی عادت تھی صبح شام گھوڑے پر کالج کے کونے کونے کا چکر لگاتے تھے۔ میں نے زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ جوان بیٹے کی ناگہانی موت کا غم اٹھایا ہے۔ لیکن اب سے تیس بتیس سال پہلے رفیق صاحب نے جس طرح ہمت بندھائی تھی اور احساس فرض کی جو راہ دکھائی تھی وہ آج بھی میرے لئے انسپریشن کا باعث ہے۔ ایک اور بات جس کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ان کی ذاتی توجہ ہے۔

''مثلاً''

مثلاً یہ کہ میں برڈوڈ ہاؤس میں کارپورل تھا کہ ۱۳۸۵ (اب بریگیڈئر) امیر سے میری باکسنگ آئی۔ کنٹین کے پیچھے ''سکھ چین'' کے گھنے پیڑوں کے نیچے کٹ بیگ لٹکے ہوئے تھے پریکٹس کیلئے۔ کھیلوں کے وقت ایک روز باکسنگ کی مشق بھی ہوتی تھی۔ میں کٹ بیگوں کے پاس کھڑا تھا لیکن مشق نہیں کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ ادھر سے گزرے، تیسری بار میرے پاس آئے اور پوچھا: ''تنویر تمہیں کیا تکلیف ہے تم مشق کیوں نہیں کر رہے''۔ ایک میں ہی نہیں کالج کا ہر لڑکا انکی نظر میں تھا۔ لوگوں کیلئے اپنی اولاد پر نظر رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ چار سو سے زیادہ لڑکوں پر نظر رکھے ہوئے تھے یہ کام بغیر ''جنون'' کے ممکن نہیں،

۱۵۱۹ لیفٹیننٹ کرنل رب نواز

''رب نواز، اپنی یادوں کے دریچے کھولیں اور کچھ بریگیڈئر رفیق کے بارے میں بتائیں؟''

سر، کالج کے حوالے سے تو بہت سے اولڈ بوائز نے آپ کو بریگیڈئر رفیق کے بارے میں بہت کچھ

بتایا ہوگا۔ لیکن میرے علم میں ایک ایسا واقعہ بھی ہے جو شائد میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور جو میں چاہتا ہوں، ریکارڈ پر آجائے۔

''ضرور''۔

میں شروع سے بیان کرتا ہوں آپ ضروری کانٹ چھانٹ کرلیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات کو ایسٹ پاکستان میں ملٹری ایکشن شروع ہوا تھا۔ اس وقت سے ڈھاکہ چھاؤنی میں جو ٹروپس تھے وہ ڈھاکہ شہر میں باغیانہ سرگرمیوں سے نمٹنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ ۲۶ مارچ کو صورت حال یہ تھی کہ ڈھاکہ چھاؤنی میں کوئی باقاعدہ ٹروپس موجود نہیں تھے۔ چھاؤنی ایک لحاظ سے خالی پڑی تھی۔ بیشتر آفیسرز بھی باہر تھے۔ میں ۱۴ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں ڈی کیو تھا۔ دوپہر سے خبریں ملنے لگیں کہ چھاؤنی کی نئی طفیل کالونی پر جہاں مغربی پاکستان کے بیشتر افسروں کے بیوی بچے رہتے تھے، رات کو حملہ ہوگا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ افسروں کے گھروں کو لوٹنے کیلئے پکا منصوبہ بنایا گیا ہے یہاں تک کہ یہ بھی طے کرلیا گیا تھا کہ فلاں افسر کے گھر کو فلاں گروپ لوٹے گا۔ مزید برآں یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے ارادے کچھ اور بھی ہیں۔

''ان خبروں یا اطلاعوں کا ذریعہ کیا تھا؟''

''ذریعہ بہت قابل اعتبار تھا''۔

''وہ کیا؟''

وہ صورت یہ تھی کہ مکتی باہنی میں زیادہ تر ای پی آر، ملٹری پولیس اور پیراملٹری فورسز کے باغی عناصر ہی تھے۔ وہ جب بیرکوں سے بھاگے تھے تو اسلحہ کے ساتھ ساتھ وائرلیس کے سیٹ وغیرہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ بلکہ جتنا سامان ساتھ لے جاسکتے تھے لے گئے تھے۔ جب وہ ان وائرلیس سیٹوں کو اپنی باغیانہ سرگرمیوں کیلئے استعمال کرتے تھے تو ہم ان کی فری کوئنسی جاننے کی وجہ سے انکے خفیہ پیغاموں کو پکڑ سکتے تھے۔

''وہ کیسے؟''

وہ اس طرح کہ جو سیٹ ہمارے پاس تھے ان پر بہاری بیٹھے تھے۔ وہ مکتی باہنی کے پیغامات کا بنگالی سے ترجمہ کر کے ہمیں بتاتے تھے کہ اب یہ بات چل رہی ہے، اب یہ منصوبہ بن رہا ہے۔ ۲۶ مارچ کی دوپہر کو میں اسٹیشن ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا تھا کہ میرے بہاری آپریٹر نے بتایا کہ سررات کو طفیل کالونی پر حملے کا پلان بن رہا ہے۔ انکے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ یہ سنکر میں باہر آیا طفیل کالونی کے تحفظ کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ریگولر ٹروپس تو وہاں تھے ہی نہیں L.O.Bs تھے۔ انہیں کو اکٹھا کرنے کے بارے میں سوچا۔

''ایل او بیز کیا؟''

''لیفٹ آؤٹ آف بیٹل''۔ یعنی وہ باقی ماندہ لوگ جو لڑنے کے قابل نہیں سمجھے گئے تھے مثلاً بیٹ مین، دفتروں کے کلرک وغیرہ، جو لوگ سامنے تھے ان کے ذریعے دوسروں کو اطلاع کروائی کہ سب بندے شام کو اسٹیشن ہیڈ کوارٹر پر جمع ہوں۔ ''آر وی'' کا انتظام کرنے کے بعد طفیل کالونی آ گیا اور آفیسرز کی فیمیلز کو بتایا کہ یہ افواہ ہے مگر گھبرانے کی بات نہیں، بس چوکنے رہیں۔ ہم ضروری کاروائی کر رہے ہیں۔ انہیں شام ہوئی تو ایل او بیز آر وی پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ جمع ہوتے خاصی دیر ہو گئی اور اندھیرا سا چھانے لگا۔ چونکہ آس پاس پیڑ بہت تھے اور اندھیرے کا احساس بھی ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب مزید انتظام کرنا بیکار ہے جو لوگ آ گئے ہیں انہیں کو منظّم کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ان لوگوں میں ہتھیار تقسیم کئے اور ان کو ایک لائن میں فالن کروایا تا کہ ان کی گنتی کرواؤں اور پھر صورت حال کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار کروں۔ چنانچہ میں نے ان کو گننا شروع کیا۔ ایک دو تین چار جب اس طرح گنتے گنتے آخری آدمی پر پہنچا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بلند آواز سے کہا یہ اٹھائیس اور ایک میں ۲۹ گویا ہم ۲۹ بندے ہیں۔ اتنے میں پیڑوں کے پیچھے سے ایک گھمبیر آواز آئی۔ ''نہیں تیس''۔ میں چونکا اس لئے بھی کہ

آواز مانوس تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بریگیڈئر رفیق کھڑے نظر آئے۔

''بریگیڈئر رفیق؟''

جی ہاں میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ بریگیڈئر رفیق ہیں۔ پوری وردی میں کینوس کے پاؤچ میں پستول بمعہ گولیوں کی پیٹی کے تھا۔ وہ تقریباً سال بھر سے وہاں تھے۔ گورنر کی انسپکشن ٹیم کے چیئرمین کی حیثیت سے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیشہ ان کو سی وی میں دیکھا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا ''سر آپ یہاں کہاں''۔ بولے۔ ''میرا کام ختم ہو چکا ہے، سوچا کہ تمہاری مدد کروں۔ میں ادھر درختوں کے پیچھے کھڑا تمہاری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ کالونی کا دفاع کرنا چاہیے۔ تم سے کسی نے کہا ہے''۔ نہیں، مجھ سے کسی نے نہیں کہا۔ اگر بغیر آرڈر کے آدمی صحیح قدم نہ اٹھا سکے تو پھر ملٹری کالج میں پڑھنے اور آپ کے زیر تربیت رہنے کا تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سر اب آپ ہماری کمان سنبھالیں۔

''پھر''

پھر یہ ہوا کہ انہوں نے کل نفری کو تین سیکشنوں میں تقسیم کیا۔ دو سیکشن مجھے دیں اور ایک سیکشن کو ریزرو کے طور پر اپنے پاس رکھا۔ کوڈ سگنل یہ مقرر ہوا کہ اگر ہم مکتی باہنی کے حملہ آوروں کو مار بھگانے میں کامیاب ہوں تو سگنل کے طور پر ایک لمبا برسٹ پھر ایک چھوٹا برسٹ ماریں گے۔ لیکن اگر ہم مصیبت میں ہوں تو دو لمبے برسٹوں کے بعد ایک چھوٹا برسٹ ماریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ریزرو سیکشن کو لے کر ہماری مدد کو آئیں۔ ابھی میں اپنے آدمیوں کو لے کر سو قدم ہی گیا ہونگا کہ مکتیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ بھی اپنے پروگرام کے مطابق کالونی کی طرف جھپٹ کے آرہے تھے۔ یہ اچانک مڈبھیڑ ہمارے لئے اوران کیلئے غیر متوقع تھی چنانچہ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہمارے آدمی بڑے جوش میں تھے۔ بے تحاشا فائرنگ سے مکتی باہنی کے حملہ آور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس گڈمڈ فائرنگ سے بریگیڈئر صاحب کو دوسرا سگنل ملنے کا شبہ ہوا۔ چنانچہ وہ آ گئے۔ مکتی باہنیوں کی جو

شامت آئی وہ ادھر ہی بھاگے جدھر سے ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈوز نے انہیں گھیرا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ خاصا نقصان اٹھا کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ جب اس ہنگامے کا شور کم ہوا تو میں نے سنا کہ بریگیڈئر صاحب بری طرح مجھے پکار رہے ہیں، سر میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ وہ اس طرح مجھے ڈھونڈ رہے تھے جس طرح ماں اپنے کھوئے ہوئے بچے کو ڈھونڈتی ہے اور جب میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سر، آئی ایم آل رائٹ، تو بھی انہوں نے مجھے اس طرح بے چینی سے ٹٹول ٹٹول کے دیکھا جیسے یقین کر رہے ہیں کہ واقعی میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اللہ اکبر کیا انسان تھے۔

۱۵۲۰ محمد اعظم

لاہور میں گرفن انسٹی ٹیوٹ آل پاکستان باکسنگ کے مقابلے کراتا تھا۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں جو ٹیم لاہور اس ٹورنامنٹ میں حصہ لینے گئی تھی اس میں میں بھی شامل تھا۔ اس زمانے میں جنرل اعظم لاہور کے جی او سی تھے۔ انہوں نے ہمارے فائنل مقابلے دیکھے تھے اور آخر میں انعامات تقسیم کئے تھے انہوں نے ہماری ٹیم کو اپنے گھر چائے پر بلایا اور ہماری بڑی ہمت افزائی کی، ہمارے فائنل مقابلوں کو جالندھر میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر میجر جنرل عبدالرحمان نے بھی دیکھا تھا۔ بعد کو ان دونوں اصحاب نے کمانڈنٹ کو خطوط لکھے اور یہ بھی لکھا کہ لڑکے جسمانی لحاظ سے قدرے کمزور نظر آتے ہیں، ان کی خوراک کو بہتر بنایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کئے گئے۔ رفیق صاحب لڑکوں کی ہمت افزائی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اس موقع پر بھی جب ہماری باکسنگ ٹیم لاہور سے فاتحانہ آئی تو سارا کالج لائن اپ ہوا۔ اور نہر کے اس پار کالج کے بینڈ نے ہمارا استقبال کیا۔ کامیابیوں کو دوسرے بھی اچھالتے ہیں اور بہت زور سے اچھالتے ہیں لیکن ہر کوئی کرنل رفیق نہیں ہوتا۔ ان کا کام کھرا اور سچا تھا۔ ان کے جرنیل اور وی آئی پی لڑکے ہی تھے۔ یہ بات ہم سب کو خوب معلوم تھی کہ ہمارا کرنل شیر ہے کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ اصل میں یہی اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ بحثیت قائد کے

اتنے کامیاب ہوئے۔سب ماتحت خاص کر لڑکے اپنے مشاہدہ میں بہت تیز ہوتے ہیں وہ فوراً تہہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ حضور جو فرما رہے ہیں یا جو ڈرامہ کر رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔لڑکوں کی چھٹی حس کے ریڈار کی مار بہت دور تک ہوتی ہے۔اس زمانے میں کالج جہلم اسٹیشن کی باکسنگ میں حصہ لیتا تھا۔ فرسٹ پنجاب سنٹر اور چودہ پنجاب سنٹر کی بوائز کمپنیوں سے مقابلہ ہوتا تھا۔مجھے اب بھی یاد ہے کہ فرسٹ پنجاب کا سی او کرنل "مسکلے" تھا اور چودہ پنجاب کا "اسٹک لینڈ" جس کا ایک بازو تھا۔مجھے فلائی ویٹ میں لڑنا تھا اور ۱۶۸۶ لطیف کو جو آج کل آزاد کشمیر میں ڈی ایس پی ہے ہیوی ویٹ میں لڑنا تھا۔لطیف کسی تکنیکی بنا پر "ان فٹ" قرار دے دیا گیا اور ہیوی ویٹ کا ریزرو ۱۷۷۷ مقصود بھی کسی وجہ سے میدان میں نہ اترا تو ہمارے کوچ پی ٹی این سی او حوالدار پہلوان خان نے ٹی او کیپٹن اعجاز نبی خان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ٹیم کیپٹن ۱۳۹۵ ایس سی او، (اب بریگیڈیئر) امیر محمد خان، الگ پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن کیپٹن محمد اسماعیل صاحب کا الوداعی لنچ تھا۔کرنل صاحب نے لنچ کے بعد لڑکوں کو جمع کیا اور کہا "کل گیارہ فائٹ ہیں۔اگر ہم ہیوی ویٹ ہار بھی جائیں تو کم از کم ایک پوائنٹ مل ہی جائے گا۔بصورت دیگر دو پوائنٹ مخالف کو مل جائیں گے، جو ٹرافی کے نتیجے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ کالج کی عزت کا سوال ہے۔کوئی حوصلہ رکھتا ہو تو ہاتھ اٹھائے۔" کرنل صاحب نے کالج کی عزت کا نام لیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے ایک دم ہاتھ اٹھا دیا۔سب حیران کہ اعظم کو کیا ہوا ہے۔۱۰۵ سے ۱۹۰ میں لڑے گا۔ بہر حال بڑے زور کی تالیاں بجیں۔مختصر یہ کہ جب میرا نام اناؤنس ہوا "اعظم خان کے جی آر ان دی گرین کارنر" تو پھر بڑے زور سے تالیاں بجیں۔میرا مد مقابل صحیح معنوں میں ہیوی ویٹ تھا۔وہ ہاتھی کی طرح، ریڈ کارنر میں جھول رہا تھا۔ادھر میں تھا۔ ہلکا پھلکا۔خدا کی قدرت ہے کہ انتہائی خطرے کی حالت میں ایک فطری قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔میرے اندر وہ قوت پیدا ہو چکی تھی۔ بہر حال جونہی سیکنڈز آوٹ آف دی رنگ کی آواز آئی تو میں ہلکا ہونے کیوجہ سے تیزی سے مد مقابل کی

طرف جھپٹا اور پہلا مکا لگایا۔اس کے بعد جب مجھے چار دن کے بعد ہوش آیا تو میں سی ایم ایچ جہلم میں تھا اور رفیق صاحب پاس بیٹھے تھے۔کسی نے بعد کو مجھے بتایا کہ میرا پہلا مکا کھانے کے بعد میرے مدمقابل نے پیچھے ہٹ کر پورا پنچ مجھے مارا تھا جس کی قوت سے میں ہوا میں گیند کی طرح اچھلا تھا اور نیچے پتھر کی طرح آن پڑا تھا۔چونکہ ۱۴ پنجاب کے باکسنگ رنگ کا فرش سیمنٹ کا تھا۔اس پر اس طرح گرنے سے میرے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے عید کی چھٹیاں وہیں سی ایم ایچ میں گزاری تھیں۔اس واقعہ کو میں نے اپنی جرأت کی مثال کے طور پر نہیں بلکہ رفیق صاحب کی تربیت کی قوت و تاثیر کی مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔انہوں نے میری طرح بے شمار طلبہ کی سوچ کا رخ بدل دیا۔ ان کے جذبوں کو ایک سمت دی۔ انہیں اپنی ناک سے آگے دیکھنا اور اپنے مفاد سے بلند ہو کر سوچنا سکھایا۔اس لحاظ سے انکا شمار قوم کے معماروں میں ہوتا ہے۔یہ رفیق صاحب کی تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ملٹری کالج کے اولڈ بوائز میں پاکستان سے وابستگی و وفاداری کا جذبہ بہت پختہ اور قوی ہے۔اب میں ان کی جرأت اور حوصلہ کی ایک مثال دیتا ہوں۔ جنرل ایوب سالانہ تقریب تقسیم انعامات پر تشریف لائے تھے۔ وہ فنکشن اس جگہ ہوا تھا جہاں آج موسیٰ ہال ہے۔میں آ کنلک ہاؤس کا ہاؤس پریفیکٹ تھا۔ میری ڈیوٹی ایم پی کی تھی یہ کہ سی ان سی کی کار کے سوا کسی اور کار کو پریڈ گراؤنڈ میں نہ جانے دوں۔ باقی سب کاروں کو کمانڈنٹ کے دفتر کے پیچھے جو کار پارک بنایا گیا تھا۔وہاں کھڑا ہونا تھا۔میں ان احکامات کے مطابق اسٹار کاروں کو بھی جنرل کار پارک کی طرف ہاتھ دے کر بھیجتا رہا۔ جب ایجوٹینٹ جنرل میجر جنرل شیر علی کی کار پہنچی تو اس کو بھی میں نے یہی سگنل دیا کہ کار ادھر لے جائی جائے۔انہوں نے اشارہ سے مجھے بلایا کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا ''سر سوائے سی ان سی کی کار کے کسی اور کار کو براہ راست گراؤنڈ میں نہیں جانا ہے۔'' انہوں نے کہا ''دیکھتے نہیں میں کون ہوں''۔ میں نے عرض کیا۔'' سر، آپ جنرل ہیں لیکن مجھے جو حکم ملا ہے میں اس کی پابندی کروں گا۔'' وہ بہت جھلائے۔''پوچھا تمہارا

نام کیا ہے''۔ میں نے بتایا ۱۵۲۰ محمد اعظم ۔۔۔کار تو خیر انہوں نے کار پارک میں کھڑی کرادی لیکن سخت برہمی کی حالت میں گراؤنڈ تک پہنچے اور رفیق صاحب سے شکایت کی کہ کوئی کیڈٹ اعظم وہاں کھڑا ہے بہت بدتمیز ہے۔اس نے یہ کیا ہے۔رفیق صاحب نے جواب میں صرف یہ کہا ''سر، یہ اس کا قصور نہیں، میرا حکم یہی تھا''۔ جنرل صاحب بہت جز بجز ہوئے۔لیکن رفیق صاحب نے پوری ذمہ داری خود قبول کر لی۔ایسے موقعوں پر عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

ملٹری کالج کے طلبہ کو وہ اپنی اولاد کی طرح بلکہ شاید اس سے زیادہ چاہتے تھے اور ان کے خلاف وہ کوئی بات نہیں سن سکتے تھے۔یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب وہ کھاریاں میں کرنل ایڈم تھے۔کھاریاں کلب کی بار میں ایک غیر ذمہ دار لیفٹیننٹ کرنل نے نشہ کی ترنگ میں ملٹری کالج کے لڑکوں کے کردار کے متعلق کوئی نازیبا فقرہ کہا۔رفیق صاحب خود سرور کے عالم میں تھے یہ فقرہ سنتے ہی وہ جلال میں آ گئے اور اس کو انگیٹھی میں دے مارا کہ لوگوں کو چھڑانا مشکل ہوگیا۔بار بار کہتے تھے، ''دے آر مائی سنز۔دے آر مائی سنز''۔وقت کے بڑے پابند تھے۔یکا یک اطلاع ملی کی ڈرائینگ ماسٹر حکیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔فوراً رک گئے، ان کے سی ایم ایچ میں داخلے کا انتظام کیا اور دوسری امداد بھی کی۔میٹنگ میں اطلاع دی کہ چند منٹ دیر میں آ ؤں گا۔

کالج میں سردیوں کی صبح کی پی ٹی ہمشہ عذاب سمجھی گئی ہے لیکن جب ہم دیکھتے تھے رفیق صاحب گھوڑے پر سوار ہمارے ایسے کپڑوں میں ملبوس پی ٹی گراؤنڈ میں پہلے سے انتظار کر رہے ہیں تو ہمیں اپنے ساتھ زیادتی کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔بریگیڈئر رفیق کی سختی مشہور رہی ہے۔اپنے تجربے کی بناء پر یہ تبصرہ کروں گا کہ یہ سختی ذاتی نہیں اصولی تھی، اور یہ بھی کہ یہ سختی بے لچک نہیں لچکدار تھی۔ان میں یہ جرأت بھی تھی کہ ایک کیڈٹ کی بات سنیں اور قائل ہو کر اپنے فیصلے میں ترمیم کریں اور سزا دیں تو تعلق کے ساتھ، لاتعلق ہو کر نہیں۔اس تمہید کے بعد اب وہ قصہ سناتا ہوں جس نے میری زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے اور

جس نے مجھے بریگیڈئر رفیق کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۶ء کا ہے میں آ کنلک ہاؤس کا پریفیکٹ تھا۔اور کیپٹن (بعد میں کرنل) این ڈی احمد ہاؤس ماسٹر تھے۔گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد میں جس شام واپس کالج پہنچا اسی رات دوسرے شو میں فلم دیکھنے کیلئے میں ہاؤس سے کھسک گیا۔۴۶ سے ۵۶ تک دس سال میں نے کالج میں پورے ڈسپلن سے گزارے تھے اب جب کہ میں آئی ایس ایس بی کی کال کا انتظار کر رہا تھا اور کالج میں چند دنوں کا مہمان تھا، مجھ سے یہ چھکا لگ گیا۔اس زمانے میں کوئی چھکا کیا چوکا بھی لگائے اور اس کی تاج پوشی (بید کی سزا) نہ ہو نا ممکن سی بات تھی۔ بہرحال میری غیر حاضری احمد صاحب نے پکڑ لی اور صبح رفیق صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ان کا اصول یہ تھا کہ بڑی مچھلی کو ہرگز نہ چھوڑا جائے۔ بہرحال ان کا فیصلہ یہ تھا کہ پبلک کیننگ ہوگی۔ میں نے کہا سر، مجھے کچھ کہنے کی اجازت ملے، یہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے والی بات تھی۔ خلاف توقع انہوں نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا اور ساتھ ''یس'' کہہ کر مجھے کچھ کہنے کا موقعہ دیا۔ میں نے کہا ''سر، آپ میرا دس سال کا ریکارڈ دیکھ لیں مجھے کیننگ کبھی نہیں ہوئی''۔ انہوں نے فرمایا۔''اعظم میں تمہیں جانتا ہوں۔ہاؤس پریفیکٹ ہو کر تم نے یہ غلطی کی ہے۔اس لئے تمہاری پبلک کیننگ ہوگی۔ زیادہ ذمہ داری کے اصول کے تحت''۔ میں نے عرض کیا۔'' مجھے غلطی سے انکار نہیں سزا کا مستحق بھی ہوں۔ میں سزا معاف کر دینے کیلئے نہیں کہہ رہا۔آپ سزا دیں ضرور دیں۔اپنے ہاتھ سے ماریں لیکن پبلک کیننگ۔سارے کالج کے سامنے بید کھانا میں برداشت نہیں کر سکتا۔بے شک آپ میرا نام کمیشن سے نکال دیں، کالج سے فوراً نکال دیں، لیکن یہ نہیں، سر، ہرگز نہیں''۔ کیپٹن احمد سناٹے میں تھے۔خود ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا دوسرا جاتا تھا۔ ان کی خاموشی سے حوصلہ پا کر میں اپنے دفاع کا آخری تیر چھوڑ دیا۔'' سر، میں آپ ہی کے سکھائے ہوئے اصول کی بناء پر کہہ رہا ہوں''۔ ''وہ کیسے؟'' ''سر، آپ نے ہمیں آنر کا احساس دیا ہے۔ میں اپنی عزت نفس کا تحفظ چاہتا ہوں، سارے کالج کے سامنے کیننگ گویا میری خودی کو ختم کرنا ہے۔'' ''یہ

کہہ کر میں تو چپ ہو گیا۔ احمد صاحب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ بچّو، اب خیر نہیں۔لیکن چند لمحوں کے توقف کے بعد رفیق صاحب نے جو کہا۔ وہ یہ تھا۔ ''میں اتفاق کرتا ہوں''۔ انہوں نے مجھے سزا ضروری دی۔لیکن اپنے آفس میں اور اپنے ہاتھ سے۔اپنے پچھلے فیصلہ کو انہوں نے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بدقسمتی سے جب میں کمیشن کیلئے منتخب نہ ہوا تو اس کا دکھ مجھ سے زیادہ انہیں تھا۔ اب مسئلہ میرے لئے متبادل کیریر کا تھا۔اس کی تدبیر بھی انہوں نے خود کی۔اس زمانے میں پاکستان تمباکو کمپنی جہلم کی بنیاد پڑ رہی تھی اور اس کے انگریز پروڈکشن ڈائریکٹر سے ان کے کچھ تعلقات تھے۔ اس سے انہوں نے صرف یہ کہا۔اس نوجوان کو پہلے پرکھ لیں پھر نوکر رکھیں۔ چنانچہ میں نے امتحان دیا، انٹرویو دیا۔ یہ امتحان میرے لئے جو رفیق صاحب کے زیر نگرانی کمیشن کی تیاری کر چکا تھا، بچوں کا کھیل تھا۔ تقدیر نے یاوری کی اور انٹرویو بورڈ نے سفارش کی کہ اس میدوار کو آفیسر کیڈر میں تربیت پانے کا موقعہ دیا جائے۔اس کورس کیلئے عموماً بی ایس سی منتخب کئے گئے تھے۔ پروبیشن آفیسر کا یہ ڈیڑھ سال کا کورس میں نے بہت کامیابی سے مکمل کیا۔اس میں میرا نہیں کالج اور رفیق صاحب کا بڑا رول تھا۔ وہ ہر مہینے کراچی میرے کورس ڈائریکٹر کو پابندی سے خط لکھتے تھے اور میری پروگریس رپورٹ لیتے رہتے تھے۔ جب رفیق صاحب کا خط جاتا تو میرا ڈائریکٹر مجھ سے کہتا مسٹر اعظم تمہارے کرنل کا پھر خط آیا ہے۔ایک روز مجھ سے پوچھنے لگا۔کرنل سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔ میں نے کہا صرف شاگرد ہوں۔ یہ سن کر وہ بہت حیران ہوا۔ کہنے لگا میرے پاس ۱۰ آفیسرز زیر تربیت ہیں ان کے تو والدین نے بھی کبھی نہیں پوچھا۔میں نے اس سے بڑے فخر سے کہا۔'' جناب ملٹری کالج، ملٹری کالج ہے اور رفیق صاحب رفیق صاحب ہیں''۔جس زمانے میں منگلا ڈیم بن رہا تھا۔ رفیق صاحب منگلا کلب میں بیٹھے تھے۔کسی نے پاکستان کے خلاف کچھ کہا رفیق صاحب بھپر گئے۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء میں جہلم کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ بڑی سزائیں دیں غلط کار کو تو چھوڑتے ہی نہیں تھے۔

ایک واقعہ اس زمانے کا ہے جب وہ گھوڑا گلی کالج میں پرنسپل تھے۔ پی ٹی سی جہلم کے ایک سپروائزر ملک رمضان کو شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو گھوڑا گلی میں داخل کروائیں۔ کسی نے کہا صاحب کس چیز پر ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ کالج امیروں، افسروں، جرنیلوں کا ہے آپ مزدور ہو کر یہ کہاں کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یوں کام نہ بنے گا کسی وزیر کو بیچ میں ڈالئے زمانہ بھی ایسا ہی ہے۔ ملک رمضان کے سیاسی لنکس بھی تھے، برسراقتدار جماعت پی پی میں کچھ اثر رسوخ تھا۔ قیوم بٹ کے پاس راولپنڈی پہنچے اور بڑے سے بڑے افسروں سے کہلوایا لیکن رفیق صاحب نے کہا۔ ''لڑکے کو عام راستے سے آنا پڑے گا۔ میں بیک ڈور سے داخلہ نہیں کیا کرتا۔'' ملک رمضان نے تھک کر بلکہ عاجز ہو کر مجھ سے تذکرہ کیا۔ میں نے کہا میں انہیں جانتا ہوں دباؤ میں وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔ ان سے سفارش کرنا بیکار ہے۔ آپ سیدھے راستے چلیں تو شاید کام بن جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب لڑکا منتخب ہو گیا تو انہوں نے ملک رمضان کو اندر بلوایا۔ ملک صاحب آپ نے خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا۔ لڑکا ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیاقت سب سے بڑی سفارش ہے۔ تھوڑی سی رعایت جو میں نے کی ہے وہ اس وجہ سے کہ آپ ایک پسماندہ علاقہ سے آئے ہیں اور مزدور ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ عام لوگوں کے بچے بھی یہاں آئیں۔ یہ رفیق صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اس دور کے ملٹری کالج کی جو امیج بنی ہے وہ یہ ہے کہ جو ایم سی کا ہوگا وہ محنتی ہوگا، قوم کا درد رکھتا ہوگا، اور یہ کہ پتے باز نہ ہوگا، صاف اور کھری بات منہ پر دے مارے گا خواہ کسی کو اچھی لگے یا بری۔ زمانہ سازی کی لچک عالمگیریز میں نہیں ہوتی۔ اس ذہن اور سوچ سے عالمگیریز نے اکثر و بیشتر نقصان بھی بہت اٹھائے ہیں۔ ان کے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے ۱۸۲۱ء ظہور شوکت کے ساتھ میں انہیں دیکھنے سی ایم ایچ لاہور گیا۔ اس وقت آکسیجن لگی ہوئی تھی ہمارے چہرے مہرے سے کچھ فکر کے آثار نظر آئے ہوں گے۔ انہوں نے کہا۔ ''کرنل ارشد بہت کوشش کر رہے ہیں۔ میں بھی علاج میں ان کے ساتھ تعاون کر رہا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میں اپنی اننگز کھیل چکا ہوں۔ میں آخری

سیٹی کیلئے پوری طرح تیار رہوں۔تم لوگوں سے مجھے یہی کہنا ہے کہ جرأت سے،محنت سے ، دیانت سے کام کرتے رہو، ملک کے مفاد کو سامنے رکھو، کوئی ظلم نہ کرنا، بد دیانتی نہ کرنا، آخر میں یہ چیز خود اپنی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے کسی اور کو تکلیف دینا اصل میں اپنے آپ کو تکلیف دینا ہے''۔

وہ دم دم واپسیں تھا۔اس کے باوجود وہ اولڈ بوائز کی باتیں کر رہے تھے۔میرے منہ سے نکل گیا سر آپ کی تربیت نے آپ کے شاگردوں کیلئے مشکلیں بہت پیدا کر دی ہیں، جھکنا آتا نہیں،ٹوٹنے سے نقصان ہوتا ہے۔ یہ سن کر بجھتی ہوئی آنکھوں میں ایک بار پھر چمک پیدا ہوئی اور کہا کہ آزمائش انسان کی تقدیر ہے۔پھر دہرایا،''انسان کی ذمہ داری محدود ہے اس کے اختیار تک''۔ ان کی اکھڑتی سانس نے انہیں مزید کچھ کہنے کا موقعہ نہیں دیا۔ورنہ اس وقت ان پر ایک گھمبیر عارفانہ کیفیت طاری تھی۔کچھ دیر کے بعد کہا، ''میرے بچو معاشرے کا حال مجھے بھی معلوم ہے۔مجھے احساس ہے کہ لوگوں کی قدریں کتنی بدل گئی ہیں۔ایک ماہ پہلے خود میرے ساتھ جو ہوا وہ سنو۔میرے ایک پرانے کرنل دوست نے مجھ سے کہا کہ فلاں ڈاکٹر سے (اب میں نام نہ لوں گا) جو میڈیسن کا پروفیسر ہے،آپ مشورہ کریں بلکہ خود انہوں نے اس ماہر پروفیسر کو فون کیا اور وقت لیا۔بعد کو پتہ چلا کہ یہ پروفیسر ایکس اے ایم سی کیپٹن تھا۔ وہ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں باغ میں، میرے ماتحت کام کر چکا تھا۔اس وقت ٹھیک ٹھاک تھا۔بہر حال میں اس کے کلینک گیا۔اب آگے سنو اس نے مجھے پہچانا تو ضرور لیکن پہلا سوال یہ پوچھا۔آپ نے فیس جمع کروادی ہے۔مجھے غلطی کا احساس ہوا میں نے نواسے سے کہا فیس جمع کرا دو۔پھر اس شخص نے مجھے دیکھا۔بتانے کی بات یہ ہے کہ میں نے اس کا برا نہیں مانا۔فیس اس کا حق تھا۔جو اس نے لیا۔لیکن مروت اس کا اختیار تھا جو اس نے استعمال نہیں کیا۔قدریں جو بدل گئی ہیں۔بہر حال ہمیں اپنی سعی کرتے رہنا چاہیے۔"

"ڈوبتے سورج کا یہ منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

۱۵۵۲ء بریگیڈئر محمد مشتاق

"مشتاق پہلے تو آپ پنے بارے میں کچھ بتائیں"

سر، میں کالج میں اگست ۱۹۴۶ء میں داخل ہوا تھا۔۱۹۵۳ء میں پی ایم اے کے لئے منتخب ہوا۔اس طرح کالج میں سات برس گزارے اور رفیق صاحب کا کالج میں پہلا دور دیکھا۔اب جو کچھ ہوں آپ کے سامنے ہوں۔تیس برس سے اوپر وردی پہنے ہوئے ہو گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس عرصے میں کیسے کیسے تجربات ہوئے ہوں گے اور کیسے کیسے لوگوں کو دیکھا ہو گا۔

"اب اس پس منظر کے ساتھ آپ کا تاثر رفیق صاحب کے بارے میں کیا ہے"۔

رفیق صاحب نے جو کچھ کالج میں کیا اس کی نوعیت TACTICS یعنی سطحی تدبیروں کی نہیں بلکہ STRATEGY یعنی دوررس نتائج کی حامل تدابیر کی تھی۔TACTICAL اقدامات کے اچھے یا برے نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں۔لیکن STRATEGIC اقدامات بہت بڑی چیز ہوتے ہیں۔رفیق صاحب نے کالج کے مزاج اور فضا کو بدلا۔وہ بنیادی طور پر STRATEGIC تبدیلی تھی۔اس کے مثبت اثرات برسہا برس کے بعد ان کے طلبہ کے کردار، کارکردگی اور لائف سٹائل میں ظاہر ہوئے۔میں سمجھتا ہوں کہ رفیق صاحب کا سب بڑا CONTRIBUTION یہی ہے۔اور ہمارے لئے اشارہ بھی یہی ہے کہ تعمیری کاموں میں بنیادی اہمیت STRATEGIC سمت کی ہوتی ہے۔ورنہ لوگ اصلاح شروع کرتے وقت ضمنی اور فروعی کاموں میں الجھ جاتے ہیں۔ترجیحات کا صحیح تعین نہ ہونے سے بات نہیں بنتی۔

"مشتاق ماشاءاللہ آپ نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔اب دو ایک ایسے واقعات بھی سنایئے جن سے ان کے کردار کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔"

آپ کو یاد ہو گا اس زمانے میں ایف اے سی سی (فائن آرٹس اینڈ کلچرل سنٹر) بہت "ایکٹو" تھا۔حیدری

صاحب اس کے ڈائریکٹر تھے۔ ایف اے سی سی کے تحت فوٹو گرافی کلب بھی تھا۔ میں اس کلب کا انچارج تھا۔

ایک بار میں نے کالج ڈرامے کی تصاویر ایف اے سی سی کے باہر بورڈ پر لگا دیں کہ جس کو جس تصویر کی ضرورت ہو وہ حوالہ نمبر دے کر آرڈر دے دے۔ رفیق صاحب نے کچھ تصویروں کا مجھے آرڈر دیا۔ میں اس بات سے بڑا خوش ہوا کہ کمانڈنٹ صاحب نے مجھے آرڈر دیا ہے۔ چنانچہ میں نے وہ تصویریں تیار کیں اور خود ہی لے کر ان کے دفتر میں پہنچ گیا۔ تصویریں پیش کیں اور بڑی سادگی سے کہا۔ "سر یہ تصویریں گیارہ روپے کی ہیں" انہوں نے فوراً پرس ڈھونڈا جو اتفاق سے ان کے پاس نہیں تھا۔ کہنے لگے۔ "مشتاق میں تمہارا گیارہ روپے کا مقروض ہوں، میں ابھی بھجوادوں گا"۔ یس سر کہہ کر میں واپس آ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ان کا اردلی گیارہ روپے دے گیا۔ جب شام کو یہ قصہ میں نے حیدری صاحب کو سنایا تو بہت حیران اور کچھ پریشان ہوئے کہ یہ میں نے کیا کیا۔ لیکن کرنل صاحب نے میری اس معصومانہ گستاخی کو نظر انداز کر دیا بلکہ الٹی حیدری صاحب سے میری تعریف کی۔ وہ بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ ان کے دور میں ہمیں اپنے آفیسر ہونے کا احساس ہوا۔ ایف اے سی سی ہی سے متعلق ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔

"وہ کیا ہے"

"ایف اے سی سی کی طرف سے حیدری صاحب کوئی انگلش ڈرامہ کر رہے تھے۔ غالباً INVISIBK DUKE تھا۔ اس کے لئے ڈنر سوٹ وغیرہ بہت سے ملبوسات کی ضرورت تھی۔ یہ چیزیں کہاں سے آئیں۔ حیدری صاحب نے ان سے تذکرہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ میرے کمرے میں جاؤ اور وارڈ روب کھولو اور جو سوٹ پسند آئے لے آؤ۔ چنانچہ میں تین سوٹ لے آیا۔ ڈرامے کے بعد ہم نے ان کے کپڑے بہت احتیاط سے استری وغیرہ کروائے اور میں ان کو واپس کرنے ان کے بنگلے گیا۔ انہوں نے

فوراً اپنے اردلی سردار خان کو آواز دی اور کہا کہ ان کپڑوں کو ڈرائی کلین کروانے دے دو۔ لباس کے معاملے میں وہ انتہائی نفاست پسند تھے لیکن کالج سے بڑھ کر انہیں کوئی چیز عزیز نہیں تھی۔

ایک اور واقعہ آئی ایس ایس بی کے سامنے جانے سے پہلے کا ہے۔ انہوں نے ہم سینئیر کیڈٹس کو بریفنگ کے لئے بنگلے پر بلایا۔ مجھے یاد ہے ڈرائنگ روم کی انگیٹھی پر صرف قائداعظم کا فوٹو تھا۔ احمد جان اور صادق بھی میرے ساتھ کھڑے تھے۔ چائے کے بعد جو افتتاحی تقریر انہوں نے شروع کی تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ کھڑے کھڑے ہمارا برا حال ہو گیا لیکن وہ جاری تھے۔ موضوع پاکستان تھا اور ایک پاکستانی افسر کا رول۔ کالج کو واضح طور پر نیشنل آوٹ لک رفیق صاحب نے دیا۔"

" کالج سے جانے کے بعد بھی کبھی ان ملاقات ہوئی یا تعلق رہا؟"

"جی ہاں وہ ۱۹ پنجاب کمان کر رہے تھے تو میں ۲ پنجاب میں ایجوٹینٹ تھا۔ ان کے ٹروپس ان پر جس طرح جان دیتے تھے اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں ایک مثالی سپاہی کہا جا سکتا ہے۔ ایکسرسائز میں وہ سب سے آگے ہوتے تھے اور مورچہ کھودنے سے لیکر کوئی کام ہو وہ اپنی پلٹن کے ہر جوان اور افسر سے پہلے اور اچھا کرتے تھے۔ آخر میں، میں نے انہیں انٹیلی جنس اسکول مری میں سنا تھا۔ بولنے میں بھی کمال حاصل تھا مجھے ان کی جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا پاکستانیت پر زور تھا۔"

۱۵۵۹ اے ڈی (اللہ داد) خان

"اے ڈی، اچھا ہوا تم سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ آپ اور موجود دو ایسے اولڈ بوائے ہیں جنہوں نے برگیڈئر رفیق کو یہاں شاگرد کی حیثیت سے اور لارنس کالج میں رفیق کار کی حیثیت سے دیکھا۔ اس لئے تم لوگوں کے مشاہدات اور تاثرات وزن رکھتے ہیں۔ موجود سے تو گفتگو ہو چکی ہے اچھا ہوا تم بھی مل گئے۔"

سر یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے ایک استاد سے اپنے دوسرے عظیم استاد کے بارے میں کچھ عرض

کروں۔

"اے ڈی کچھ واقعات سناؤ۔نتائج پڑھنے والے خود نکال لیں گے۔ہم نے اس کتاب میں سیرت نگاری کا یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔"

سر، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ۷۳ء میں بریگیڈئر رفیق لارنس کالج آئے تو میری ان سے راہ ورسم وہاں کے ایک استاد کے حوالے سے زیادہ ان کے ایک پرانے شاگرد کے رشتے سے پیدا ہوئی اور اسی حوالے سے میرا ان کے ہاں آنا جانا ہوا۔ وہ میری بیوی کو بیٹی کہتے اور مجھ پر ایک باپ کی طرح شفقت کرتے تھے۔ہم استادوں کو ان کے دور میں کم ہی فرصت ملتی تھی البتہ میری بیوی اکثر ان کے ہاں جاتی رہتی تھی۔ان دنوں ان کی چھوٹی بیٹی رضیہ بیگم ان کے ساتھ ہی فروکش تھیں۔

ایک دن شام کو میں ذرا دیر سے پہنچا تو میری بیوی نے کہا، آج آپ نے پھر دیر کر دی میں بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی میں نے کہا خیر تو ہے۔تو بیوی نے بتایا کہ آج رضیہ باجی کی طبیعت ایک ہفتے سے خراب ہے۔اباجی کو کچھ ہوش نہیں وہ صبح کے گئے رات کو واپس آتے ہیں۔رضیہ باجی کو فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیئے۔میرے ذہن میں فوراً ڈاکٹر خورشید شبیر کا نام آیا جن کا کلینک پنڈی میں تھا۔اور جن سے ہماری کچھ رشتہ داری بھی تھی۔میں دوسرے دن صبح سویرے بریگیڈئر صاحب کے دفتر میں گیا اور کہا اس وقت میں آپ کے پاس ایک شاگرد بیٹے کی حیثیت سے آیا ہوں۔بولے ایسی کیا بات ہے۔میں نے کہا اگر آپ اجازت دیں تو بہن رضیہ کو ڈاکٹر خورشید کو دکھادوں۔خورشید سے ہماری کچھ عزیزداری ہے۔یہ میجر خوشحال خان کی بہو ہیں اور پنڈی کی مشہور لیڈی ڈاکٹر۔مختصر یہ کہ وہ میرے ضد کرنے پر بمشکل راضی ہو گئے۔بار بار کہتے تھے تم تکلیف کیوں کرتے ہو میں ہی کچھ انتظام کرتا ہوں۔جب اجازت دی تو یہ بھی کہا کہ پیریڈ پڑھا کے جانا۔چنانچہ میں سارے پیریڈ لے کر دو ڈھائی بجے مری سے روانہ ہوا۔گرمی کے دن تھے پنڈی پہنچا تو ڈاکٹر صاحبہ آرام کر رہی تھیں۔میجر خوشحال خان سے صورتحال بیان کی۔اتنے

میں کیپٹن شبیر بھی آ گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر خورشید کو سوتے سے اٹھایا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ خدا ان کا بھلا کرے وہ فوراً گھوڑا گلی چلنے کو تیار ہو گئیں۔ انہوں نے رضیہ باجی کو دیکھا اور کچھ دوائیں دیں لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کی سی ایم ایچ مری میں داخل کر دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ اب خاصی شام ہو چکی تھی۔ بریگیڈئر صاحب ابھی تک دفتر میں موجود تھے۔ میں نے انہیں فون کیا کہ آپ ڈاکٹر صاحبہ سے خود مل لیں۔ تب کہیں جا کر وہ آئے اور پھر رضیہ باجی کو ہسپتال داخل کیا گیا۔

"سر، بریگیڈئر صاحب کے DEVOTION کی یہ تنہا مثال نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں تو روز ہوتی رہتی تھیں۔"

"مثلاً"

مثلاً یہ کہ وہ اوپر جونیئر اور پریپ سکول میں ہر وقت جاتے اور پیدل جاتے تھے۔ گاڑی پاس تھی اور گاڑی اوپر جا سکتی تھی لیکن وہ ایک چھڑی لے کر چل کھڑے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہیں سانس کی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ چڑھائی چڑھنے سے ان کی سانس پھول جاتی تھی لیکن جاتے ضرور تھے۔ اگر کسی نے کہا کہ تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے تو کہتے کالج کو فٹ پرنسپل چاہیے۔ یہ بیماری میرا ذاتی مسلئہ ہے۔

"ان کی سخت گیری کے بارے میں تمہارا کیا تاثر ہے"

اصولوں میں وہ سخت گیر بھی بہت تھے۔ ان کی بنیادی وفاداری قوم کے مفاد سے تھی۔ قومی مفاد میں ،اجتماعی مفاد میں وہ غلط کار فرد کو قربان کر دینے سے ذرا برابر نہیں ہچکچاتے تھے۔

"اس کی مثال!"

بریگیڈئر صاحب کے آنے سے پہلے وہاں کچھ نقل لگانے کا سلسلہ بھی تھا۔ انہوں نے آتے ہی اس کا سد باب کیا اور وارننگ دی کہ اب کوئی نقل لگاتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے فوراً نکال دیا جائے گا۔ جون ۱۹۷۴ء میں، میں منسٹری آف ایجوکیشن میں نئی ملازمت پر اسلام آباد جا رہا تھا۔ کوئی دو بجے کا وقت

تھا۔میں نے دیکھا کہ تین بچے ان کے دفتر کے باہر بیٹھے تھے۔پتہ چلا کہ نقل کے کیس ہیں۔مجھے خیال آیا کہ ان غریبوں کو نقل لگانے کی پرانی عادت ہے چھٹتے چھٹتے چھٹے گی۔ان کو یوں نکال دینا اچھا نہ ہو گا۔مجھے بڑا مان تھا کہ میں ان کا شاگرد اور رفیق کار ہوں میری بات مشکل سے ٹالیں گے۔میں نے ڈرتے ڈرتے بات چھیڑی کہ سر یہ لڑکے، ابھی میں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ وہ جلال میں آگئے، کہنے لگے۔"اے ڈی تم ان کی سفارش کرنے چلے ہو، رحم کھانے چلے ہو، تم ادارے پر رحم نہیں کھاتے۔" پھر جناب وہ ناراض ہوئے کہ بس۔۔۔ان کی سختی اصولی تھی ذاتی نہیں۔

"اے ڈی۔آخری سوال کہ لارنس کالج میں ان کی ملٹری بیک گراؤنڈ کی وجہ سے لوگوں کے احساسات کیا تھے۔"

سچی بات یہ ہے کہ خاصے خدشات تھے۔ان کی سختی کی داستانیں مبالغے کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔لوگوں کا خاص خدشہ یہی تھا۔کہ لارنس کالج ایک پرانا پبلک اسکول ہے۔اس کی اپنی روایات ہیں، مزاج ہے، کہیں وہ ملٹری کا ریجی مینٹیشن نہ شروع کر دیں۔اساتذہ میں بھی یہ احساس تھا۔

"تو پھر کیا ہوا۔"

اساتذہ کی غلط فہمیاں تو ان کے پہلے لیکچر سے ہی دور ہو گئیں۔جب دو گھنٹے تک وہ پبلک سکول سسٹم اور اس میں اساتذہ کے رول پر نہایت وضاحت سے بولے تو بڑے بڑے افلاطون سناٹے میں آ گئے۔بعد کو طلبہ اور دوسرے سٹاف کو تجربہ ہو گیا کہ اصل ماہر تعلیم تو یہ ہیں۔میں جون ۷۴ء میں کالج کو چھوڑ آیا تھا۔بعد کو پتہ چلا کہ لارنس کالج کو پاکستانیت کا آب و رنگ دینے میں انہوں نے بہت اہم کام کیا۔میں اب وزارت تعلیم میں ہوں۔اکثر یونیسکو کے شعبے سے ہر روز بڑے بڑے ماہر تعلیم حضرات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ملک سے باہر بھی اکثر جاتا رہتا ہوں۔اس تمام تجربے کے پس منظر میں، میں یہ کہتا ہوں کہ بریگیڈئر رفیق کی تعلیم و تربیت کے اسرار و رموز پر بڑی گہری نظر تھی اور سب سے بڑی بات یہ

کہ پاکستانیت کا گہرا شعور رکھتے تھے اور تربیت کی ٹیکنالوجی وضع کرنا جانتے تھے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۵۸۰ کرنل محمد گلستان

میری بریگیڈئر رفیق صاحب کی یادیں ان کے پہلے دور کی ہیں۔ان کے دوسرے دور کو بمشکل دیکھ سکا۔میرا پہلا تاثر ان کی کمانڈنگ شخصیت کا ہے۔ بہت سے لوگ کمانڈنگ افسر ہوتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کمانڈنگ نہیں ہوتی۔ رفیق صاحب کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی ظاہری شخصیت بھی متاثر کن تھی۔ان کے چہرے مہرے سے بھی قوت کا اظہار ہوتا تھا۔ان کے لباس اور ٹرن آؤٹ کے بارے میں دوسرے اولڈ بوائز نے بھی لکھا ہوگا اور شاید کسی نے یہ بھی بتایا ہو کہ لڑکوں میں ان کا نک نیم "ٹو" تھا کیونکہ انکی بوٹوں کی ٹو اتنی چمکتی تھی کہ اس میں شکل نظر آتی تھی۔لڑکے حیران ہوتے تھے کہ وہ کس طرح پالش کرواتے ہیں کہ بوٹوں پر اتنی چمک آجاتی ہے۔یار لوگوں نے اس موضوع پر اچھی خاصی خیالی ریسرچ کر رکھی تھی۔

اُس وقت تو نہیں لیکن اب سمجھتا ہوں کہ ٹرن آؤٹ کا اتنا اہتمام اور وقت کی اتنی پابندی ان کی شخصیت اور سوچ کے ظاہری مظاہر تھے۔ان کے حوالے سے ان کی پوری شخصیت کو سمجھنا چاہیے۔

ایک واقعہ ۱۹۶۰ء کے بعد کا یاد آ رہا ہے۔ وہ جی ایچ کیو میں تعینات تھے۔ میں کسی کام سے ان کے دفتر میں جا نکلا۔ چونکہ انہوں نے مونچھیں رکھ لیں تھیں اور بدن کسی قدر بھاری ہو گیا تھا۔ میں انہیں پہچان نہ سکا لیکن مجھے انہوں نے فوراً پہچان لیا اور دیکھتے ہی نام اور نمبر سے پکارا "ہیلو ۱۵۸۰ گلستان ہاؤ آر یو۔" نام اور نمبر سے پکارنا صرف حافظہ اچھا ہونے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ اس دلچسپی اور محبت کی وجہ سے تھا جو پاکستان کے حوالے سے انہیں اپنے سب طلبہ سے تھی۔

آخر میں ایک واقعہ اپنے بھائی حسن اختر کی طرف سے لکھتا ہوں انہوں نے ایک بار مجھے بتایا کہ میں ایک

باران کی لارنس کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں ان کے پاس گیا۔ کسی عزیز کے بچے کے داخلے کا مسلئہ تھا۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ اسے انگلش میڈیم کے معیار پر پورا اترنا ہوگا۔ با مروت وہ بے انتہا تھے لیکن اصولوں کے معاملے میں نہیں۔

۱۵۷۹ میجر محمد صادق

جب ۱۹۵۲ء کے وسط میں کرنل رفیق کالج کے کمانڈنٹ بن کر آئے تو میں کمشن کے لئے تیاری کر رہا تھا اس لئے ان کے زیر قیادت وقت گزارنے کا مجھے بہت تھوڑا موقع ملا لیکن جو وقت ملا اسے میں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ ان کا پہلا دور تازہ ہوا کا ایک جھونکا تھا۔ جس نے کالج کے شب و روز بدل دیئے۔ اس دور میں کالج نے صحیح معنوں میں پاکستانیت کی فضا میں سانس لی۔ ورنہ اس سے پہلے کالج کی ڈگر وہی تھی جو ماقبل تخلیق پاکستان تھی۔ انہوں نے آتے ہی جو انقلابی اقدامات کیے ان کا لب لباب یہ تھا کہ لڑکوں کو بوائز کمپنی کی سطح سے اٹھا کر صحیح معنوں میں کیڈٹس یا انڈر آفیسرز کی سطح پر لایا جائے۔ چنانچہ وہ تمام کام جن سے بوائے کمپنیت کی بو آتی تھی انہوں نے یک قلم موقوف کر دیئے۔ مثلاً پہلے لڑکے دھوبی گھاٹ سے اپنے کپڑوں کا بنڈل سر پر اٹھا کر لاتے تھے۔ چھٹی سے آنے کے بعد کھرپے سے اپنے اپنے ہاؤس کے علاقے کی گھاس صاف کرتے تھے۔ فرنیچر ادھر سے ادھر ڈھوتے تھے۔ انہوں ان برسوں کی روایتوں کو ختم کر دیا چونکہ یہ کیڈٹس کی عزت کے منافی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے آرمی کے این سی اوز اور کالج کے سینئر کیڈٹ آفیسرز کو سیلوٹ کرنے کا رواج بھی ختم کر دیا۔ جونیئرز کو سینئرز کی اردل میں دینے کا دستور بھی متروک ہوا۔ اسی طرح سالہا سال سے لا کر ایک خاص سٹائل سے سجانے اور کپڑے، چیزیں رکھنے کا انداز چلا آرہا تھا انہوں نے اسے بھی آسان کر دیا تھا تاکہ اس مشغلہ میں غیر ضروری وقت وتوجہ صرف نہ ہو۔ کالج کا پہلا پیٹرن پیچھے چلنے (FOLLOWING) راسخ کرنے

کے نقطہ نظر سے انہوں نے اسے آگے چلنے (LEADING) کی راہ پر لگایا۔ آگے چلنے کے لئے کچھ دیکھنا، سوچنا پڑتا ہے۔ اور اپنے طور پر کچھ قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے آگہی چاہیے، اپنی بھی اور ماحول کی بھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے لڑکوں کو ڈائری لکھنے کی ترغیب دی۔ خود احتسابی (SELF-DISCIPLINE) کے لئے آنر سسٹم جاری کیا۔ راہنمائی کے لئے ماہانہ انٹرویوز شروع کروائے۔ تفریح و تربیت کی غرض سے آؤٹ ڈور سرگرمیوں کا منظّم سلسلہ شروع ہوا۔ سپچر ڈے ڈنر نائٹ کا اہتمام ہوا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایک میس کے کچھ لڑکے دوسری میس میں مہمان ہوتے تھے اور اپنے دوستوں سے کھانے کی میز پہ گپ شپ کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں بیج اور
ہاؤس ٹائی

بھی شروع کی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ رفیق صاحب نے جہلم میں ایک فلم سیمسن اینڈ ڈیلا یئلا دکھانے کا اہتمام کیا تھا۔ اسی طرح سرائے عالمگیر میں ایک سرکس آیا تھا اس کا ایک شو بھی صرف کالج کے لئے مخصوص کیا گیا۔ رفیق صاحب کے پہلے دور کے سرسری جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے ملٹری کالج میں تعلیم و تربیت کا کتنا متوازن اور ہمہ گیر پروگرام شروع کیا تھا۔

اب میں اپنے تاثرات بیان کرتا ہوں۔ کمانڈنٹ صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہمیں تجسس تو بہت تھا لیکن اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم تھیں۔ ویسے ایک خبر سینئر لڑکوں میں عام تھی جس کی بعد کو تصدیق بھی ہوئی کہ وہ رات گئے اکثر جہلم کلب جاتے تھے لیکن ہمیں حیرت ہوتی اس بات پر کہ وہ لائیٹس آؤٹ کے بعد تک تو ہمارے ساتھ ہوتے ہیں کلب کب جاتے ہیں۔ سوتے کب ہیں۔ نپولین کی طرح وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو نیند کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے یہ بہت سی باتیں جو میں نے اب لکھی ہیں اس وقت ان کے بارے میں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا۔ اس وقت تو ہمیں ان کی جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا ان کا وہ بے داغ، بے حد سمارٹ لباس اور اس سے بھی زیادہ پروقار

چلنے کا انداز تھا۔ ان کے بہت سے نک نیم تھے ان میں ایک ٹو بھی تھا کیونکہ ان کے بوٹوں کی ٹو دور سے چمکتی بلکہ لشکارے مارتی نظر آتی تھی۔

جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ

رفیق صاحب سے دوسری بار کچھ سیکھنے کی سعادت اور عزت مجھے جوائنٹ سروسز پری کیڈٹ ٹریننگ سکول کوئٹہ میں ملی جہاں وہ ۱۹۵۴ء میں چیف انسٹرکٹر ہو کر پوسٹ ہوئے تھے اور میں وہاں اپنی تربیت کے آخری دن پورے کر رہا تھا۔ وہاں مجھے انہیں دیکھنے کا بہت کم موقع ملا سوائے اس کے کہ وہ ملٹری کالج کے کیڈٹس پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔

۱۹۵۹ء کی ایک یادگار ملاقات

یہ واقعہ غالباً دسمبر کی ایک شب کا ہے۔ جہلم کلب کی بار پر یکا یک ان کا سامنا ہو گیا وہ اپنے غیر ملکی (غالباً منگلا ڈیم سے متعلق) دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا اور باتیں کرنے لگے۔ سو اینڈ سو کا رسمی تعارف ان فرنگیوں سے بھی ہوا۔

انہیں میرے انداز گفتگو سے اندازہ ہوا کہ میں ان سے قریب ہوں چنانچہ انہوں نے از خود ہی میرے لئے بھی ڈرنکس کا آرڈر دیا اور مجھے پیش کیا۔ میں نے پہلے اشارے سے انکار کیا انہوں نے پھر اصرار کیا تو میں نے شائستگی کے ساتھ انکار کیا۔ تیسری بار انہوں نے پوچھا اتنی سردی ہے باہر اتنی بارش ہو رہی ہے تم ٹھنڈ میں باہر سے آئے ہو ڈرنک کیوں نہیں لیتے۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا رفیق صاحب نے کہا۔ " جنٹلمین یہ میرا بیٹا ہے ہمارے کلچر میں سعادت مند بچے باپ کے سامنے نہ ڈرنک لیتے ہیں نہ سگریٹ پیتے ہیں۔"

۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات

۱۹۶۳ء میں وہ کرنل کے رینک میں جی ایچ کیو میں پوسٹ تھے تو میں اور ۱۵۲۰ اعظم ان سے ملنے پنڈی

گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اور شام کا وقت تھا ہم جھجک رہے تھے کہ کہیں آرام نہ کر رہے ہوں۔ لیکن جب ہم ان کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا فائلوں کا انبار لگا ہوا ہے اور کچھ لکھنے میں مستغرق ہیں۔ بہرحال ہم سے حسب دستور بہت شفقت سے پیش آئے۔ کافی تواضع کی۔ چلتے چلتے میں نے گلہ کیا کہ سر، آپ کے آنر سسٹم نے ہمیں کچھ مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے اتنی دیانت داری سے کام نہیں چلتا۔ یہ سن کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ پھر اپنے مخصوص لہجے میں ایک لمبا لیکچر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں بھی دیانت داری اور جرأت کردار کے نوری عواقب سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن آخرکار (زور دے کر) جیت تمہاری ہی ہوگی۔ دیانت میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ایک امریکی افسر کو جھاڑ

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب وہ کھاریاں میں کرنل ایڈم تھے۔ کلب میں کسی امریکن افسر کو الوداعی ڈنر دیا جا رہا تھا۔ کہ اس افسر نے اپنی تقریر میں کہا میری خواہش تھی کہ میں کچھ عرصے اور پاکستان میں ٹھہرتا تاکہ پاکستانی افسروں کو ادب و آداب سمیت کچھ سکھا سکتا۔ یہ سن کر کرنل رفیق یکایک کھڑے ہو گئے اور خاصے درشت لہجے میں کہا۔ "جناب ہماری تاریخ اس دور سے بھی پہلے کی ہے جب آپ امریکنوں کا جغرافیہ بھی نہیں تھا۔ جہاں تک آداب و ادب کا تعلق ہے ہمیں آپ سے کچھ نہیں سیکھنا" یہ بات ملحوظ رہے کہ اس محفل میں کور کمانڈر بھی موجود تھے لیکن جب پاکستان، پاکستانیوں پر حرف آ رہا ہو تو وہ کسی پروٹوکول کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

۱۹۶۸ء کی آخری ملاقات

میری ان سے آخری ملاقات اکتوبر ۱۹۶۸ء کی کالج ری یونین کے موقع پر ہوئی۔ لیفٹیننٹ کرنل نذیر بھی موجود تھے۔ میں اور ۱۵۲۰اعظم ان سے ملے تو بہت تپاک سے پیش آئے۔ کالج کی پرانی باتوں کا ذکر چل پڑا تو بے اختیار رو پڑے۔ کہا "۱۰۴۱ لڑکوں کی تربیت کرنا جن کو آگے چل کر قیادت کی ذمہ داریاں

سنبھالنا ہوں۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔"

ایک معنی خیز سرگوشی

ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے مجھے ایک اور ایسا واقعہ یاد آ گیا ہے جس کو میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں تاکہ ان کے طریق تربیت کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑے۔ ۱۵۲۳ کاظم کمال کو لمبے بال رکھنے کا شوق تھا۔ اکثر چیکنگ ہوتی تھی لیکن لاابالی کاظم باز نہیں آتا تھا۔ ایک روز پریڈ پر انسپیکشن کرنل رفیق خود کررہے تھے۔ انہوں نے لمبے بال دیکھے تو کاظم کے کان میں سرگوشی کی۔ "لمبے بال موزوں نہیں" اور آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے یہ جملہ اتنا آہستہ کہا کہ میں جو ساتھ کھڑا تھا صحیح طریقے سے سن نہیں سکا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ کاظم جیسا لاپرواہ انسان، انسپیکشن ختم ہوتے ہی باربر کو ڈھونڈتا پھرا اور جب بال کٹوا لئے تو ہاؤس میں آیا۔ اپنی پچیس سالہ فوجی زندگی میں، یہ واقعہ میں نے بار ہا بیان کیا ہے۔ قیادت کے کمال کی اس سے بہتر مثال میرے علم میں نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ سرگوشی کے انداز میں کہے گئے چند الفاظ میں یہ تاثیر کیسے آئی؟

۱۶۰۶ کرنل (ریٹائرڈ) محمد یونس

یونس، ماشاءاللہ اب تم ایک دنیا دیکھ چکے ہو۔ اس پس منظر میں رفیق صاحب پر بات کرنی ہے۔

سر، واقعہ یہ ہے کہ میں ان کے دور میں چند مہینے ہی کالج میں رہا۔ وہ جولائی ۱۹۵۲ء میں آئے تھے۔ میں اس وقت آئی ایس ایس بی کے لئے تیاری کررہا تھا۔ ستمبر، اکتوبر میں سلیکٹ ہوکر جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ چلا گیا لیکن یہ چند مہینے میرے لئے سالوں پر بھاری تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ جس طرح ان کا کالج میں آنا کالج میں انقلابی اور دوررس تبدیلیوں کا باعث بنا اسی طرح ان چند مہینوں نے دوسرے کیڈٹس کی طرح مجھے بھی ایک نیا طرز احساس، ایک نئی سوچ اور ایک مشن بلکہ وژن دیا۔ وہ ایک شعر جو کبھی آپ نے سنایا تھا۔

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

صد سالہ دور چراخ تھا ساغر کا ایک دور

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

جی ہاں بالکل یہی صورت تھی۔ برسوں سے ہم ایک ڈگر پر چل رہے تھے۔ پی ٹی، پریڈ، ڈرل، کلاسز، پریپ، کھانا اور سونا اس دائرے میں ہم گھوم رہے تھے۔ کوئی خاص آئیڈیل، کوئی وژن نہیں تھا۔ اگر کوئی بڑی سے بڑی امنگ تھی تو یہی کہ افسر بن جائیں۔ کیسا افسر اور کس لئے اس کا تصور کوئی نہیں تھا۔

"آخر کیوں"

اس وقت تو خیر ان چیزوں کا ادراک کیا ہوتا لیکن آج جب میں پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں اور زندگی کے تجربات کی روشنی میں اس کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سے پہلے ہم ایک چٹیل صحرا میں سفر کر رہے تھے سامنے کوئی پہاڑ نہیں تھا جس کی چوٹیوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھ سکیں، جو ہمیں انسپائر کر سکے، جو ہمارے کیریر ہیرو کے طور پر سامنے آئے، جو ہمیں یہ امیج دے کہ فوجی افسر ایسا ہوتا ہے، کمانڈ ایسے کی جاتی ہے، لیڈرشپ اسے کہتے ہیں، قیادت کے گر یہ ہیں"۔

''کیا اس خیال انگیز تاثر کو کسی ٹھوس حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے؟"

کیوں نہیں، ان کی پرسنیلیٹی کے ظاہرہ پہلو ہی کو دیکھئے مثلاً جب ہم پی ٹی پر جاتے اور دیکھتے کہ کمانڈنٹ کرنل رفیق ایک اونچے سیاہ گھوڑے پر اپنا چوڑا سینہ تانے بیٹھے ہیں۔ چہرے پر جلال ہے۔ کیڈٹس کو یوں عقابی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی جنرل لڑائی سے پہلے اپنے ٹروپس کا معائنہ کرتا ہے اور جب "کاشن" دیتے تھے تو "مائی گاڈ" ساری پریڈ گونج جاتی تھی، یہ معمولی باتیں نہیں ہیں۔ پر جلال انداز، شاندار ٹرن آؤٹ اور پرشکوہ کاشن۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اس عمر میں نوجوان کیڈٹوں کے دلوں

میں لاشعوری امنگیں جگا دیتی ہیں۔ جے ایس پی سی ٹی ایس میں جب مجھے ایک پلاٹون کو کمانڈ کرنے اور کاشن دینے کا پہلی بار موقع ملا تو کرنل رفیق کی کاشن مجھے ہانٹ کرتی تھی۔ یہ تو ظاہری پہلو تھا جو اتنا امپریسو تھا لیکن اس سے زیادہ اہمیت ان کی انسپائرنگ بلکہ Awe Inspiring شخصیت کی تھی اور ان کی عزت کی جاتی تھی۔

" کیا مطلب؟"

مطلب یہ کہ ان کی عزت رسمی نوعیت کی نہیں تھی جو رینک یا اتھارٹی کی وجہ سے کی جاتی ہے جس کا دل اور دماغ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی برتری ان کی شخصیت و کردار پر مبنی تھی۔ ان کی عظمت دل پر اثر کرتی تھی۔ ان کے حوالے سے کم از کم میری امیج بنی کہ افسر ایسا ہوتا ہے۔

"اس امیج کا تعلق کسی خاص واقعہ سے تو نہیں۔"

نہیں کسی خاص واقعہ سے نہیں میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ان کا ٹوٹل امپیکٹ اس طرح کا تھا۔ پھر بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس نے میرے ذہن پر گہرا تاثر چھوڑا۔

"وہ کیا تھا"

وہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے گروپ کے آئی ایس ایس بی جانے سے پہلے ہمیں لیڈر شپ پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کا ایک نقطہ یاد رہ گیا ہے۔ غالباً اس لئے بھی کہ اب میں اس کا تھوڑا بہت فلسفہ جانتا ہوں۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ جوانوں کے سامنے اپنی مثال پیش کرو جو کام کرنے کو کہتے ہو وہ کر کے دکھاؤ اس کا مقصد یہ نہیں کہ آپ کوئی انسٹرکٹر ہیں کوئی کام کر کے یا "ڈیمانسٹریٹ" کر کے اس کام کو کرنا سکھا رہے ہیں جو وہ نہیں جانتے۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ان کو مورچہ کھودنا ہے اور آپ مورچہ کھودنے میں پہل کرتے ہیں تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ انہیں مورچہ کھودنا سکھا رہے ہیں۔ "ناٹ ایٹ آل"۔ یہ کام تو مسلسل مشق کی وجہ سے شاید وہ اپنے سینئر افسر

سے بہتر کر سکتے ہوں جب میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ جوانوں کے ساتھ کام کرنے میں پہل کریں۔خصوصاً مشکل تکلیف دہ یا بظاہر چھوٹا کام کرنے میں تو اس کا مقصد نفسیاتی ہوتا ہے ان کو یہ احساس دینا کہ آپ ان کے ساتھ ہیں، ان جیسے ہیں، ان میں سے ایک ہیں، انسانی طور پر آپ کو ان پر کوئی برتری نہیں، جو کام وہ کر رہے ہیں وہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔آپ کی سینیارٹی انتظامی ہے۔ چونکہ ذمہ داری کی نوعیت مختلف ہے۔آپ کام کروا رہے ہیں وہ کر رہے ہیں۔اور آپ اور بہت سی چیزیں سوچ رہے ہیں جو ان کا دردسر نہیں۔سر، یہ مثال کا فلسفہ انہوں نے سمجھایا اور جس طرح سمجھایا (کیونکہ وہ خود اس کی زندہ مثال تھے) یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی بلکہ زندگی اور کام کے بارے میں میری پوری سوچ متاثر ہوئی ہے۔

"ماشااللہ تم بھی سی او رہے ہو۔کوئی ایسی مثال دے سکتے ہو جس کا سرا ہم کرنل رفیق کے لیکچر سے ملا سکیں۔"

جی ہاں،فوری طور پہ جو مثال میرے سامنے آئی ہے کہ جب بھی میں جوانوں کے لنگر میں ان کا کھانا چیک کرنے گیا تو اس طرح نہیں جیسا کہ میس حوالدار بڑے اہتمام سے ایک اعلیٰ درجے کی ٹرے میں نیپکین کے ساتھ بہت ہی صاف پلیٹ میں سالن روٹی وغیرہ ٹیسٹ کرنے کے لئے پیش کرتا ہے اور افسر بڑی شان سے علیحدہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بڑے کروفر سے چکھتا ہے اور ریمارکس لکھ کر چلا جاتا ہے۔میں نے ہمیشہ جوان کے ساتھ بیٹھ کر اس کی روٹی میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر اس کی پلیٹ میں سے سالن چکھا ہے۔اسی طرح ۶۵ ء اور ۷۱ ء کی جنگوں میں، میں نے کوشش کی کہ میں انسانی اور سماجی سطح پر اپنے آدمیوں سے الگ نظر نہ آؤں۔ یہ سب رویے کی بات ہوتی ہے۔رفیق صاحب کا اثر مجھ پر یہ رہا ہے کہ صاحبیت اور افسریت کا قائل نہیں رہا۔افسری یہ ہے کہ بندہ کردار میں اور کارگزاری میں اپنے سب ساتھیوں سے بہتر ہو اور سب سے بڑی بات کہ دوسروں کو INSPIRE کر سکے۔

"بہت مشکل بات ہے۔"

وہ تو ہے لیکن بغیر اس وژن کے، اس آیئڈیل کے بات نہیں بنتی۔ کرنل رفیق نے اس وقت ہمیں آپ کے الفاظ میں پہاڑی کے اس پار (BEYOND THE HILL) دیکھنا سکھایا اور مختصر یہ کہ انہوں نے ملٹری کالج کو جو ADRIFT تھا اسے ایک سمت اور ایک عظیم مقصد کا شعور دیا۔ اور ہمیں بھی ایک آیئڈیل اور روژن دیا۔ اسی لئے میں انہیں ایک عظیم آدمی سمجھتا ہوں حقیقت تو یہ ہے کہ وہ وقت کی بہت اہم ضرورت تھے۔

"اس میں کیا شک ہے۔ ملٹری کالج کے بعد بھی کبھی ان سے ملنا ہوا"

٦٢ ءیا٦٤ میں پنڈی کلب میں ملاقات ہوئی۔ وہ فل کرنل ہو چکے تھے اور غالباً جی ایچ کیو ہی میں پوسٹ تھے۔ میں آگے بڑھا اور تعارف کرایا۔ میجر یونس فرام ملٹری کالج۔ یہ سن کر جس طرح انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اس شفقت اس افیکشن اور گرم جوشی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس ملاقات کی اور باتیں تو مجھے یاد نہیں رہیں لیکن ان سے ملنے کی تصویر میرے ذہن میں نقش ہوگئی ہے۔ پنڈی کلب کا وہ گوشہ، وہ جگہ اور ان کا ملنے کا انداز اس وقت بھی میری آنکھوں میں پھر رہا ہے میں اس کی تصویر کھینچ سکتا ہوں۔

میری ان سے آخری ملاقات گھوڑا گلی کالج میں ہوئی۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ان کے گھر میں ان سے ملنے گیا۔ جاتے ہی میں نے کہا سر آج میں اپنے بچے کے سلسے میں ایک کام سے آیا ہوں صرف ملنے نہیں (یہ صاف گوئی بھی ان کی سکھائی ہوئی تھی)۔ بولے نہیں، یوں نہ کہو۔ بچوں کو اپنے والدین سے کام بھی ہوتے ہیں ملنا بھی ہوتا ہے۔ اس بار وہ پھر اسی طرح شفقت سے پیش آئے اور بچے محمود کے بارے میں مشورہ دیتے رہے۔ واپسی میں، اپنی اہلیہ سے کہہ رہا تھا۔ دیکھا یہ ہیں کرنل رفیق انہوں نے ٹوکا کرنل رفیق نہیں بریگیڈیئر رفیق میں نے کہا میں انہیں ١٩٥٢ء کے حوالے سے کرنل رفیق کہہ رہا ہوں۔ وہ بولیں "ہی از گریٹ۔" از پر زور دیا تھا۔ میرا سر فخر سے اونچا ہوگیا۔

۱۶۲۲ نذیر احمد

پہلا واقعہ نومبر ۱۹۵۲ء کا ہے ہم چند لڑکے محمد رفیع، پی ڈی ۳۹ ۱۷ اور میں برڈ وڈ ہاؤس میں کچن ڈیوٹی پر تھے۔ میز پر مٹر کی پھلیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اور ہم ان کے دانے نکال رہے تھے کہ یکا یک کرنل صاحب گیمز ڈریس میں وہاں آ گئے۔ ہم تینوں بڑے انہماک سے مٹر چھیل رہے تھے۔ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ وہیں ہمارے ساتھ ہی بنچ پر بیٹھ گئے اور خود مٹر نکالنے لگ گئے۔ چار پانچ منٹ ہم سے ادھر ادھر کی باتیں کیں، کچن ڈیوٹی کے بارے میں پوچھا اور برڈ وڈ ہاؤس کے پیچھے پی ٹی گراؤنڈ کی طرف چلے گئے۔ اس روز جب مٹر پلاؤ میز پر سرو ہوا تو میں نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ہوشیار۔ یہ پلاؤ جو تم کھا رہے ہو اس میں کمانڈنٹ صاحب کے نکالے ہوئے مٹر کے دانے بھی شامل ہیں۔ سب کو بڑی حیرانی ہوئی پھر میں نے سارا قصہ سنایا۔

دوسرا واقعہ ۱۹۵۳ء کے اوائل کا ہے۔ جب کرنل صاحب سزا دینے پہ آتے تھے تو بے تحاشا سزا دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر سارا کالج کمانڈنٹ کے دفتر کے پیچھے جمع ہوتا تھا

ایک ایسے ہی موقعے پر انہوں نے نادر کو سخت سزا دی اتنی کہ وہ خود بھی برداشت نہیں کر سکے۔ "ٹی او" سے کہا کین پورے کرو اور خود پیچھے سے دفتر میں چلے گئے۔ شام کو لڑکوں میں گپ شپ تھی کہ دفتر کے اردلی نے بتایا ہے کہ کرنل صاحب دفتر میں جا کر روئے ہیں۔

۱۶۲۳ لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

کرنل رفیق نے جو آنر کوڈ دی تھی وہ اب بھی مجھے یاد ہے اور میں اپنی اولاد کو بھی بتاتا رہتا ہوں اور جب تک فوج میں رہا اپنے جوانوں کو بھی اسی کی تعلیم دیتا رہا۔ اصل آنر کوڈ تو انگریزی میں تھی اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے۔

ا۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

۲۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے مجھ پر، میرے خاندان پر، میرے کالج پر یا ملک پر کوئی حرف آئے۔

۳۔ اگر مجھ سے کبھی کوئی غلط کام سرزد ہوا تو میں اسکی رپورٹ اپنے سینئر کو دوں گا۔

۴۔ اگر میں نے کسی اور کو کوئی غلط کام کرتے دیکھا اور اگر اس نے خود اس کی رپورٹ نہ کی تو میں اس کی رپورٹ اپنے سینئر سے کروں گا۔ یہ عہد انھوں نے ہم سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کر لیا تھا۔ ہمیں زبانی یاد کروایا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہمارے لاکرز پر بھی یہ لکھا ہوا تھا۔ اس وقت یہ بڑی حد تک میکانکی عمل تھا۔ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے اس کو دہراتے رہتے تھے۔

جب میں خود افسر بنا، تھوڑا بہت پڑھا لکھا اور دنیا کو دیکھا بھالا تو پتہ چلا کہ یہ سسٹم کوئی نئی چیز نہیں۔ امریکہ کی ملٹری اکیڈمی ویسٹ پوائنٹ میں بھی اس کا تجربہ ہوا ہے۔ یہ آنر کوڈ بھی کم وبیش وہی ہے۔ کونٹری کی سزا بھی بعض اداروں میں رائج رہی ہے۔ لیکن اس دریافت سے کرنل رفیق کے تجربہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ کوئی نیا خیال بھی بالکل نیا نہیں ہوتا۔ تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ نئی چیز یہ تھی کہ انہوں نے کس خلوص سے اور کس قوت سے، کس عزم سے، کس جذبے سے کالج کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کی۔ آنر کوڈ اور آنر سسٹم کا اجراء انکی سوچ کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ کوئی بھی اصلاحی کوشش مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کی جزوی کامیابی ہی بہت ہوتی ہے۔ اس جزوی کامیابی کی ایک مثال مجھے یاد آئی ہے۔ سرائے عالمگیر میں کوئی تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی۔ کرنل رفیق نے پورا ہال کالج کے لئے ریزرو کرایا۔ لڑکوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کرسیاں ساتھ لے جائیں (یاد رہے پہلے ہم سینما وغیرہ دیکھنے باہر جاتے تو بیٹھنے کے لئے اپنے کمبل ساتھ لے جاتے تھے)۔ واپسی پر افراتفری میں کچھ لڑکے بلکہ خاصے لڑکے اپنی کرسیاں راستے میں سڑک پر چھوڑ آئے۔ کرنل رفیق کو رپورٹ ہوئی یا انہوں نے خود دیکھا۔ مختصر یہ کہ انہوں نے پورے کالج کو فالن کر لیا۔ پہلے تو سخت جھاڑ

پلائی۔ اگر وہ لڑکے جو کرسیاں چھوڑ کر آئے تھے وہ خود ہاتھ اٹھادیں تو میں وعدہ کرتا ہوں انہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ انہوں نے پھر اپنے الفاظ دہرائے۔ تو ایک اٹھا۔ ہر ایک کو تجسس ہوا کہ جواں مرد کون ہے ہر کوئی گردن گھما گھما کر اور پنجوں کے بل اچک کر دیکھنے لگا اور وہ کون تھا۔ ۱۴۶۷ یوسف جس کو یار لوگوں نے جنگلی کا نک نیم دے رکھا تھا۔ اس کو دیکھا دیکھی کچھ اور ہاتھ بھی کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر میں ان میں مزید اضافہ ہوا۔ رفیق صاحب نے خوش ہو کر بڑی زوردار تقریر کی۔ یوسف کی بڑی تعریف کی۔ بہت ہمت افزائی کی۔ ان کے وہ الفاظ مجھے نہیں بھولتے۔ "بی اے مین، بوائز! غلطی ہو تو اسکی ذمہ داری بھی قبول کرو۔ یاد رکھو اخلاقی جرأت بڑی چیز ہے۔ یہ کردار کی پہلی شرط ہے۔"
اس واقعہ کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں کچھ اس لئے کہ اس سے آنر سسٹم کی جزوی کامیابی کا ثبوت ملا۔ اور بڑی حد تک اس لئے کہ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ لوگ جنہیں ہم جنگلی سمجھتے ہیں، جن کو ہم کچھ اہمیت نہیں دیتے اکثر وہی راندہ درگاہ ماندہ، قبیلے کی آنکھ کا تارا ثابت ہوتے ہیں۔ ۱۸۱۱ اکرم کو جب تک وہ کالج میں رہا کوئی اہمیت نہیں دی گئی آج وہی ہمارا اکلوتا نشان حیدر ہے اور کالج اس پر فخر کرتے نہیں تھکتا۔ اس لئے ادارے میں، گھر میں، ملک میں ہر ایک کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ رفیق صاحب سے پہلے خواص کو اہمیت حاصل تھی رفیق صاحب کو فل مارکس اس لئے دیتا ہوں کہ انہوں نے عام لڑکوں کو اہمیت دینی شروع کی اور حقیقت یہ ہے کہ انکی تربیت سے فائدہ بھی انہیں نے سب سے زیادہ اٹھایا۔
آخر میں، میں انکی ایک اور خصوصیت کا ایک واقعے کے حوالے سے ذکر کروں گا۔ وہ یہ کہ وہ لڑکوں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی بہت کرتے تھے۔ جب ہم گریفن انسٹی ٹیوٹ لاہور سے باکسنگ جیت کر آئے تو ہمارا شاہانہ استقبال ہوا۔ نہر کے اس طرف بینڈ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اب باکسنگ ٹیم اس طرح کالج کی طرف بڑھی کہ براس بینڈ آگے آگے تھا۔ نہر سے کالج تک دونوں طرف لڑکے کھڑے تالیاں بجا رہے تھے گیٹ پر کرنل رفیق اور اسٹاف نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ جناب مزا آ گیا، عزت سے بڑھ کر دنیا

میں کیا چیز ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ہمت افزائی صرف باکسنگ ٹیم کی نہیں تھی سارے لڑکوں کی تھی بالواسطہ طور پر ان کے حوصلے بھی بلند ہوئے۔ انہوں نے بھی قیادت کا گر سیکھا کہ کام کی قدر کرو محنت کی حوصلہ افزائی کرو۔ آج ان لڑکوں میں سے دو چار نہیں بیسیوں آرمی اور سول میں اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور ایک خاص سوچ رکھتے ہیں۔ ایک چراغ سے کتنے چراغ جلے ہیں اور ان سے اور کتنے چراغ جلیں گے۔

پچھلے دنوں کالج میں جانا ہوا۔ گیٹ پر وہ پرانا نیم دائرہ نما گرین بورڈ نظر نہیں آیا۔ جس پر بڑے بڑے سفید حروف میں لکھا تھا "انٹر ٹو لرن گو آؤٹ ٹو سرو۔" پرانے گیٹ کی جگہ ایک بہت ہی خوبصورت گیٹ تھا۔ اس پر بہت چمکتی ہوئی خاصی قیمتی قندیلیں بھی نصب تھیں۔ اس شاندار نئے گیٹ سے پرے ہٹ کر میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ بظاہر چپ لیکن دل سے کہہ رہا تھا کہ یہ قندیلیں بھی خوب ہیں لیکن میرے پرانے دیئے کہاں کھو گئے۔

۱۶۲۸ بریگیڈئر محمد اکرم

جولائی ۵۲ء میں کرنل رفیق کے آنے سے پہلے بھی کالج میں ایف اے سی سی کام کر رہا تھا۔ کرنل زیدی تھے، مسٹر حیدری تھے، مسٹر راشد تھے۔ لیکن ان غیر نصابی سرگرمیوں سے جو لوگ استفادہ کر رہے تھے وہ زیادہ تر برائٹ لڑکے تھے اور ان کی تعداد محدود تھی زیادہ تر لڑکے میری طرح نظر انداز ہو رہے تھے۔ رفیق صاحب نے آ کر سب پر ذاتی توجہ دی۔ وہ اس طرح کہ ہر ایک لڑکے سے انٹرویو لیا۔ ہر ایک کو دو چار منٹ بلکہ بعض کو تو اس سے بھی زیادہ وقت دیا۔ اس طرح ان کو لڑکوں کی اور ڈسپلن کی پرابلمز کا اندازہ ہوا اور عام لڑکوں کو یہ بھی احساس ہوا کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ ہمارا بھی کوئی ہے۔ اور یہ بھی نہیں ان کا یہ رویہ صرف لڑکوں کے ساتھ ہو۔ اسٹاف بلکہ کلاس فور تک ان کو اپنا سمجھتے تھے۔ اسی اپنائیت کا نتیجہ تھا کہ جب اپریل ۱۹۵۳ء میں انہیں یکا یک کالج چھوڑنا پڑا تو لڑکے تو لڑکے مسٹر اقبال ایسے عمر رسیدہ بچوں کی طرح

پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انہوں نے ہر ایک سے کام لیا۔ کیڈٹس تو چکر میں رہتے ہی تھے اسٹاف کو بھی کسی گھڑی چین نہ تھا۔ دوسرے ملازمین بھی ہر وقت بھاگ دوڑ میں لگے رہتے لیکن ہر طبقے کی دیکھ بھال بھی وہ اسی طرح کرتے تھے کہ وہ ان کے ایک اشارے پر اپنا آرام بھی قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ کالج میں پڑھی ہوئی کتابیں کب کی بھول گئیں لیکن لیڈرشپ کے جو سبق انہوں نے پڑھائے وہ اب بھی یاد ہیں بلکہ اب ان کی قدر و قیمت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ کرنل رفیق کو اپنے سٹاف کا بھی پورا تعاون حاصل تھا۔ وہ بھی ان کی سوچ کو آگے بڑھاتے جاتے تھے۔ ایک روز مسٹر راشد نے مجھے اور ۱۶۵۶ منصور کو کافی سمجھایا کہ بڑا افسوس ہوتا ہے آپ لوگ اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں اور ذہن کو چمکانے کے لئے کچھ پڑھتے نہیں۔ منصور کو انہوں نے کون سی کتاب دی وہ تو مجھے یاد نہیں لیکن میرے حصے میں جو کتاب آئی وہ ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' تھی اس وقت یہ میرے لئے اتنی مشکل کتاب تھی کہ میں ڈکشنری دیکھ دیکھ کر تھک گیا اور باب بھی ختم نہ ہو سکا۔ لیکن یہ احساس کہ کسی نے میری ترقی میں دلچسپی لی، میرے اوپر تھوڑی سی توجہ کی، میرے لئے آج بھی تمانیت کا باعث ہے۔ رفیق صاحب کے دور میں جو خوشگوار تجربے ہوئے جس طرح ذہن کھلا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنی مادر درسگاہ کو اتنی محبت سے یاد کرتے ہیں۔

کرنل رفیق (چونکہ وہ کالج کے زمانے میں کرنل کہلاتے تھے اس لئے انہیں ان ہی الفاظ میں یاد کر رہا ہوں) کے بولنے کا ایک خاص انداز تھا جب غصے ہوتے تو یہ فقرہ ضرور کہتے۔

Either my orders are not clear to you or

you are deliberately violating them.

اکثر لڑکے ان کے بولنے کے انداز کی نقل اتارا کرتے تھے۔ ایک روز پریپ میں، میں ان کے لب و لہجے کی نقل اتار رہا تھا۔ جب اس فقرہ پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنی کہنی کھڑکی پر رکھے

کھڑے تھے۔ان کو دیکھتے ہی جو لفظ جہاں تھا منجمد ہو گیا۔لیکن انہوں نے کچھ نہ کہا اور آگے بڑھ گئے۔
میری جان میں جان آئی۔دوسرے دن میں منتظر رہا کہ شائد بلا کر سرزنش کریں لیکن نہ بلایا اور نہ سرزنش
کی۔میں خوش تھا کہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔چند دن بعد انہوں نے مجھے ایسا
پھنسوایا کہ بس۔تفصیل !اس اجمال کی یہ ہے کہ حیدری صاحب انگریزی کے ڈرامے کی ریہرسل شروع
کروا رہے تھے کہ ایکٹر فضل الرحمٰن (بعد میں کیپٹن آرمرڈ کور) نے حیدری صاحب سے کچھ تعاون نہیں
کیا۔انہوں نے تنگ آکر اسے کاسٹ سے نکال باہر کیا اور مجھے بلا کر کہا ذرا یہ سکرپٹ پڑھو۔میں نے کہا
سر، میں نے کبھی ایک پیرا بھی بلند آواز میں نہیں پڑھا، میں اس پورے ڈرامے کی ایکٹنگ کیسے کر سکتا
ہوں۔میں نے بہت منت سماجت کی کہ مجھے معاف کر دیں لیکن وہ نہ مانے، کہنے لگے تم صرف زبانی یاد
کرلو۔اسٹیج پر کیا کیا کرنا ہے، ایک ایک لفظ، ایک ایک حرکت سکھانا میرا کام ہے۔میں نے پھر کہا سر
، میں نے زندگی بھر ایکٹنگ نہیں کی، آپ کو کیسے خیال ہوا کہ میں ڈرامہ کر سکتا ہوں۔کہنے لگے۔مجھے کرنل
رفیق نے بتایا ہے کہ تمہارے اندر ڈرامائی صلاحیت ہے۔یہ ان کا حکم ہے یہ پارٹ اب میں تمہیں ہی
دوں گا۔مجھے فوراً یاد آ گیا کہ کیا قصہ ہے۔مرتا کیا نہ کرتا میں نے وہ پارٹ کیا اور شائد اچھا کیا۔چونکہ پھر
حیدری صاحب نے بھی شاباش دی۔

تو دیکھا آپ نے یہ تھے رفیق صاحب۔اس ظرف ہی کا نہیں اس نظر کا بھی کوئی جواب ہے۔کالج میں
کرنل رفیق کا دوسرا ٹرم میں نے بہت کم دیکھا لیکن اس ٹرم میں ان کی اپروچ پہلے سے بہت مختلف
تھی۔مار دھاڑ بہت کم تھی بلکہ ختم ہو گئی تھی۔کالج پبلک سکول کی طرح منظّم کیا جا رہا تھا۔اس کے تقاضے
بھی اور تھے۔لیکن بنیادی طور پر وہی تھے۔لوگ کہتے ہیں کہ ان کا یہ ٹرم کالج کا روشن ترین دور تھا۔

۱۹۶۰-۶۱ء میں میری ان سے اتفاقیہ ملاقات درگئی فیلڈ میس میں ہوئی۔یہ ملاقات مجھے اس لئے یاد ہے
کہ اس موقع پر میں نے لائٹ سائیڈ دیکھی۔ہم لوگ زمین پر بیٹھے تھے سامنے مٹی سے کاٹا ہوا میز نما

چبوترا سا تھا ٹرے وغیرہ رکھنے کے لئے۔ بات کرتے کرتے کرنل رفیق نے آرڈیننس کے کرنل ممتاز سے کہا۔ انہوں نے دو ایک لطیفے سنائے کہنے لگے۔ نہیں وہ او ٹی ایس بنگلور والا سناؤ۔ چنانچہ کرنل ممتاز نے او ٹی ایس بنگلور میں اپنی کارگزاری کا قصہ سنایا کہ کس طرح وہ صبح کے ناشتے پر کسی برٹش افسر کی نقل کرتے بھوکے رہے اور رات کو کس طرح گوشت کاٹتے اسکا ایک ٹکڑا سامنے والے افسر کی پلیٹ میں جا پڑا تو کس بے تکلفی سے انہوں نے وہ ٹکڑا اچک کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ہنس ہنس کر رفیق صاحب کا برا حال تھا ہنسی سے وہ زمین پر لوٹ رہے تھے۔

کرنل رفیق کو میں نے کالج میں بے حد سنجیدہ انسان کے روپ میں دیکھا تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی احتیاط سے اجازت لے کر آتی تھی۔ اس وقت وہی شخص بے محابا بچوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میں فلائی کر کے منڈا قلعہ کے قریب ان کی بٹالین ۱۹ پنجاب میں ان سے ملنے گیا۔ وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بٹالین ہیڈ کوارٹر کے سامنے ایک چبوترے پر بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے ایک دم بولے۔ "اکرم! Here I feel old There I would feel young with you people" یہاں میں بوڑھا محسوس کرنے لگا ہوں۔ وہاں تم جوان لوگوں کے ساتھ میں اپنے آپ کو جوان محسوس کرتا تھا۔ میں سمجھ گیا جس طرح ہمیں کالج یاد آتا ہے۔ انکا دل بھی وہیں اٹکا ہے۔ میرا خیال ہے بنیادی طور پر وہ لیڈر نہیں مصلح، مربی اور مرشد تھے۔

ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۷۱ء میں ۱۴ ڈویژن کے میس ڈھاکہ میں ہوئی۔ وہ شیخ مجیب کے مقدمے کی کاروائی شروع کر رہے تھے۔ اس بہت ہی مختصر آدھ گھنٹہ کی ملاقات میں انہوں نے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا جس کو میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں تاکہ جو لوگ ان کے کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ان کے نہاں خانہ دل کی چھپی ہوئی آخری آرزو کا راز داں بھی ہو۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "اکرم اب کبھی کبھی میرا دل شدت سے حج پر جانے کو چاہتا ہے اور جاؤں تو اس طرح کہ کچھ عرصہ وہاں

رہوں تا کہ میں کچھ ارتقاز Concentrate کر سکوں۔"

۱۶۴۰ عبد الحفیظ

حفیظ چونکہ آپ سول میں ہیں بہت سے اولڈ بوائز آپ کو نہیں جانتے ہوں گے اس لئے پہلے آپ اپنا مختصر سا تعارف کرائیں۔

سر، میں کے جی آر جالندھر سے ۴۷ء میں دوسرے مسلمان طلبہ کے ساتھ کے جی آر جہلم میں آیا تھا۔ پھر ۵۴ءتک یہاں رہا اس لحاظ سے کرنل رفیق کا صرف پہلا دور میں نے دیکھا۔ یہاں آنے سے پہلے جالندھر میں لیفٹیننٹ کرنل گولڈ فیلڈ کی کمانڈ دیکھ چکا تھا۔ یہاں اور تین کمانیں دیکھیں۔ ۵۶ء میں ایران گیا۔ وہاں کاروبار کیا آخر کار بین الاقوامی فلموں کی تقسیم کا ایک بڑا ادارہ قائم کیا جو انقلاب ایران کی نذر ہو گیا۔ اس دوران بڑی دنیا دیکھی۔ یورپ و امریکہ میں تو آئے دن آنا جانا ہوتا رہتا تھا زندگی اور کاروبار کے اس پس منظر میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ طالب علم بدقسمت ہے جس نے ملٹری کالج میں پڑھا اور کرنل رفیق کا وقت نہیں دیکھا۔ ان جیسے ترقی یافتہ لوگ بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی مشکل سے ملتے ہیں۔

"ان میں ایسی کون سی خصوصیت تھی؟"

اسے CHARISMA کہہ سکتے ہیں ان میں ایک پر اسرار قوت کشش تھی۔ وہ ایک دم متاثر کرتے تھے خاص طور پر نوعمری میں ایسی پر شکوہ اور پر اسرار شخصیت سے واسطہ ذہن کو نئی بلندیوں سے آشنا کرتا ہے۔ پھر اندر سے ان کی شخصیت ایسی تھی جس نے طلبہ کو زندگی کی بنیادی قدروں سے روشناس کیا۔

''ان کے کالج میں آنے سے آپ نے کیا محسوس کیا تھا؟''

ایک ریلیف کا احساس ہوا تھا۔ سینیئرز کا خوف اس نظام کی بدترین خصوصیت تھی۔ انہوں نے آتے ہی فضا میں ایسی تبدیلی پیدا کی کہ ہمارے دلوں سے یہ خوف دور ہوا۔

"مثبت طور پر کیا ملا؟"

بہت کچھ ملا مثلاً انہوں نے ہمارے آؤٹ لک کو وسیع کیا اور زندگی کو عملی تجربات سے روشناس کرایا۔

"اس کی کوئی مثال"

مثلاً ایک بار آٹھ دس بڑے لڑکوں کو شکار پر لے گئے کھاریاں کی طرف۔ لیفٹیننٹ وہاب، مسٹر شمسی اور اکاؤنٹینٹ قدوس صاحب بھی ساتھ تھے۔ میرے علاوہ ۱۵۲۸ عنایت، ۱۳۹۵ امیر اور ۱۷۰۰ افضل بھی اس پارٹی میں شامل تھے۔ انکی کالج کے اندر جو امیج تھی (سخت ہونے کی) اس کے تحت ہم کچھ الجھن میں تھے کہ کہیں یہ ٹرپ بھی ڈرل نہ بن جائے۔ انہوں نے یقیناً یہ اندیشہ ہمارے چہروں پر پڑھ لیا ہوگا۔ تبھی تو انہوں نے ٹرک پر بیٹھنے سے پہلے جو مختصر ٹاک دی اس کا خاص نقطہ یہی تھا کہ میرا رویہ دوستانہ ضرور ہوگا۔ لیکن میں دوست نہیں ہوں گا۔

"پھر تجربے نے کیا ثابت کیا؟"

جو انہوں نے کہا تھا سارے شکار میں ماحول پر وقار بے تکلفی کا رہا جو انہوں نے دوستی اور دوستانہ رویے میں فرق کیا تھا۔ اس فرق کو بھی ہم نے سمجھا اور زندگی میں بارہا خود اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی۔ خود اپنی اولاد کے ساتھ میں اسی اصول پر کاربند رہا۔

"اس دوستانہ رویے کی کوئی مثال۔"

اس ٹرپ کا بنیادی مقصد غالباً کھلی فضا میں ذمہ داری کی تربیت ہی تھا۔ اس کے لئے انہوں نے لڑکوں کو کئی پارٹیوں میں تقسیم کیا۔ ہر گروپ کے پاس ایک بندوق تھی شکار کے آداب انہوں نے بتائے تھے۔ ہم کھلے میدان میں آزاد پرندوں کی طرح تھے۔ لیکن دور سے ان کی نظر ہم پر تھی۔ پر وقار بے تکلفی کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے شکار سے واپسی پر لڑکوں کے اصرار پر ملائی گانا بھی سنایا۔ انکی آواز تو آپ کو پتہ ہے کتنی بھرپور اور پر قوت تھی۔ پتہ نہیں لفظوں کے معنی کیا تھے لیکن اس کا اثر جنگی ترانے کا سا

تھا۔

اکتوبر ۵۶ء میں جب میں ایران جانے لگا تو میں کالج ان سے ملنے گیا۔ دیکھتے ہی کہا حفیظ کیسے ہو، کیا ارادے ہیں۔ میں نے بتایا سرا ایران میں زور بازو کو آزمانا چاہتا ہوں۔ بہت خوش ہوئے کہنے لگے دنیا بہت وسیع ہے۔ جدوجہد کا سفر جاری رکھو، میں نے عرض کیا۔ ان دیکھی دنیا کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں۔ کوئی نصیحت کیجئے بولے آنکھیں کھلی رکھنا۔ اور ابتدائی مشکلوں اور مایوسیوں سے دل مت چھوڑ بیٹھنا اور ہاں "اینڈز" اور "مینس" دونوں پر نظر رکھنا۔ یہ میری آخری روبرو ملاقات تھی۔ روبرو اس لئے کے اس کے بعد بارہا ان کا خیال آیا۔ ان کے آخری الفاظ بھی یاد آئے لیکن پھر ملنا نہ ہوا۔

۱۶۵۶ منصور احمد

ایک چیز جو آج تک مجھے حیران کرتی ہے اور جس کے حوالے میں انہیں بڑا آدمی سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ ہرلڑکے پر خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، کتنا ہی بیک گراؤنڈ میں کیوں نہ رہتا ہو نظر رکھتے تھے اور توجہ دیتے تھے۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔

یہ واقعہ ۱۹۵۶ء کے اواخر کا ہے۔ ۱۴ پنجاب سنٹر جہلم میں بوائز کمپنی اتھلیٹکس کے مقابلے ہو رہے تھے۔ فیلڈ مارشل آکنلک مہمان خصوصی تھے۔ کالج کی ٹیم میں، میں بھی تھا۔ کئی ٹریک مقابلوں میں، میں نے امتیاز حاصل کیا۔ کئی امتیاز اور سندنامے ملے۔ کالج کی ٹیم میں سے ۱۵۲۸ عنایت (اب کرنل عنایت) کا نام یاد رہ گیا ہے۔ وہ غالباً اس لئے کہ ٹریک مقابلوں میں اسکی پوزیشن بھی بہت اچھی رہی تھی۔ میرے ساتھ مقابلہ رہتا تھا۔ یہ بات ۱۹۵۶ء کی ہے جب تقریباً ۲۲ یا ۲۳ برس کے بعد ۱۷۰۰ افضل کا ان سے لارنس کالج میں ان سے ملنا ہوا۔ تو افضل نے میرا ذکر کیا تو بولے کون؟ ایتھلیٹ منصور! گویا میں انہیں یاد تھا۔ بس میں ان کی اس خصوصیت کو نہیں بھول سکتا۔ جب افضل نے یہ واقعہ مجھے سنایا تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ زندگی کی راہوں اور شاہراہ میں انسان اکیلا

بھٹکتا رہتا ہے یہ مبہم سی خواہش لئے کہ کوئی اسے جانے کوئی پہچانے۔ رفیق صاحب نے یہ کام کیا۔ ان کے پہچاننے سے ہمیں اپنے آپ کو پہچاننے میں آسانی ہوئی اور اپنی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہوا۔

۱۶۸۵ عبدالقدوس

بریگیڈئر رفیق کے اصلاح کرنے کے اپنے طریقے تھے۔ وقت کی پابندی چونکہ کام کی طرف رویے کی نشانی ہے اسلیئے وہ وقت کی پابندی پر بڑا زور دیتے تھے۔ اس زمانے میں ہر ہفتہ ایک کمپنی فائر فائیٹنگ ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ جب مشق کے لئے فائر الارم ہو تو اس کمپنی کو فوری طور پر آگ بجھانے کا سامان لے کر آگ کی جگہ پہنچنا ہوتا تھا۔ باقی سارے کالج کو منجملہ تمام سٹاف اور ہر درجہ کے ملازمین کے اس جگہ جمع ہونا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ فائر الارم ہوا کچھ لڑکے ذرا دیر سے پہنچے۔ تو انکی سزا یہ تجویز ہوئی کہ آج سے چلنا بند جہاں جانا ہو میس، کلاسز، مسجد، کالج ہال، ایک ڈارم سے دوسری ڈارم میں غرض ہر جگہ ہر موقع پر یہ لڑکے بھاگتے ہوئے جائیں گے اور آئیں گے، ان کے لئے مارچ کرنا بھی ممنوع تھا۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ بڑی مشکلوں سے معافی ملی لیکن دل میں عہد کر لیا کہ آئندہ کہیں لیٹ نہیں ہونا۔

اسی طرح ایک لڑکے کے بارے میں شکایت ملی کہ بڑا بدتمیز ہے۔ سینئرز کو سیلوٹ نہیں کرتا اس کو یہ حکم دیا کہ جو پیڑ یا کھمبا راستے میں آتے جاتے نظر آئے اس کو ایک ہفتے تک سیلوٹ کرنا ہے۔ وہ بیچارہ دوسرے دن آ گیا۔

"سر، میری توبہ ہے مجھے معافی دی جائے۔ اگر اب کبھی ایسی غلطی ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا"

۱۶۹۰ میجر محمد ریاض

جولائی ۱۹۵۲ء میں کرنل رفیق کے کالج میں آنے کے چند ہفتے بعد کا قصہ ہے کہ ۱۵۲۳ کاظم نے، میں نے، اور ایک لڑکے نے جسکا ۱۳ سو کچھ نمبر تھا سنڈے منانے کا پروگرام بنایا۔ سنڈے منانے کا مطلب یہ تھا کہ شہر کے سینماؤں میں پہلا، دوسرا اور تیسرا، تینوں شو دیکھے جائیں۔ جب ہم تیسرا شو دیکھ کر سائیکلوں

پر واپس آ رہے تھے تو کرنل صاحب کی موٹر بائیک کی جہلم کلب کی طرف سے آنے کی آواز سنائی دی۔ ہم ایک طرف ہو گئے جب وہ گزر گئے تو سائیکلوں کو جی ٹی روڈ پر دوڑاتے اور سیٹیاں بجاتے کالج کے بیک گیٹ سے آکنلک ہاؤس آ گئے ۔ میں نے کاظم سے کہا لو بھئی دوہرا مزا آئے گا۔ سینما بھی دیکھا صبح کی پی ٹی بھی گول کریں گے۔ کمانڈنٹ اس وقت کلب سے نکلے ہیں تو صبح پی ٹی پر کب آسکیں گے۔ چنانچہ ہم لمبی تان کے سو گئے۔ صبح سی ایم امان اللہ نے ہمیں چادریں کھینچ کھینچ کے جگایا کہ چلو پی ٹی پر۔ ہم نے لاکھ کہا کہ آج نہیں جانا نیند پوری کر لینے دو لیکن وہ نہ مانا اور زبردستی اٹھا کے لے گیا۔ کاظم نے امان اللہ سے کہا کہ اچھے یار ہو ایک دن کی پی ٹی بھی گول نہیں کرنے دیتے۔ میں نے کہا یار آج انہیں نہیں آنا۔ رات ایک بجے تو وہ کلب سے نکلے ہیں اتنے میں وہ گراؤنڈ میں وارد ہو گئے ۔ امان اللہ بولا وہ دیکھ تیرے چچا آ گئے۔ واقعتاً وہ وقت سے پہلے موجود تھے۔ پھر اس نے وہ حجام والا قصہ سنایا کہ کس طرح رات کے چار پانچ بجے اور تین بجے آ کر ہاؤس میں منظور نائی کو چیک کیا اور آخر ایوب کی وہ مرمت کی کہ حد نہیں۔

اسی زمانے کا ایک اور قصہ ہے ہم نے آکنلک ہاؤس کے کچن میں انڈے کا حلوہ بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس کے لئے کچھ انڈے رابرٹس ہاؤس کے کچن سے لانے تھے۔ وہاں کے سی کیو ایم سے پہلے بات ہو چکی تھی۔ ابھی برڈوڈ ہاؤس تک پہنچے ہی تھے کہ وہ اسکین ہاؤس سے نکلتے نظر آئے۔ ہم مہم کو ادھورا چھوڑ کر واپس آ گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد ہم پھر نکلے اب وہ پھر سامنے سے آتے نظر آئے۔ تیسری بار نکلے تو کینٹین کے پاس ایک سایہ سا نظر آیا قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا کہ کرنل صاحب ہی ہیں۔
ہم حیران رہ گئے کہ یہ سوتے کس وقت ہیں یہ باتیں شروع کے دنوں کی ہیں پھر تو ہمیں پتہ چل گیا کہ ہمارا پالا ایک جن سے پڑا ہے جس نے ہوسٹل لائف کا سارا مزا کرکرا کر دیا ہے۔

۱۶۹۲ لیفٹیننٹ کرنل مہدی حسن

ملٹری کالج میں میرا زمانہ تعلیم ۱۹۴۸ء سے اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ہے۔ کرنل رفیق جولائی ۵۲ء میں پہلی بار آئے۔ اس طرح صرف چند ماہ مجھے ان کے زیر تربیت رہنے کا موقع ملا۔ یہ دن بھی وہ دن تھے جب میں اا پی ایم اے کیلئے آئی ایس ایس بی کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن اوائل ستمبر ۵۲ء میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے زندگی بھر کے لئے سبق سکھا دیا۔

ہوا یوں کہ وہ آ کنلک ہاؤس میں کھانا چیک کرنے آئے۔ کھانا اس دن کسی وجہ سے خراب پکا تھا۔ انہوں نے چکھا اور کہا یہ ٹھیک نہیں۔ دوسرا پکواؤ۔ دوسرا؟ کھانے کی گھنٹی بجنے ہی والی تھی میں سینئر کیڈٹ آفیسر تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا سر، یہ ناممکن ہے۔

یہ سن کر انہوں نے کہا" کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکالنا جس کو پہلے امپاسبل سمجھتے ہو وہ پاسبل کیسے ہوگا۔ بلاؤ سی کیو ایم ایس اور سی ایس ایم کو۔"

مختصر یہ کہ پھر ہم نے بھاگ دوڑ کی اور بازار سے سبزی منگوا کر گھنٹے سوا گھنٹے بھر میں کھانا میز پر لگوا دیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ہم تینوں کو شاباش دی۔ پھر مجھ سے کہا زندگی میں بار بار ایسے مراحل آتے ہیں جب کوئی کام ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن جو کام ناممکن نظر آئے ضروری نہیں کہ واقعہ ہی ناممکن ہو۔ اگر ہے بھی تو اس کا حل ڈھونڈنا چاہیے۔ میں نے تمہارے کاغذات دیکھے ہیں تم کمیشن کے لئے جا رہے ہو۔ تمہاری کارکردگی سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم سیلیکٹ ہو جاؤ گے اور ان کی ہمت افزائی سے میں سیلیکٹ بھی ہوا لیکن اس سے بڑھ کر وہ سبق تھا جو اس تجربے سے سیکھا۔ کہ چیلنج خواہ کتنا ہی بڑا ہو اس کو فیس کرنا چاہیے۔ میں نے پوری سروس میں ان جیسے Drive اور Push پش کا آدمی نہیں دیکھا۔

۱۷۰۰ راجہ محمد افضل

یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ ہم لوگ کھاریاں کی طرف شکار کے لئے گئے اس شکار پارٹی میں کوئی تیس پینتیس آدمی تھے۔ لڑکوں میں ۱۶۴۰ حفیظ، ۱۵۲۳ کاظم کمال، ۱۶۹۳ ہاکی والا امان اللہ، ۱۷۳۸ سلطان، ۱۸۲۶

اکرم، ۷۰۹ امنور کے نام یاد رہ گئے ہیں۔اسٹاف میں لیفٹیننٹ راؤ صاحب اور مسٹر شمسی تھے۔ جمعہ کے دن رات کو کھاریاں کے قریب ایک گاؤں میں پہنچے۔ دارے یا مہمان خانے میں ہم سب لوگوں کے لئے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ نمبردار نے ہماری خاطر تواضع کا خاصہ اہتمام کیا تھا۔صبح سویرے مرغابیوں کے شکار کے لئے جھیل پر پہنچے۔ گنیں تو چار پانچ ہی تھیں تین اسٹاف کے پاس اور دو سے باری باری ہم شوق فرماتے تھے۔ دوپہر کو وہیں کھانا کھاتے شام کو دن ڈھلتے واپس آتے اور شکار کو بھون کر کھاتے۔ یہ سلسلہ ہفتہ اتوار دو دن چلا۔ بہت انجوائے کیا اتوار کی شام واپس آرہے تھے تو رفیق صاحب نے اپنی گن خود اٹھائی ہوئی تھی۔ ہم میں سے کئی نے اصرار کیا کہ سر، ہمیں دے دیں لیکن وہ نہ مانے۔ واپسی پر ہم لوگ چپ چاپ چلے آرہے تھے۔انہوں نے کہا کچھ گاؤ چپ کیوں ہو۔ کاظم فوراً شروع ہوگیا۔چل چل رے نوجوان چلنا تیرا کام، اسکی دیکھا دیکھی ایک دو اور نے بھی تانیں اڑائیں۔ کاظم تو بے باک تھا۔اس نے کہا سر، آپ بھی کچھ سنائیں کرنل صاحب نے جواب دیا۔ "مائی اردو از ناٹ گڈ" کاظم فوراً بولا میں اردو میں سنانے کے لئے نہیں کہہ رہا انگریزی میں کوئی چیز ہوجائے۔ چنانچہ چلتے چلتے کئی ٹیونیں وسل کیں اور مجھے خیال پڑتا ہے کہ انہوں نے کوئی ملائی گانا بھی سنایا تھا۔ اسکے ختم ہونے پر بڑی زوردار تالیاں بجی تھیں۔

اس وقت تو ہم خوش تھے کہ دیکھا کرنل صاحب سے بھی گانا گوالیا نا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ان کا ہمارے ساتھ شکار پر ساتھ رہنا اور کھانا پینا اور بے تکلفی سے گانا سب سوچی سمجھی تدبیریں تھیں ہماری تربیت کے لئے۔ ایک اور واقعہ بھی یاد آرہا ہے جس سے کم از کم میں نے بہت اثر لیا۔ یہ واقعہ باکسنگ رنگ کا ہے۔ انٹر ہاؤس باکسنگ کے مقابلے ہورہے تھے جہاں آجکل کالج آڈیٹوریم کا سٹیج ہے۔اس جگہ باکسنگ رنگ تھا۔اسٹاف کے لئے رکھے گئے صوفے پر کرنل صاحب بیٹھے تھے۔ اور ان کے ساتھ ہی مسٹر اقبال بیٹھے تھے۔ کرنل صاحب نے پہلے ان کو سگریٹ آفر کیا اور پھر لائٹر سے بے خیالی

میں پہلے اپنا سگریٹ سلگالیا۔ سلگاتے سلگاتے انہیں خیال آ گیا۔ فوراً آئی ایم ساری کہا۔ اپنا سگریٹ زمین پر پھینکا پھر پہلے انکا سگریٹ سلگایا اسکے بعد نیا سگریٹ نکال کر اپنے لئے سلگایا۔ یہ پورا منظر فلم کی طرح میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔

آخر میں ایک ایسا واقعہ بھی ذکر کرنا چاہوں گا جس کا تعلق مجھ ہی سے ہے۔ یہ بات ۵۳ء کے شروع کے دنوں کی ہے، میں آرمی کلاس میں آئی ایس ایس بی کی تیاری کر رہا تھا کہ گھر سے اطلاع ملی کہ رشتہ داروں سے کچھ جھگڑا ہوا ہے۔ میں بہت پریشان ہوا کچھ اس لئے بھی کہ ہمارے گھر میں کوئی تھانے کچہری کا چکر لگانے والا نہ تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے تذکرہ کیا انہوں نے کہا جو زیادتی ہوئی ہے۔ اسے ایس پی کے نام ایک درخواست میں لکھ دو میں نے کہا میں کیسے لکھوں میں نے کبھی اس طرح کی درخواست نہیں لکھی تو انہوں نے خود ایس پی کو لکھا اور ایس ایچ او کو کالج میں بلایا اور کہا جو کچھ افضل سے پوچھنا ہے یہیں پوچھ لو۔ اسطرح کی کرم فرمائی وہ ہر کیڈٹ پر کرتے تھے۔ سزا بھی خلوص سے دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اپریل ۱۹۵۳ء میں یکا یک ان کا تبادلہ ہوا تو کاظم جیسے لڑکے جن کی انہوں نے سخت پٹائی کی تھی ان کے جاتے وقت آنسوؤں سے روئے۔

۱۰۷ احمد یونس کیانی

رفیق صاحب کے بارے میں میرا تاثر ان کے پہلے ایڈریس کے بارے میں ہے۔ کالج ہال کے دائیں دروازے پر اسسٹنٹ کمانڈنٹ اور چیف انسٹرکٹر میجر اے ایچ ابراہیم کے خیر مقدمی سیلوٹ کا جس سمارٹ انداز سے انہوں نے جواب دیا اور جن قدموں سے وہ ڈائیس کی طرف بڑھے میں اس منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ پہلی چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ ان کا بے حد سمارٹ ٹرن آؤٹ تھا اور اس سے بھی زیادہ متاثر کن عقابی آنکھیں۔ چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے جیسے وہ کسی میدان جنگ کی کمان سنبھال رہے ہوں۔ ہال میں سناٹا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز تھیں اور سب کی آنکھیں روسٹرم پر

مرکوز تھیں۔ وہ ڈیڑھ گھنٹہ بولے مجھے الفاظ یاد نہیں انداز یاد ہے۔ انکی آواز کی گونج نے، ان کے پرعزم طریق نے، ان کے لہجے کی قوت نے، ان کی سوچ کی صداقت نے ہمیں دل کی گہرائیوں تک ہلا کر رکھ دیا۔ جب ایڈریس ختم ہوا اور ہم لوگ آئے تو ہم لوگ وہ نہیں تھے جو ہال میں جاتے وقت تھے۔ ملٹری کالج میں ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

ان کے لیکچر نے ہمیں اپنی تعلیم کی بلکہ اپنی زندگی کی نئی مقصدیت سے آگاہ کیا ایک واقع اور قابل فخر منزل کا شعور دیا اور سب سے بڑھ کر یہ امنگ کہ ہم ایک آزاد اور نئی مملکت کے دست و بازو ہیں ہمیں کچھ کرنا ہے ہم کچھ کر سکتے ہیں اور پھر کالج میں ایک بالکل نئے ٹیمپو سے کام شروع ہوا۔ ایسا ٹیمپو جس میں ہماری امنگیں شامل تھیں۔ وہ دن کالج میں انقلابی تبدیلیوں کے دن تھے ہر صبح ایک نیا پیغام لاتی تھی اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز سامنے آتی تھی۔ ہر طرف ایک ہلچل تھی۔ ایمرجینسی کا سا سماں تھا صبح سے شام بلکہ رات گئے تک کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا اور جو سستی کرتا یا دائیں بائیں چلنے کی کوشش کرتا اس کے لئے سخت اور فوری سزا تھی۔ چونکہ وہ خود ہر جگہ موجود تھے اور ہر کام کی خود نگرانی کرتے اس لئے کسی کے بچ کر نکل جانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

اس زمانے کی تبدیلیوں کو میں اب یاد کرتا ہوں اور ان کا تجزیہ کرتا ہوں تو میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ان کا فلسفہ تعلیم یہ تھا کہ ہمیں اپنی پہچان ہو کہ ہم کیا ہیں۔ ہماری منزل کیا ہے ان کا زور دریافت پر تھا، انفرادیت کی جستجو پر تھا۔ اس نقطہ کو میں مثالوں سے واضح کروں گا۔

۱۴ اگست ۱۹۵۲ء کو یوم آزادی کے موقع پر سیدھی سی عام بات تو یہ ہوئی کہ اس روز چھٹی کی جائے۔ لڑکے اور استاد آرام کریں یا سیر و تفریح میں دن گزاریں۔ لیکن انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے ۱۴ اگست کو کس طرح منایا؟ اس زمانے کے لڑکوں اور استادوں کو یاد ہوگا۔ مجھے بھی یاد ہے کہ انہوں نے سب کالج کو جمع کیا اور کالج کے گیٹ کے سامنے سڑک کے اس پار جو تین کھیل کے میدان ہیں ان کے چاروں طرف باڑ

لگوائی شیشم کے درخت لگوائے اور اس پروجیکٹ میں اسٹاف بھی شریک ہوا۔ بعد کو ہر ایک لڑکے کو ایک ایک پودے کو صبح سویرے پانی دینے کی ذمہ داری دی مقصد کیا تھا؟ پاکستان سے تعلق استوار کرنا تھا۔ اس بات کا احساس دلانا تھا کہ "قومی مفاد کو مستحکم کرنا بھی ہماری ایک ذمہ داری ہے۔ کچی عمر میں بچے ہر ایک بات نہیں سمجھتے لیکن رویے اس عمر میں ہی بنتے ہیں۔ پاکستانیت کا پہلا سبق میں نے ملٹری کالج میں ہی پڑھا تھا اور اس بات کا شعور مستحکم کرنے کے لئے کہ ہم ملٹری کالج کے فرزند ہیں۔ اور قابل فخر فرزند ہیں اور اس فرزندی کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں انہوں نے پیتل کی پتی پر کالج کا نام کندھوں پر لگوانے کے لئے بنوایا۔ کلاس کے تشخص کے لئے کلاس کا نشان بازو پر لگوایا۔"

کرنل رفیق نے ہمیں قطار (پریڈ) اور کتاب کی محدود دنیا سے نکال کر کھلی فضا میں اپنے دست و بازو آزمانے کی لذّت اور افادیت سے آشنا کیا۔ باغبانی، ہائیکنگ، رائیڈنگ جیسے آؤٹ ڈور مشغلوں کی انہوں نے ہمت افزائی کی۔ رائیڈنگ کا ذکر آیا ہے تو یہ لطیفہ بھی سناتا چلوں کہ رائیڈنگ کے لئے ہم کیپٹن اسماعیل کا گھوڑا استعمال کیا کرتے تھے۔ جس کو اس کے اصطبل سے نکالنا تو ایک مرحلہ تھا۔ میں عمر حیات اور کاظم کمال تین اس کو مار مار کر لائن پار تک لاتے تھے لیکن واپسی میں وہ ایسی برق رفتاری دکھاتا تھا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا صرف کاظم شہید اسے قابو کرتا تھا بعد کو پتہ چلا کہ کیپٹن اسماعیل نے اپنے سائیس کو حکم دے رکھا تھا کہ صرف رائیڈنگ سے واپسی پر اسے چارہ ڈالا جائے۔

اب میں اس دور کے چند واقعات لکھتا ہوں جو مجھے خاص طور پر یاد رہ گئے ہیں۔ پہلا واقعہ ۱۷۸۰ محمد رقیب کی حادثاتی موت کا ہے۔ وہ بھی اسکین ہاؤس میں میری طرح کیڈٹ سارجنٹ تھا۔ ہاکی کھیلتے ہوئے سر میں چوٹ لگی اور پھر جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے انتقال پر کرنل رفیق کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص جو بظاہر سنگ خار نظر آتا ہے رقیق القلب بھی ہے۔ رقیب کی میت کو آنسوؤں سے آخری سلام کر کے ہاؤس واپس آیا تو انسان کی خود غرضی، تنگ نظری اور بے حسی کا بھی ایک نظارہ دیکھا۔ میں اسے

بھی لکھنا چاہتا ہوں میں نے دیکھا کہ رقیب کالا کر کھلا پڑا ہے اور لڑکوں نے اس کی کٹ کے نئے آئیٹم پرانوں سے بدل لئے ہیں حد یہ کہ ہاکی بھی بدلی جا چکی ہے۔ اللہ اکبر! اس کا نام دنیا ہے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا ہے اس کا تعلق کرنل رفیق سے ہے۔ ان کا تقریر کرنے کا ایک خاص انداز تھا۔ ایک روز پریپ میں کلاس (دسویں اے) کے سامنے ان کے لب ولہجہ اور سٹائل میں ان کی نقل اتار رہا تھا وہ یکا یک کھڑکی پر نمودار ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی میں ایک دم چپ ہو گیا۔ میں کیا ساری کلاس سمجھی کہ اب شامت آئی۔ لیکن انہوں نے برا نہیں مانا۔ بلکہ مسکرا کر کہا" کیری آن آئی وانٹ ٹو لسن ٹو یو" چنانچہ میں نے وہ تقریر پھر دہرائی۔ خوش ہوئے۔ مجھے شاباش دی اور چلے گئے۔ جاتے وقت صرف اتنا کہا۔ لیکن پریپ پڑھنے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ شرارت، شوخی، بدتمیزی اور حکم عدولی میں فرق کرتے تھے۔

ان کے چارج لیتے ہی جو بالکل نئے فنکشن ہوئے ان میں سے ایک برنیس ٹرسٹ تھا، دوسرا ایلوکیشن کانٹیسٹ۔ خطابت کے اس مظاہرے میں حیدری صاحب کے بعد انہوں نے خود بھی حصہ لیا۔ اور ابراہام لنکن کی مشہور زمانہ گیٹبرگ اسپیچ کی تھی جس کے معروف الفاظ یہ ہیں۔

THE BRAVEMAN LIVING AND DEAD WHO STRUGGLED HERE CONSECRATED IT (GROUND) FAR ABOVE OUR POWER TO ADD OR DETRACT. THE WORLD WILL LITTLE NOR LONG REMEMBER WHAT WE SAY HERE BUT IT CAN NEVER FORGET WHAT THEY DID HERE.

اس تقریر میں وہ فقرہ آتا ہے جو اب کلاسک بن گیا ہے۔

This Nation Under God Shall Have a new Birth of Freedom and that Government of the People, by the People, for the

People shall not Perish from the Earth.

اس خطابتی مقابلے میں میں نے خود جان رسکن کی وہ تقریر پیش کی تھی جو اس نے رائل ملٹری کالج وولوچ کے کیڈٹس کے سامنے کی تھی۔ یہ تقریر رکسن کی کتاب دی کراؤن آف وائلڈ اولیو سے لی گئی تھی۔ اسی زمانے میں اردو کا ایلوکیشن کا نٹیسٹ بھی ہوا تھا جس میں واجد اور میں نے خوشی محمد ناظر کی نظم'' جوگی'' پورے ڈرامائی تاثر کے ساتھ پیش کی تھی۔ واجد جوگی بنا تھا اور راکھ ملے جوگی کا روپ دھارے جوگیوں کی طرح آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔

کاروان زندگی کی وہ پہلی منزل نہیں بھولتی۔ اب بظاہر خزاں ہے لیکن بوئے گل ونسترن باقی ہے۔

۷۳۴۳ وارنٹ آفیسر اورنگزیب خان

"اورنگ زیب آپ کو کرنل رفیق کی کوئی بات یاد ہے؟"

سر، کوئی خاص بات یاد نہیں میں کالج میں بنگلور سے آیا تھا اور عام سا کیڈٹ تھا۔ کبھی ان سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا۔ نہ بہت اچھوں میں تھا نہ بروں میں۔

" آپ نے ابھی کہا آپ بنگلور کے کے جی آر ملٹری کالج سے آئے تھے وہاں کے کمانڈنٹ کو دیکھا یہاں بھی دو تین کمانڈنٹوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ فوج میں اور بہت افسروں کو دیکھا ہوگا ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کا تاثر ان کے بارے میں کیا ہے؟"

"تاثر تو بہت واضح ہے۔"

''کیا؟"

"یہی کہ بارعب بہت تھے ایک طرح کا قدرتی رعب تھا۔"

"سخت تھے اس لئے؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے ڈسپلن کی پابندی کرانے میں وہ سخت ضرور تھے لیکن انفرادی طور پر جولڑکا ان سے

ملتا تھا اور کوئی پرابلم بتاتا تھا تو اس سے بہت اچھی طرح ملتے تھے گو خود مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

لیکن جو بھی کسی کام سے ملتا تھا تعریف ہی کرتا تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔"

"مثلاً"

"مثلاً جب انہیں دیکھا کام کرتے ہی دیکھا اس سے خود بھی کام کرنے کا شوق ہوا۔ اور ایسی عادت پڑی کہ ۶۵ء کی لڑائی میں سب سے آگے رہا"

"اسکی تفصیل کیا ہے؟"

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں، میں اپنی یونٹ ۱۳ انجینئر کے ساتھ قصور سیکٹر میں تھا۔ اسی یونٹ میں ملٹری کالج ہی کے صوبیدار سجاول خان تھے اور ایک اور میجر صاحب جن کا نام یاد نہیں آ رہا۔ ایک دن رات کو یک دم سیٹیاں بجنے لگیں کہ کیمپ پر کمانڈو حملہ ہو گیا ہے اس موقع پر کرنل رفیق کی سکھلائی کا فرق معلوم ہو گیا۔

"وہ کیسے"

وہ اس طرح کہ پلاٹون کے سارے آدمیوں نے ماسوائے میرے پہلے بوٹ پہنے اور پھر ساز و سامان کی فکر کی میں نے سوچا اس وقت ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہتھیار اور ایمونیشن کی ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً برین گن اور ایمونیشن بکس اکیلے اٹھایا حالانکہ برین پر دو آدمی کام کرتے ہیں۔ پاؤں اور سر سے میں ننگا تھا۔ بھاگتے وقت راستے میں ایک سنتری ملا اسے بھی ساتھ لیا کہ تم مجھے میگزین بھر بھر کر دینا پھر میں جانوں اور دشمن۔ باقی یونٹ نے کیمپ کے اردگرد پوزیشن لی اور میں اکیلا سب سے آگے ایک ٹیکری پر برین گن فٹ کر کے دشمن کی گھات میں بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرا پلاٹون کمانڈر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا اورنگ زیب پیچھے آ جاؤ۔ اب تم دشمن اور اپنی بٹالین کے درمیان ہو، دونوں طرف کا فائر تم پر آئے گا۔ میرا یہ کرنا اس جوش کی وجہ سے تھا جو رفیق صاحب نے پاکستان کیلئے ہمارے دلوں

میں بھر دیا تھا۔دوسرے دن میں جدھر بھی جاتا یہی آواز آتی ۔مان گئے رزرویا۔ آخر ہے نا کے جی ۔"رزرویا"اس لئے میں رن کچھ کی لڑائی پر ری کال ہو کر گیا تھا تو جناب یہ نتیجہ رہا کرنل رفیق کی سکھلائی کا۔

۳۸۔ابر یگیڈ ئر (ریٹائرڈ) سلطان احمد ستارہ جرأت دو بار

رفیق صاحب کا احساس عدل غیر معمولی (آؤٹ سٹینڈ نگ) تھا ان کے زیر کمان ہر فرد کو یقین ہوتا تھا کہ سزا ہو جزا اسے ہر قیمت پر انصاف ملے گا۔ یہ بات کہنے میں آسان نظر آتی ہے کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔ان کے موثر ہونے کا راز ان کی غیر معمولی CREDIBILITY میں تھا۔

جرأت بھی تھی ۔۱۹۵۲ء کا کوئی فنکشن تھا۔ چیف گیسٹ وقت سے چند منٹ پہلے آ گئے تھے۔انہیں انھوں نے استقبال کی جگہ پر ٹھہرائے رکھا اور وقت پر تقریب میں آنے دیا۔ مجھے یاد ہے اس واقعہ سے لڑکوں نے بڑا اثر لیا۔نو جوان آئیڈیل کی تلاش میں ہوتے ہیں ۔ جرأت مندی اور مہم جوئی انہیں بہت متاثر کرتی ہے۔

ایک اور خصوصیت جو یقیناً دوسروں نے بھی نوٹ کی ہوگی انکی ٹوٹل کمٹمنٹ کی خصوصیت تھی ۔صبح شام گھوڑے یا سائیکل پہ کالج کے سارے رقبے کا چکر لگاتے تھے غالباً ایکسر سائز کرتے ہوئے کالج کے بارے میں سوچتے تھے۔لڑکوں کی سوچ کو ترقی دینا ان کی پہلی دلچسپی تھی اور وہ تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے موقعوں کو بھی تربیت کا ذریعہ بنا لیتے تھے جہاں عموماً ذہن تربیت کے پہلو کی طرف نہیں جاتا۔مثلاً ۱۹۵۳ء کے اوائل میں ہاکی کھلیتے ہوئے ۸۰۷ احمد رقیب کی موت کا واقعہ آپ کو یاد ہو گا اس حادثے سے سب لڑکے بہت دلگیر تھے کالج کے دفتر کے سامنے یوکلپٹس کے اونچے اونچے درختوں سے گھرا ہوا جو میدان تھا۔ وہاں انہوں نے لڑکوں کو اکٹھا کیا۔ بڑی جذباتی تعزیتی تقریر کی لیکن تان اس فقرے پہ ٹوٹی کہ زندگی خدا کا انعام ہے۔ہمیں اس کی قدر کرنی

چاہیے۔اور پھر ہر لمحہ سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس طرح تعزیت سے بھی انہوں نے تربیت کا کام لیا۔رقیب کے حادثے سے پہلے ہم یہی سمجھتے تھے کہ اس شخص کے سینے میں دل نہیں۔اس موقعہ پر ان کی جو حالت ہم نے دیکھی اس نے ہمیں چونکا دیا۔اندر سے وہ بہت مختلف تھے ان کی جذباتیت کا ایک نا قابل فراموش منظر بھی میں نے دیکھا ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۷۵ءیا ۱۹۷۶ء کا ہے ان کی پرانی پلٹن ۱۹ پنجاب نے جس کے وہ کرنل کمانڈنٹ بھی تھے انہیں شہیدوں کی یاد کی تقریب میں بلایا تھا۔میں بھی مدعو تھا۔بحیثیت مہمان خصوصی کے وہ سب سے آخر میں روسٹرم پر اختتامی تقریر کرنے گئے۔لیکن ہوا یہ کہ مائیک کے سامنے پہنچتے ہی ان کی آواز رندھ گئی بلکہ شدت جذبات سے چوک گئی۔وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے اور ان کے آنسو بہنے لگے۔ان کے آنسوؤں کو بہتے دیکھ کر جوان دھاڑیں مار کے رونے لگے۔عجیب منظر تھا۔اپنے شہید ساتھیوں کو اس طرح نذرانہ محبت کا کیا کسی نے پیش کیا ہوگا اور یہ سب کچھ پلٹن کے کرنل کمانڈنٹ بریگیڈئر رفیق کے حوالے سے ہو رہا تھا۔

اب میں ان کی ملٹری لیڈر شپ کے ایک دو واقعات بیان کرتا ہوں۔یہ واقعہ اگست ۱۹۶۵ء کے اواخر کا ہے۔مجھے حکم ملا تھا کہ میں دشمن کے علاقے میں کمانڈو کارروائیاں کروں۔چنانچہ میں اپنے سو باقاعدہ فوجیوں اور پانچ سو مجاہدوں کے ساتھ بریگیڈئر رفیق کی فارمیشن ۲ بریگیڈ راولاکوٹ کے علاقے سے گزرا۔یہ وہ وقت تھا جب انڈین آرمی حاجی پیر پاس پہ قبضہ کرکے راولاکوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور کہا، سلطان آپ کمانڈو ایکشن پر جا رہے ہیں۔اسکی اپنی اہمیت ہے لیکن اس وقت ہمیں اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے آپ لوگوں کی ضرورت ہے۔

میں نے عرض کیا سر، مجھے جو حکم ملا ہے وہ بجا لانے نکلا ہوں۔آپ اوپر بات کیجئے۔انہوں نے فوراً جی ایچ کیو سے رابطہ کیا اور میرے لئے آرڈرز لے لئے اور مجھے فوراً ایک اہم پل حاجی پیر یا اس کے جنوب

مشرق میں اوراوڑی پونچھ روڈ کے شمالی طرف ڈنہ شہباز خان کے دفاع پر لگا دیا۔اللہ کا شکر ہے کہ میں اور میرے آدمی ان کے اعتماد پر پورے اترے، دشمن کے ایڈوانس کو چیک کیا۔شدید لڑائی ہوئی۔دونوں طرف کا سخت نقصان ہوا،شہیدوں اورزمیوں کے ڈھیر لگ گئے۔

سینئر افسروں کا اپنے کمان بنکروں سے نکلنا اور ایڈوانس ٹروپس کا وزٹ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔لیکن بریگیڈئر رفیق صحیح معنوں میں فیلڈ کمانڈر تھے۔وہ ڈنہ شہباز کے علاقے میں ایڈوانس مورچوں کا وزٹ کرتے رہے بلکہ سارے معرکے میں ہمارے ساتھ رہے۔ان کی موجودگی میرے لئے بڑے انسپائریشن کا باعث رہی۔لڑائی میں کمانڈر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ ٹروپس کوانسپائر کرسکے۔یہ امتیاز بریگیڈئر رفیق کو بدرجہ اتم حاصل تھا۔وہ اپنے آپ کو خطرے کے سامنے ایکسپوز کرنے سے گریزنہیں کرتے تھے۔اس زمانے میں دیر باجوڑ سے ایک لشکر آیا ہوا تھا۔انہوں نے اس میں بھی جذبے کی نئی روح پھونکی۔انہی دنوں مقبوضہ کشمیر سے مہاجر بھی آرہے تھے۔ان کی دیکھ بھال کرنے میں بھی انکا انہماک دیدنی تھا۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔۱۹۷۴ء میں جنگی اسیری کے بعد جب میں اپنے بیٹے حیدر سے لارنس کالج میں ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ میں غلط دن آ گیا ہوں۔اس دن والدین کو اپنے بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔جب حیدر کے ہاؤس ماسٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں جنگی اسیری کاٹ کر آرہا ہوں تو انہوں نے کہا آپ کا سپشل کیس ہے آپ پرنسپل سے بات کردیکھئے۔یوں بھی آپ ان کے شاگرد ہیں۔میں نے کہا تبھی تو میں ان سے بات کرنا نہیں چاہتا۔میں انہیں خوب جانتا ہوں۔

۱۷۳۹ء لیفٹیننٹ جنرل پیرداد خان (ستارۂ جرأت)

ملٹری کالج کا نام ذہن میں آتے ہی جو ایک تصویر فوراً میرے ذہن میں ابھرتی ہے وہ بریگیڈئر محمد رفیق کی تصویر ہوتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ میرا ہی حال نہیں یہ تجربہ ہر اس عالمگیرین کا ہوگا جو خوش نصیبی سے

ان کے دور میں ملٹری کالج کا طالبعلم رہا ہے۔اس عمر میں اور اپنے کیریر کی اس منزل میں آکراور زندگی کے بہت سے نشیب وفراز دیکھ کراور بے شمار افسروں اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ افراد سے مل کر یہ میری پختہ رائے ہے کہ زمانہ طالب علمی میں اور زمانہ تربیت میں غیر معمولی ذہن اور کردار کے اساتذہ سے واسطہ غیر معمولی اثرات رکھتا ہے۔ذہن لاشعوری طور پر اونچے معیاروں اور بلند رویوں سے متاثر ہو جاتا ہے اور وقت آنے پر ان منزلوں کی طرف قدم خود بخود اٹھ جاتا ہے۔

بریگیڈئر رفیق کالج میں دو بار کمانڈنٹ رہے۔ میں ان کے پہلے دور میں ان کا طالب علم رہا ہوں۔ یہ دور مختصر رہا پورا سال بھی نہیں لیکن میں نے ان سے لازوال اثرات قبول کئے۔کسی فرد کو ادارہ بن جانے کی سعادت آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بریگیڈئر رفیق کا نام ملٹری کالج کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیونکہ انہوں نے ملٹری کالج کو ایک کردار دیا، ایک انفرادیت دی اور ایک امتیاز دیا۔اس انفرادیت کی اب میں تھوڑی سی توضیح کرنا چاہتا ہوں۔

قیادت اور سیادت کی صفات کا تذکرہ کتابوں میں بھی ملتا ہے۔لیکچروں اور تقریروں میں بھی ان کی خوبیوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اسلئے ہر طالب علم جانتا ہے کہ لیڈرشپ کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کی صفات کیا ہیں۔ اچھا قائد یا افسر کون ہوتا ہے یا اچھے قائد کو کیسا ہونا چاہیے۔لیکن جاننے سے بات نہیں بنتی۔ اس کے لئے سب انسانوں کو خاص طور پر طالب علموں کو ایک حوالہ چاہیے۔ ایسا انسان چاہیے جو ان صفات کا جیتا جاگتا نمونہ ہو، انکی ایک زندہ مثال ہو جو قلب کو گرما دے اور جو روح کو تڑپا دے۔

بریگیڈئر رفیق ایک ایسے ہی قائد تھے۔لیڈرشپ کی تمام بنیادی صفات اور خصوصیات انکی ذات میں بلکہ زندگی میں موجود تھیں۔اس لئے وہ بہت موثر انسان تھے۔انکا زور کردار کی تعمیر پر تھا اور خود ان کا کردار پارس پتھر کی تاثیر رکھتا تھا۔ جو بھی ان کے قریب آتا وہ ان کے کردار کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

کردار سازی کا انہیں جنون سا تھا۔ اور خدا نے انہیں اتنی جسمانی توانائی اور قوت برداشت دی تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لئے دن رات ایک کرسکیں۔ کالج کے علاوہ انہیں کسی اور چیز سے نہ کوئی تعلق تھا اور نہ دلچسپی۔ انکی ساری توجہ و توانائی کالج پر مرکوز تھی اور کالج ان کے لئے پاکستان کی علامت تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کا پہلا لیکچر سائنس ہال میں ہوا تھا۔ اور ان کے لب و لہجہ کی گرج سے سارا ہال ہل کر رہ گیا تھا۔ طلبہ کو ڈھیلی ڈھالی نہیں ایسی ہی پر جوش اور پر عزم شخصیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ سخت تھے لیکن انصاف کے ساتھ۔ خلوص کے ساتھ سخت تھے اور ایسی سختی آخر کار طلبہ بہت پسند کرتے ہیں۔ انکی سختی ایک جہاندیدہ باپ کی سختی تھی جو آخر کار آئیڈیل بن جاتی ہے۔

ایک چیز جو میں نے اس زمانے میں خاص طور پر نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کالج کو ایک قومی رخ دینے کی کوشش کی۔ ورنہ اس سے پہلے اس پر تاج برطانیہ کا سایہ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جو سلور جوبلی منائی گئی اور پھر کالج کا جو رسالہ تربیت نکلا اس میں شکر گزاری کے ساتھ جارج پنجم کا تذکرہ بھی موجود تھا اور پورے صفحہ کی بڑی تصویر بھی شامل تھی۔

بریگیڈئر رفیق نے کردار سازی پر جو زور دیا اس کے نتائج میں نے ستمبر اور دسمبر کی جنگوں میں خود دیکھے۔ اے ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں میرے ساتھ کئی عالمگیرینز تھے۔ ان میں ہر ایک جرأت کی تصویر تھا اور پاکستان کے حوالے سے بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ کسی لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ خود قومی مقاصد کی علامت بن جائے۔ بریگیڈئر رفیق کو یہ امتیاز حاصل تھا۔

۱۸۰۸ صوبیدار محمد اکرم

جب کرنل رفیق پہلی دفعہ کالج میں تشریف لائے تو انہوں نے کالج میں آنر سسٹم کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ کیڈٹوں میں اپنی خودی کا شعور پیدا ہو۔ اور وہ اسکی روشنی میں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کریں۔ رجمنٹل سسٹم کے مقابلہ میں جس میں دوسرے کی دی ہوئی سزا کا خوف ہی کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے

کا محرک تھا۔ اس سسٹم کا اجراء ایک جرأت مندانہ تجربہ تھا جو تربیت کے بارے میں ایک نئی سوچ کو ظاہر کرتا ہے۔ کمانڈنٹ صاحب نے پہلے ہر لڑکے کو اپنے دفتر میں بلا کر قرآن پاک پر ہاتھ رکھوا کر آنر کوڈ کی قسم لی۔ یہ چار فقرے تھے۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمہ وقت اپنی بہتری کیلیئے کوشاں رہوں گا۔ میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرونگا جس سے میری، میرے خاندان یا میرے کالج کی بدنامی ہو۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو میں جرأت سے کام لے کر اسکی رپورٹ اپنے سینئر سے کرونگا۔ اور اگر میں نے کسی اور کو غلط کام کرتے دیکھا اور اس نے خود اسکی رپورٹ نہ کی تو اسکی رپورٹ بھی اپنے سینئر کو کروں گا۔ میں عزم کرتا ہوں کہ میں اپنے کالج اور اپنے ملک کا نام سربلند رکھونگا۔ آنر سسٹم کو تقویت دینے کیلیئے ہر ہاؤس میں ایک ایک آنر شاپ بھی کھولی گئی تھی۔ آنر شاپ سے لڑکوں کو عملی طور پر دیانت داری کی تربیت ملی اور انہوں نے ضمیر کی آواز کو ترغیب کے وقت سننا سیکھا۔ یہ ایک تجربہ تھا جو پورے طور پر کامیاب تو نہ ہوا لیکن اسکی اصلی کامیابی یہ تھی کہ طلبہ ڈسپلن کے ایک نئے تصور اور طریقے سے روشناس ہوئے۔ مزید برآں یہ کہ ان کو کچھ آسانیاں بھی ملیں مثلاً ڈاک کے لفافے حاصل کرنے کا مسئلہ حل ہوگیا۔ طلبہ کی ضروریات کو آسانی سے پورا کرنا بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے بہت زیادہ عہدے (ranks) ہوتے تھے۔ مثلاً ایک سیکشن (ڈارم) میں ایک لانس کارپورل اور ایک کارپورل ہوتا تھا۔ تین سیکشنوں پر ایک سارجنٹ ہوتا۔ پھر ہاؤس کی سطح پر سی ایس ایم ہوتا۔ ایک سی کیو ایم ایس ہوتا۔ یہ سینئر عہدیدار اپنے کندھے پر سبز پٹی لگاتے تھے جس پر عہدہ کی سفید کھڑی دھاریاں ہوتی تھیں (یہ کیڈٹ این سی اوز ہاؤس ہی میں رہتے تھے) جبکہ ان کے علاوہ کیڈٹ آفیسرز سرخ پٹی لگاتے تھے جس پر پلاٹون کمانڈر کی ایک، کمپنی کمانڈر کی دو اور کالج ہیڈ بوائے یا بٹالین انڈر آفیسر کی تین سنہری دھاریاں ہوتی تھیں۔ کیڈٹ آفیسرز کا میس علیحدہ ہوتا تھا اور انہیں کیڈٹ اردلی رکھنے کی اجازت بھی تھی جو ان کے کمرہ میں جا کر انکی چپلیں وغیرہ پالش کرتا اور بستر وردی

ٹھیک کرتا۔اس سسٹم کو بھی انہوں نے ختم کیا۔انکی جگہ جونیئر سینئر پریفیکٹ مقرر کئے اور کیڈٹ آفیسرز میس ختم کر دیا گیا۔انکی رہائش ہاؤس میں کر دی گئی اور کیڈٹ آفیسرز کو سیلوٹ کرنے کا جو رواج تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ایک اور تبدیلی جو انہوں نے کی وہ یہ تھی کہ صبح سویرے ناشتے سے پہلے کا پی ٹی پیریڈ ختم کر دیا۔پی ٹی کے وقت ہاؤس میں سیلف اسٹڈی شروع ہوئی اور پی ٹی کلاس کے دوران شروع کے چار پیریڈ میں کسی پیریڈ میں ہوتی اور کلاسوں کے وقت میں ایک پیریڈ کا اضافہ کر دیا۔پہلے چھ پیریڈ ہوتے تھے اب سات ہو گئے۔صبح کے وقت ہاؤس میں سیلف اسٹڈی کے پیریڈ کی نگرانی کیلئے کرنل رفیق خود بھی آتے تھے۔کالج سے باہر بغیر اجازت جانے پر سخت پابندی تھی۔چونکہ ۱۹۵۵ء میں ان کے دوسرے دور کے شروع ہونے سے پہلے لڑکے رات کو بہت آوارہ گردی کرنے لگے تھے۔اسلئے جب انہوں نے چارج سنبھالا تو رات کو ڈارمیٹری سے باہر نکلنے پر سخت پابندی لگا دی اور اسکی چیکنگ کا نظام اتنا سخت تھا کہ حد نہیں۔ہر ڈارمیٹری سے باہر ایک بکس لگا ہوا تھا جس میں لڑکوں کے بستروں کی پلان کے مطابق ہر لڑکے کے نام کی ڈسک لگی تھی۔تاکہ معلوم ہو کہ ڈارمیٹری میں کون لڑکا کس جگہ ہے پھر رات کو کوئی کئی افسر چیکنگ کرتے کم از کم ایک بار وہ خود بھی آتے۔کیا مجال کہ کوئی لڑکا ادھر ادھر ہو جائے۔انکی اس طرح کی سختیوں سے شریف لڑکوں کو بہت سکون ملا۔کالج میں انکی انٹیلی جنس سروس تھی یا نہیں، لیکن نگرانی کا نظام حیرت انگیز حد تک مؤثر تھا کہ بعض اوقات متعلقہ لڑکے کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ میں چیک ہو گیا ہوں۔جب کمانڈنٹ صاحب اس کو دفتر میں بلاتے تب اس کو پتہ چلتا، کہ یہ بات ہے یہ ان کے نظم ونسق کی خوبی تھی کہ انہیں ہر وقت معلوم رہتا کہ کالج میں کیا ہو رہا ہے۔میرا خیال ہے کہ کوئی خاص سراغ رسانی کا نظام نہیں تھا۔صرف انکی مستعدی، ہمت اور دلچسپی تھی جس طرح ماں گھر کا کوئی کام کر رہی ہو اسکا دل ہی نہیں نظر بھی بچے پر رہتی ہے اور اگر بچوں میں سے کوئی نظر کے سامنے نہ بھی ہو تو بھی اسکی چھٹی حس اسے بتا دیتی ہے کہ کون بچہ کہاں ہو گا۔اور کیا کر رہا ہو گا۔اصل میں محبت سب سے بڑا ریڈار ہے

تعلق ہوتو سب کچھ پتہ چلتا رہتا ہے۔کرنل صاحب کو اپنے مشن سے جو عشق تھا اسی نے انکی چھٹی حس کو بیدار کر دیا تھا۔دوسرے وہ خود اتنے مستعد اور متحرک تھے کہ لامحالہ ان کے عملے کو مستعد رہنا پڑ تا تھا۔میں یہ لکھ کر یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ جب تک کوئی بڑا مقصد پیش نظر نہ ہو انسان غیر معمولی قوت اور مستعدی سے کام نہیں کرسکتا اور دوسروں کو متاثر نہیں کرسکتا۔اگر کوئی افسر بظاہر زیادہ مستعد نظر آتا ہے تو تاڑنے والے بھی غضب کی نظر رکھتے ہیں وہ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ اسکی تہہ میں کیا ہے۔رفیق صاحب کا سارا کام کھرا اور سچا تھا۔ریا کاری کا تو ان پر سایہ تک نہیں پڑا تھا۔ان کی غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی کا راز انکی سچی لگن میں مضمر تھا۔

۱۸۰۹ اکرنل محمد عالم

''عالم! کرنل رفیق کی شخصیت کے بارے میں آپ کے ذہن میں سب سے نمایاں بات کیا ہے''۔

سر، میں نے کالج میں ان کے دونوں دور دیکھے اور بہت غور سے دیکھے ہیں۔اس وقت تو کیا تجزیہ کرتا اب جو سوچتا ہوں تو پہلا تاثر یہ ابھرتا ہے کہ وہ اپنے کام کے بارے میں بہت ہی زیادہ سیرئس تھے۔انکی تمام تر توجہ، تمام تر توانائی لڑکوں پر مرکوز تھی۔یوں جیسے موت و زندگی کا مسئلہ ہو۔

''اسکی کوئی مثال؟''

مثالیں تو بے شمار ہیں۔مثلاً مجھے یاد ہے کہ میں رابرٹس ہاؤس کی نمبر ۴ سیکشن میں تھا۔یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کے اواخر کا ہے۔میں لائٹس آؤٹ کے آدھ گھنٹے کے بعد ڈارم سے باتھ روم جانے کیلئے نکلا تو دیکھا کہ کرنل صاحب دروازے سے لگے کھڑے ہیں۔لائٹس آؤٹ کے بعد کا وقت گپ شپ کا ہوتا تھا۔میں نے بعد کو بھی نوٹ کیا کہ کہ وہ اکثر لائٹس آؤٹ کے بعد ہاؤس کے آس پاس ہوتے تھے۔اسکا مقصد یقیناً یہ دیکھنا ہوتا ہوگا کہ ہمارے اندر کیا ہے تاکہ پھر اسکی اصلاح کرسکیں، ہماری تربیت کرسکیں۔

''آپ نے بھی تربیت کی بات کی ہے۔اکثر اولڈ بوائز اسی نکتہ پر زور دیتے ہیں۔آپ کی رائے میں

انکا فلسفہ تربیت کیا تھا۔‘‘

وہی جو تربیت کا اساسی اصول ہے کہ بتاؤ کم ۔کر کے زیادہ دکھاؤ۔ وہ یقیناً کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے ہر کام پہلے خود کریں۔

’’مثلاً‘‘

مثلاً صبح سویرے پی ٹی کو خود لیڈ کرتے تھے خواہ کتنی ٹھنڈ ہو۔ بنیان شارٹس میں خود ملبوس ہوتے تھے۔ صبح سویرے نہر سے کریالے تک کے رن میں سب سے آگے خود ہوتے تھے۔

’’کیا ایسا کرنا ضروری تھا؟ آخر پی ٹی اسٹاف بھی تو ہوتا تھا‘‘۔

ہوتا تھا ،ضرور ہوتا تھا۔لیکن ان کے خود لیڈ کرنے کی ایک نفسیاتی ضرورت تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ لیڈر شپ کی ضرورت تھی۔

’’وہ کیسے؟‘‘

لیڈر شپ کا اصول یہ ہے کہ جو کام مشکل یا تکلیف دہ نظر آئے وہ لیڈر نہایت صفائی،مہارت اور خوشدلی سے پہلے خود کرے ،اس طرح دوسروں کو انسپائریشن ملتا ہے۔ بریگیڈئر رفیق صاحب کی لیڈر شپ کا راز یہی تھا۔ انکی لیڈر شپ انسپائرڈ تھی اور انسپائرنگ بھی۔ دوسروں کیلئے اتنا کنسرنڈ میں نے اپنی زندگی میں کسی اور کو نہیں دیکھا۔

’’یہ کسی انسان کی انتہائی توصیف ہے،اسکی بھی کوئی مثال؟‘‘

اسکی مثال تو انکی پوری زندگی ہے،وہ جہاں جہاں گئے یہ وصف انکے ساتھ گیا۔

’’خود آپکو اسکا کوئی تجربہ ہوا؟‘‘

جی ہاں!

’’اسکی تفصیل کیا ہے؟‘‘

سر، میں نے شروع میں اضطراب اور مایوسی کے بڑے دن دیکھے ہیں۔ بڑے سیٹ بیک ہوئے ہیں۔ میں نے پی اے سپیشل ۱۹۵۴ء میں کرلیا تھا۔ آرمی کے لئے عمر کم تھی اس لئے نیوی اور ائرفورس کے دو چانس لئے اور بات نہ بنی۔ اس طرح ٹرائی کرتے کرتے ۵۶ء آ گیا۔ کرنل صاحب دوبارہ کالج میں آ چکے تھے۔ بہت دل برداشتہ تھا۔ ان سے ملا، انہوں نے بہت ہمت بندھائی۔ ۱۹۵۶ء میں کالج چھوڑا۔ کرنل صاحب نے ایف ایسی سی کا فارم بھروایا، تصدیق کی۔ لیکن ناکام رہا۔ پھر ایف اے کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ یہ دن میری زندگی کے تاریک ترین دن تھے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اور جدھر جاتا تھا ٹھوکر لگتی تھی۔ ہمارے ملٹری کالج کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ عالمگیرین عام اسکول کالج میں فٹ نہیں ہوتا۔ وہ ایسے استادوں کو، ایسے ماحول کو، ایسے خوابوں کو دیکھ چکا ہوتا ہے کہ پھر چھوٹی منزلیں اسکی آنکھوں میں نہیں جچتیں اور پھر یہ ظالم ادارہ حوصلہ بھی اتنا بلند کر دیتا ہے کہ موج حوادث سے ٹکرائے اور بلندیوں کی طرف بڑھے بغیر چین بھی نہیں آتا۔

''خوب، بڑی پیاری تنقید کی ہے۔''

تنقید نہیں، اظہار محبت ہے۔ تو سر، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیس للا نسان الا ماسعی آخر خدا نے میری سنی، میں ۱۶ او ٹی ایس میں ۵۸ میں سلیکیٹ ہو گیا تو پھر میں ان سے ملنے کالج گیا۔ جب میں نے یہ خبر سنائی تو کھِل اٹھے۔ ایک بار پھر اٹھ کے ہاتھ ملایا، شانہ تھپتھپایا اور اس طرح خوش ہوئے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کی کامرانی پر خوش ہوتا ہے۔ سر! کرنل رفیق کی پرسنیلیٹی کا یہ دلکش تضاد تھا کہ بظاہر جتنے سنگ خار نظر آتے تھے اندر سے اسکے بالکل برعکس تھے۔

''جی ہاں!، میرا مشاہدہ بھی یہی ہے۔ اصل میں انکی آدھی جان کالج میں تھی''۔

نہیں سر، آدھی نہیں پوری، مجھے بعد کو پتہ چلا کہ انکی زندگی میں خلا بھی بہت تھا۔ محرومیاں، ناآسودگیاں بھی بہت تھیں لیکن وہ اتنے بڑے تھے کہ انہوں نے ان چیزوں کو جو ایک عام آدمی کو لے بیٹھتی ہیں، توڑ

پھوڑ ڈالتی ہیں، انکوانھوں نے اپنی جگہ رکھا اور اپنے مشن پر منفی انداز میں اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

۱۸۲۱ شوکت جنجوعہ

کرنل رفیق کے آنے سے پہلے کالج کی دو خصوصیتیں تھیں پہلے یہ کہ سخت ریجی مینٹیشن تھا دوسرے کلاس سسٹم سا تھا۔ عہدیدار لڑکے مراعات یافتہ تھے باقی کی حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ انہوں نے ریجی مینٹیشن کی گرفت کو کافی حد تک ڈھیلا کیا۔ اب شاید لوگوں کو یقین نہ آئے مگر یہ امر واقعہ ہے کہ ۱۹۵۲ء میں لاکر سیٹ کرنے کا ایک سیٹ نمونہ تھا اس سے سر مو انحراف کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہوں نے اسے ختم کیا۔ بعض مراعات صرف کیڈٹ این سی اوز اور کیڈٹ آفیسرز کو حاصل تھیں۔ مثلاً پہلے صرف انکی وردی پر استری ہوتی تھی باقی لڑکے اپنے کپڑوں پر برش پھیرتے تھے۔ گویا تمیز بندہ و آقا کپڑوں میں بھی روا رکھی جاتی تھی۔ ان کے حکم سے سب لڑکوں کے کپڑے پریس ہونے لگے۔ کچن میں ترکاری بنانے یا ذبح شدہ مرغوں کے پر نوچنے پر ہر سیکشن سے کیڈٹوں کی ڈیوٹی لگتی تھی۔ انہوں نے اس کو ختم کیا۔ کیڈٹوں کے ذمے صرف وہ کام رکھے جن سے تربیت کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ محض ''فٹیگ'' سے لڑکوں کو نجات دلا دی۔ ہسپتال کو جو کھانا جاتا تھا اس کو تبدیل کیا۔ ہفتے میں دو روز چکن تھا انہوں نے ایک روز مچھلی رکھ دی۔ کیڈٹ میسوں سے ہر دوپہر دفتر میں کھانا آتا تھا۔ اس کو خود چکھتے تھے اور ہر ہاؤس کو نمبر دیتے تھے اور جس میس کا کھانا ہفتہ میں اول رہتا اس کے باورچیوں کو نقد انعام دیا جاتا۔

۱۸۲۶ میجر جنرل محمد اکرم

ان دنوں میری منصبی مصروفیات ایسی ہیں کہ باوجود کوشش کے حسب دلخواہ میں بریگیڈئر رفیق کے کردار پر تفصیل سے اظہار نہیں کر سکا۔ اس یادگاری محفل میں صرف شرکت کی سعادت حاصل کرنے کیلئے چند سطریں قلم بند کر رہا ہوں۔

بریگیڈئر رفیق اپنے تدبر، فرض شناسی، باہمتی اور بلند کرداری کے لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔

انہوں نے عام ملازمتی تقاضوں اور ماحول کی ناسازگاریوں سے بلند ہو کر اپنے فرائض کو بڑے موثر طریقے سے انجام دیا۔ زندگی کے وسیع اور گوناگوں تجربے کی روشنی میں، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کر سکنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جو نڈر اور بے نیاز ہو۔ میں نے یہ اکثر سوچا ہے کہ وہ اتنے نڈر اور بے نیاز کیوں تھے۔ ذاتی مفادات کے سنگین حصار کو وہ کیسے توڑ سکے۔ خدمت اور قیادت کے اس بلند معیار کو وہ مسلسل کیسے برقرار رکھ سکے۔ میرے خیال میں اسکی دو وجوہات ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ انکی فرض شناسی اور خود اعتمادی انہیں اس مقام پر لے گئی تھی جہاں مادی سہولتوں کی نہ فکر رہتی ہے نہ حرص۔ ویسے بھی بڑے بڑے کام عقل اور جذبے کے امتزاج اور مقصد کی یگانیت اور اسکے حصول کے عشق سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انکی اپنی انا، ذات یا شخصیت اس حد تک بلند ہو چکی تھی کہ انہیں عام انسانی دلچسپیاں یا کمزوریاں اپنی طرف نہیں کھینچتی تھیں۔ ان کے اپنے معیار تھے، عزائم تھے، کالج کو بہتر اور بلند کرنے کے تصورات تھے اور وہ تمام بڑے آدمیوں کی طرح ان عزائم اور معیاروں کو بروئے کار لانے کیلئے طویل اور صبر آزما تگ و دو کر سکتے تھے اور کی۔ انہوں نے اپنے کردار، طرز زندگی اور طریق ہائے کار سے نہ صرف بیشتر طلبہ اور اسٹاف کو متاثر کیا بلکہ کالج کو ایک نئی سوچ، ایک نئی سمت دی اور ایک نیا راستہ متعین کیا۔ اداروں کو بنانا ایک لمبا کام ہوتا ہے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ انکی رہنمائی کی سمت کو باقی رکھیں اور ان کے کام کو آگے بڑھاتے رہیں۔

۱۸۴۹ لیفٹیننٹ کرنل اللہ داد خان

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آزادی سے پہلے جو سسٹم تھا اس کی خوبیاں تو آہستہ آہستہ ختم یا کم ہو رہی تھیں اور خامیاں رفتہ رفتہ ابھر کر سامنے آ رہی تھیں۔ کالج کو نئے سرے سے منظّم کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام کرنل رفیق صاحب نے کیا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں آتے ہی انکی افتتاحی تقریر جتنی لمبی تھی، اتنی ہی واضح اور سخت تھی۔ وہ بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے ان کے بعض

اقدامات اور سزائیں ضرورت سے زیادہ سخت تھیں خصوصاً پبلک کیننگ، کونٹری وغیرہ۔ لیکن یہ زیادتیاں ان کے دوسرے بہت ہی مفید اقدامات اور رہنمائیوں کے پس منظر میں نظرانداز کی جاسکتی تھیں۔ آخر میں دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی نیت کیا تھی، حالات کیا تھے اور بحثیت مجموعی کتنے مثبت نتائج نکلے۔ انکے Most sincere ہونے میں کلام نہیں۔ اسکی ایک مثال دیتا ہوں۔

سرائے عالمگیر میں سرکس آیا ہوا تھا۔ لڑکے راستے میں کرسیاں چھوڑ کر بھاگ آئے۔ انہوں نے اپنے آفس کے پیچھے فالن کرلیا۔ بڑے جلال میں تھے۔ پہلے پوچھا جو کرسیاں چھوڑ کر آئے تھے ہاتھ اٹھائیں۔ سب چپ رہے۔ پھر پوچھا بتاؤ کون کون ہے۔ سب ڈرے ہوئے تھے کہ آج خیر نہیں۔ جب تیسری بار پوچھا تو ۱۴۶۷ یوسف نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اسکی دیکھا دیکھی دو چار ہاتھ اور بھی اٹھے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ یوسف کو شاباش دی۔ بڑی تعریف کی۔ باقی کو تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔ وہ اخلاقی جرأت کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اسکے ہر مظاہرہ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے کیڈٹس کو پی ٹی ڈرل کے خول سے نکالا اور ان کے آؤٹ لک کو وسعت دینے کیلئے تاریخی مقامات کی سیریں کرائیں۔ لاہور قلعہ، رہتاس، رسول ہیڈ ورکس جانے کے مزے آج بھی مجھے یاد ہیں۔ ۱۸۷۷ اقبال، ۱۸۴۱ ذاکر، ۱۷۳۱ عبداللہ ۱۸۲۰ حنیف کے ساتھ ان سیروں کا بڑا لطف اٹھایا۔ انہوں نے ایک شکار کلب بھی بنایا تھا۔ ایک بار شکار کیلئے ڈنگہ کی طرف گئے تھے۔ کسی بڑے زمیندار کا مہمان خانہ یا دارا تھا اس میں ٹھہرے تھے۔ فیروز، برکات، ۱۷۰۰ افضل وغیرہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ دارے میں چائے پیتے ہوئے انہوں نے پوچھا کہ ہم پاکستان میں چائے کا چمچہ کلاک وائز گھماتے ہیں ملایا وغیرہ بہت سے ملکوں میں اینٹی کلاک وائز گھماتے ہیں اسکی کیا وجہ ہے۔ برکات بول اٹھا سر، یہ کوئی راز (مسٹری) نہیں شکر ہی تو ملانی ہے۔ اسی طرح لائٹ موڈ میں باتیں کرتے رہے۔ وہ آف پریڈ بہت ہی مختلف ہوتے تھے۔ بندوقیں کم تھیں۔ ہر پارٹی باری باری جاتی تھی، اپنا شکار ہر پارٹی خود بھونتی تھی اور دوسروں کو کھلاتی تھی۔ میری طرح اور

بہت سے لڑکوں نے ان سرگرمیوں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

۱۸۵۱ میجر محمد اختر

''اختر، کرنل رفیق کے دور کا کوئی واقعہ یاد ہو تو سنائیں''۔

صرف ایک دو باتیں یاد آ رہی ہیں۔

''وہی سہی، کبھی کبھی ایک لکیر بھی تصویر کو ابھار دیتی ہے''۔

کالج میں، میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۶ء تک رہا گویا میں نے کرنل رفیق کے دونوں دور دیکھے۔ ان کے دور کی بہت سی خصوصیات تھیں لیکن ایک بہت امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ہمیں عملی زندگی کیلئے بھی تیار کیا۔ ہمارے کیریئر پر بھی نظر رکھی۔

''اسکی کوئی مثال''۔

اسکی ایک مثال تو یہ ہے کہ جب اکتوبر ۵۶ء میں ہم آئی ایس ایس بی کے لئے جانے لگے تو انہوں نے ہم لوگوں کو اپنے بنگلہ پر بلا کر اسکی تیاری کرائی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ بڑے ٹھاٹھ سے انکے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے تھے اور وہ خود گروپ ڈسکشن کنڈکٹ کرتے تھے اور یہ کاروائی رسمی نہیں حقیقی ہوتی تھی اور انکا رویہ ہمت افزائی کا ہوتا تھا۔ اوروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ انکی ذاتی توجہ کا نتیجہ تھا کہ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور جب میں بورڈ کے سامنے گیا تو شیر تھا۔

جب ہم لوگ آئی ایس ایس بی سے کامیاب ہو کر واپس آئے تو انہوں نے پھر بلایا۔ چائے پلائی۔ کافی خاطر تواضع کی۔ لیکن سب چیزوں سے بڑھ کر انکا وہ اپنائیت اور اعتماد کا رویہ تھا جس سے ہمیں تقویت ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اس موقعہ پر بھی انکا زور کردار............ اور پاکستانیت پر تھا۔

۱۸۵۶ عنایت خان بھٹی انجینئر

ملٹری کالج کا جو لڑکا کالج سے ڈائریکٹ فوج میں چلا جائے ایک لحاظ سے اسکا سفر محفوظ راستوں پر

ہوتا ہے۔ معاشی لحاظ سے بھی اور سماجی اعتبار سے بھی۔ ملٹری کالج کی قدر اور پھر خاص طور سے کرنل رفیق کی قدر کوئی ہم سے پوچھے جو سول میں گئے۔ گویا آندھی اور طوفان میں انجانی راہوں پر قدم رکھا، اپنے آپ کو بھپری ہوئی بے رحم موجوں کے حوالے کیا۔ پھر اگر ہم ساحل سے لگ سکے یا منزل مراد پر پہنچے اور سرخ رو بھی ہوئے تو یہ یقیناً بڑی حد تک اس تربیت کا فیض تھا جو کالج میں ہمیں ملی۔ تربیت سے شخصیت بنتی ہے، قدروں کو ایک رخ ملتا ہے، ذہنی اور جذباتی رویے مستحکم ہوتے ہیں، لائف اسٹائل بنتا ہے۔ کام کرنے اور کام لینے کے طریقوں کا شعور ملتا ہے۔

اس تربیت کا سرچشمہ بڑی حد تک خود کرنل رفیق کی ذات تھی۔ انکی سخت کوشی، بااصولی اور ضبط کی عادت میرے کیرئر میں ہر مرحلے پر میرے لئے انسپائریشن کا ذریعہ رہی ہے۔ عموماً بچپن کا ہیرو بچپن کے ساتھ ہی پیچھے رہ جاتا ہے، نوجوانی کا ہیرو نوجوانی کے شام وسحر کا طلسم ٹوٹتے ہی ذہن سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن رفیق صاحب وہ ہیرو ہیں جنکی قدو منزلت کا احساس زندگی کے گہرے تجربے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

۱۸۵۹ ونگ کمانڈر مسعود احمد خان

یہ واقعہ ۱۹۵۶ء کا ہے۔ اسکین ہاؤس کی نمبرون سیکشن سے ہم لوگ فالن ہو کر کھیلوں کیلئے جا رہے تھے۔ جوں ہی ہاؤس سے نکلے دیکھا کہ کرنل رفیق صاحب اپنے دفتر سے نکل کر سامنے کی سڑک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسکا مطلب تھا کہ ایک دو لمحہ کے بعد ہم انکے سامنے سے گزریں گے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ سیلوٹ کا کاشن کون دے۔ ایک لمحہ کیلئے سرگوشی ہوئی۔ اتنے میں ہم دفتر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ چونکہ آگے میں تھا میں نے Initiative لیا اور زور سے آئیز فرنٹ کہا۔

رفیق صاحب ہلکا سا مسکرائے اور آہستہ سے آئز رائٹ کہا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ زندگی کا پہلا کاشن دیکر مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا لیکن جس انداز سے انہوں نے اصلاح کی اس نے مجھے زندگی کے ایک حوصلہ افزا تجربے سے دوچار کیا۔ باقی لڑکے شائد میری بدحواسی پر ہنستے ہی رہے ہوں۔ لیکن میں نے گراؤنڈ تک کا باقی راستہ آئز رائٹ کی گردان کرتے ہی طے کیا۔ میری ایکسائٹمنٹ کی اصل وجہ انکی اصلاح کا وہ انداز تھا جس میں ویل ڈن مسعود چھپا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس دن جتنا اچھا فٹبال میں کھیلا شائد اس سے پہلے اور بعد کبھی نہیں کھیلا۔ محبت سے کی ہوئی اصلاح میں کیمیا کا اثر تھا۔ دوسرا واقعہ بھی ذاتی نوعیت کا ہے۔ میں سی ایم ایچ جہلم میں داخل تھا۔ وہ ہر روز دیکھنے آتے اور ساتھ پھل لاتے تھے۔ ان پھلوں کی لذت نہیں بھول سکتا اپنے ہیرو کی توجہ سے بڑھ کر کسی اور چیز سے خوشی نہیں ہوتی۔

۱۸۶۲ لیفٹیننٹ جنرل آر، ڈی (رحمدل) بھٹی

میرے زمانے میں کالج میں اسپورٹس کا بڑا دور دورہ تھا۔ سارے کھیل مقبول تھے۔ باکسنگ اور اتھلیٹکس میں حصہ لینا سب کیڈٹس کیلئے لازمی تھا۔ اسٹاف کے بیشتر ممبران بھی کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلتے تھے۔ لیکن ایک اسپورٹ ایسا تھا جس میں اپنے بازو آزمانے کو ہمارا بڑا جی چاہتا تھا لیکن جسے ہم دور سے اور حسرت سے دیکھ ہی سکتے تھے۔ میرا مطلب ٹینس سے ہے۔ کالج کا ٹینس کلب کالج اسٹاف بلکہ بزرگ اسٹاف کیلئے مخصوص تھا۔ خود کمانڈنٹ صاحب کرنل رفیق ٹینس کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ جب میں سینئر کیڈٹس کے زمرے میں آیا اور کچھ بڑے پن کی ذمہ داریاں اور مراعات ملیں تو میرے دل میں بھی غالباً اور بہت سے سینئرز کی طرح یہ خواہش جاگی کہ شجر ممنوعہ کا مزہ بھی چکھا جائے۔ کچھ اسلئے کہ یہ شجر ممنوعہ تھا اور کچھ اسلئے کہ یہ کھیل بڑے ہونے کی علامت تھا اور یہ بھی کہ یہ بڑی آن بان کا کھیل تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس حساس پیما آلے کے ذریعہ رفیق صاحب کو ہمارے نہاں خانہ دل کی اس آرزو کا علم ہو گیا اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کیڈٹ آفیسرز کو بھی ٹینس کلب کا ممبر بننے کا موقعہ دیا جائے۔ جب یہ خبر

ایک ''ہوائی کی شکل میں ہم تک پہنچی تو ہم نے اسے ''ہوائی'' ہی سمجھا۔ یقین نہیں آیا کہ بڑوں بلکہ بزرگوں کے اس کلب میں ہم جوانوں کو بھی جگہ مل سکتی ہے۔ بہر حال اس رعایت کا جب باقاعدہ اعلان ہوا تو جن چند سینئر کیڈٹوں نے ٹینس کلب کا رکن بننے پر آمادگی ظاہر کی ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ چونکہ ہم اس کھیل سے بالکل نابلد تھے اس لئے ہم اپنے وقت میں ایک دو ہفتے تک اس کی الف ب دیکھتے رہے۔ جب کچھ شد بد ہوگئی تو پھر کورٹ پر باقاعدہ کھیلنے کی اجازت ملی۔ بزرگوں کی پارٹنرشپ میں بھی ایک آدھ کھیل کھیلا جو ایک طرح کی آزمائش یا امتحان کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ہم شش و پنج میں تھے کہ دیکھئے ہم بزرگوں کے معیار پر اترتے ہیں یا نہیں۔ کلب کی رکنیت ملتی ہے یا نہیں کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ صرف معیاری امیدواروں کو جگہ ملے گی۔ چوتھے یا پانچویں دن کا وقعہ ہے کہ اس دن کلب کے ''بڑوں'' سے ہمارے بڑے زوردار مقابلے ہوئے اور رفیق صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں ''ویل ڈن'' کہہ کر داد بھی دی۔ بہر حال جب کھیل اور وقت ختم ہوا اور ہم پسینے سے شرابور اپنی اپنی جرسی کرسیوں کی پشت سے اٹھا ہی رہے تھے کہ کرنل رفیق کی پروقار آواز گونجی:

سب اراکین چائے کیلئے میرے گھر چلیں''۔

........اس اعلان کا ہم نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ اس لئے کہ ''گھر'' یعنی کمانڈنٹس ہاؤس ہمارے لئے سختی سے ''آؤٹ آف باؤنڈز'' تھا اور سچی بات یہ ہے کہ کالج میں پانچ چھ برس گزارنے کے باوجود میں کمانڈنٹس ہاؤس کی حدود سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھا۔ کچھ تو آؤٹ آف باؤنڈز ہونے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ کمانڈنٹ الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے اور انکی شہرت اس قسم کی تھی کہ وہ غیر رسمی انداز میں ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ ہم میں سے کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ ممبرز میں ہم بھی شامل ہیں۔ چنانچہ جب بزرگوں نے اپنے اپنے ''ریکٹ'' اٹھا کر اپنے معمول کے انداز میں کمانڈنٹ کے گھر کا رخ کیا تو ہمارا رخ از خود اپنے ہاؤسوں کی طرف ہو گیا۔ ابھی ہم نے پورے دو قدم

بھی نہیں اٹھائے تھے کہ پھر وہی آواز گونجی۔ ''ممبرز ٹو موو ٹو مائی ہاؤس فار اے کپ آف ٹی''۔ یہ دعوت یقیناً ہمارے لئے ہی تھی۔ حیرت سے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور محض ایک حکم کی تعمیل کے طور پر جھجکتے ہوئے قدموں سے ہم ان کے گھر کی طرف چلے۔ وہاں پہنچ کر بھی ہم پر کچھ بے چینی، کچھ بے یقینی کی کیفیت طاری تھی جس کو انہوں نے فوراً بھانپ لیا۔ بزرگوں کی رفاقت چھوڑ کر وہ ہمارے گروپ کی طرف آئے اور یوں گھل مل گئے جیسے ہمارے پرانے دوست ہوں۔ ہمارے کھیل کی بہت تعریف کی اور دیر تک صرف ہم سے ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے اور اس طرح ہماری خاطرداری کی جیسے ہم بہت اہم مہمان ہوں۔ جب یہ مختصر پارٹی ختم ہوئی اور ہم تیزی سے اپنے ہاؤسوں کی طرف بھاگے کہ نماز نہ رہ جائے تو ذہنوں میں ایک نیا رفیق ابھر رہا تھا۔ اس کے بعد تقریباً روز ہی ٹینس کے کھیل کے بعد کمانڈنٹ ہاؤس جانے لگے۔ انکا گھر کلب یا کیفے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ برسہا برس کے بعد آج جب کہ میں یہ واقعہ لکھ رہا ہوں تو مجھے خیال ہو رہا ہے کہ انہوں نے ٹینس کلب کا ممبر غالباً اس لئے بنایا تھا کہ ہمیں اپنے بڑے پن کا شعور ہو، اپنے بڑوں کے ساتھ کھیل کر ہم افسری کی ذمہ داری کی طرف ایک اور قدم اٹھا سکیں اور وہ چائے کی دعوت گویا ہماری افسری کی بسم اللہ تھی اور ان کا وہ دوستانہ انداز میں بات چیت کرنا اس بات کا اشارہ تھا کہ قیادت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آدمی نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہو۔

دوسرا واقعہ بہت بعد کا ۱۹۶۷ء میں انٹیلی جنس سکول کا ہے۔ ایک روز اطلاع ملی کہ آج ایک مہمان مقرر کا لیکچر ہے۔ اس طرح کے لیکچر اسکول میں آئے دن ہوتے رہتے تھے اس لئے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور اسکول ہال میں اپنی خاص جگہ پر جا کر بیٹھ گیا کچھ دیر کے بعد وہ مہمان مقرر سکول کمانڈنٹ کیساتھ تشریف لائے تو یکا یک میں ایک انوکھے تجربے سے دوچار ہوا۔ یہ مہمان مقرر کوئی اور نہیں اپنے مکرم اور محترم ملٹری کالج کے زمانے سے میرے آئیڈیل بریگیڈئر محمد رفیق تھے۔ میری حالت وہ تھی جو

بالکل غیر متوقع طور پر اپنے پرانے ہیرو سے ملاقات کے امکان پر ہوتی ہے، جس میں ایک طرح کی بے چینی بھی ہوتی ہے۔ رسمی تعارف کے بعد مہمان مقرر کا لیکچر شروع ہوا لیکن واقعہ یہ ہے کہ لیکچر کی طرف میری توجہ بالکل نہیں تھی۔ میرا ذہن ایک اور ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ لیکچر کے بعد معزز مہمان کا ہم سے تعارف بھی ہونا تھا اور میرے لئے یہ مسئلہ میری انا کا مسئلہ بن گیا تھا کہ وہ مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ انسان کی شکل صورت بدل جاتی ہے۔ سینکڑوں شاگردوں میں سے کون ہر ایک کو یاد رکھتا ہے۔ بہرحال یہ چھوٹی سی بات میرے لئے سخت جذباتی اضطراب کا باعث بن گئی تھی۔ میں اس وقت کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہوش نہیں کہ کب لیکچر ختم ہوا۔ بہرحال جب زور زور سے تالیاں بجیں تو میں بھی تالیوں میں شریک ہو گیا۔ اب وہ وقت قریب تھا جس نے مجھے اتنی دیر سے بے چین کر رکھا تھا۔ اگر کمانڈنٹ معزز مہمان کو براہ راست اپنے دفتر میں لے جائیں تو ملاقات کا امکان ختم ہو جائے گا اور اگر وہ مہمان کو ڈی ایس کے کمرہ میں لے گئے تو وہاں ملاقات ضرور ہوگی۔ میری اندرونی خواہش تھی کہ کمانڈنٹ مہمان خصوصی کو ڈی ایس کے کمرہ میں لے جائیں۔ چنانچہ جب معلوم ہوا کہ ہمیں ڈی ایس کے کمرہ میں اکٹھا ہونا ہے تو ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ کمانڈنٹ اور بریگیڈئر صاحب کمرہ کے دروازے کے قریب کھڑے کسی مسئلہ پر گفتگو کرنے میں محو ہیں۔ ہم ذرا فاصلے پر رک کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ باتیں تو میں کر رہا تھا لیکن میری شعوری کوشش یہ تھی کہ کسی کو میری اندرونی ہلچل کا پتہ نہ چلے۔ اتنے میں بریگیڈئر رفیق نے یکا یک اپنی گفتگو منقطع کر دی۔ غالباً انہیں ہمارے انتظار کرنے کا یکا یک احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مخصوص تیز قدموں سے اندر گئے پھر ہم لوگ اندر جا کر نیم دائرہ میں کھڑے ہو گئے۔ اب تعارف شروع ہوا مجھے یقین ہے کہ میرے دل کی تیز دھڑکن اگر دوسرے چاہتے تو سن سکتے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا کیسے رہا۔ میرے لئے سخت ترین لمحہ وہ تھا جب وہ مجھ سے تین

قدم کے فاصلے پر تیسرے افسر سے متعارف ہورہے تھے، میری انا اور محبت سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ جوں ہی مجھ سے پہلے افسر کا تعارف ختم ہوا اور کمانڈنٹ نے میری طرف رخ کیا اس وقت عجب نہیں کہ میرے دل نے ایک آدھ بیٹ مس کی ہو بہر حال اس ایکسائٹمنٹ کی حالت میں، میں نے جو سنا وہ یہ تھا۔ ''ہیلو رحم دل ہاؤ آر یو''۔ اور دوسرے لمحے انہوں نے آداب تعارف کے برخلاف مجھے اپنے چوڑے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ میرے کمانڈنٹ بھونچکا کھڑے تھے اور رفیق صاحب الٹا ان سے میرا تعارف بڑی گرم جوشی اور فخر سے کرا رہے تھے۔ میں آر ڈی کے نام سے معروف ہوں بہت کم لوگ میرے اصلی نام سے واقف ہوں گے۔ میری انتہا درجہ کی خوشی کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مجھے میرے کالج کے نام سے بلکہ ٹینس کلب کے نام سے پکارا تھا۔ انکے حوالے سے میں نے قیادت کی بہت سی صفات اور خصوصیات کو پہنچانا اور پرکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے کردار کے مطالعہ سے سب کو اور خاص طور پر فوجی افسروں کو بہت قیمتی رہنمائی ملے گی۔

۱۸۶۶ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) محمد قربان

کرنل قربان اب فارن سروس میں ہیں۔ ایک عرصے کے بعد ابھی حال ہی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ تو یہ گفتگو ہوئی۔

''اس دوران کہاں کہاں رہے؟''

کوئٹہ سے نائجیریا گیا تھا۔ وہاں سے لندن تبادلہ ہوا۔ دو تین سال پاکستان ایمبسی یوکے میں گزارے اب فارن آفس میں کام کر رہا ہوں۔

''گویا ایک دنیا دیکھ چکے ہو۔ اب کیا کہتے ہو بریگیڈئر رفیق کے بارے میں''۔

۵۳-۱۹۵۲ء میں بچپن میں انکا جو تاثر ذہن نے قبول کیا تھا اب وہ مستحکم ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ ایک غیر معمولی انسان نظر آتے تھے گفتگو میں، پابندی وقت میں، لباس میں، اپنے کام کرنے کے انداز میں وہ

ہمیں ایک ہیرو نظر آتے تھے۔ ہر عمر میں اور لڑکپن و نوجوانی میں خاص طور سے انسان کو ہیروز کی تلاش ہوتی ہے جنکے حوالے سے وہ اپنی شخصیت کی راہ تلاش کر سکے۔ وہ ایک ایسے ہیرو تھے۔ میرا خیال ہے کہ ملٹری کالج میں اور پھر لارنس کالج میں انہوں نے سینکڑوں طلبہ کو متاثر کیا۔ انکے حوالے سے بے شمار نوجوانوں نے زندگی کی بنیادی قدروں اور رویوں کا شعور حاصل کیا اور ان کی طرح زندگی گزارنے کی شعوری و لاشعوری کوشش کی۔ یہ معمولی بات نہیں۔ ایک ہیرو کا یہی کام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے گہرا نقش چھوڑ آئے۔ سر، آپ یاد کریں، انکا چلنے کا انداز ہی تیر کی طرح سیدھا نہیں تھا، برتاؤ کا طریقہ بھی سیدھا تھا۔ کوئی لاڈلا نہیں تھا۔ ذاتی پسند ناپسند کا معاملہ نہیں تھا۔ اور پھر کالج میں انقلابی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ایک نیا کالج جنم لے رہا تھا۔

''تمہارا یہ آخری فقرہ بہت معنی خیز ہے ذرا مثالوں سے وضاحت کرو تاکہ تمہارے اور میرے ہیرو کو دنیا بھی ہیرو کہہ سکے''۔

غالباً پچھلے سسٹم کا تانا بانا اس بنیادی مقصد کے تحت بنایا گیا تھا کہ شخصیت، انفرادیت، عزت نفس نام کی کوئی چیز پروان نہ چڑھنے پائے، صرف صلاحیت کار کو بڑھایا جائے۔ اس لحاظ سے وہ سسٹم بہت کامیاب تھا۔ بوٹوں کی پالش، بیٹی کی چمک، لاکر کی صفائی، پی ٹی پریڈ کی نوک پلک، باکسنگ کی پھرتی اور لیس سر کی روانی پر ساری توجہ اور خیال کی پرواز ختم ہو جاتی تھی۔ انہوں نے ہمیں اپنی ذات، اپنی شخصیت ، اپنی انا کا ایک واضح تصور دیا۔

''مثلاً کس طرح؟''

ایک مثال کونٹری کی ہے۔ یہاں بید مار مار کے بھرکس نکالا جاتا تھا لیکن جو سیدھے نہ ہونے والے ہوتے پھر بھی سیدھے نہیں ہوتے تھے۔ جب انہوں نے کہا۔ ڈنڈے نہیں پڑیں گے بار بار کی غلطی پر کونٹری ملے گی۔ یعنی سینے پر یہ نشان لگا ہوگا کہ یہ شخص سیدھا نہیں چل رہا۔ ہم لوگ اس اعلان پر بہت ہنسے۔

ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے بھی سنبھل سکتے ہیں۔اب کونٹری کیا تھی۔ذاتی عزت کے حوالے سے اصلاح کی کوشش تھی۔خطا کار کو یہ احساس دلانا تھا کہ تم نے اپنی عزت کو داغ دار کیا ہے۔ظاہر ہے کہ اس سے پہلے اس کو یہ احساس، یہ شعور بھی دلایا گیا ہوگا کہ تمہاری بھی کوئی انا ہے، کوئی شخصیت ہے۔ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی کہوں گا کہ انہوں نے ہمیں اپنی انفرادیت کا احساس دلایا۔اسکی میں پھر ایک مثال دونگا۔ پنجاب سنٹر جہلم میں بوائز کمپنیوں سے ہمارے باکسنگ کے مقابلے ہوتے تھے۔ادھر ساری بوائز کمپنیاں اور ریکروٹ جمع ہوتے ادھر سے ہم جاتے۔دونوں طرف سے نعرہ بازی ہوتی۔ وہ کے جی کے جی دریاؤں پار کا نعرہ لگاتے ہم بھی اس کا منہ توڑ جواب دیتے۔ ایک مقابلہ باکسنگ رنگ میں دوسرا رنگ سے باہر ناظرین میں نعروں کا ہوتا۔نعروں کی سطح ایک تھی۔ جب وہ آئے تو انہوں نے ہمارے نعرے بالکل بند کر دیئے۔صرف ایک نعرے کی اجازت ملی۔ پلے اپ ، پلے دی گیم"۔کہاں مخالفوں کے گرم تیز چبھتے ہوئے فقرے کہاں یہ پلے اپ، پلے اپ دی گیم کا بے ضرر سنجیدہ فقرہ۔ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے ہم سے ہمارے ہتھیار چھین لئے گئے ہیں۔ہم نے گلہ کیا کہ سر، وہ ہم سے چوٹیں کرتے ہیں۔ہم کیا کریں۔ جواباً انہوں نے کہا "یہ سوچو تم میں اور ان میں کیا فرق ہے۔تمہاری منزل کہاں ہے۔" مختصر یہ کہ ہمارے ذہنوں کے سارے دریچے بند تھے انہوں نے ہمیں نئے افقوں کا شعور دیا۔

"مثلاً"

مثلاً۔ایسی سرگرمیاں شروع ہوئیں جنکے بارے میں پہلے ہم نے سنا بھی نہیں تھا۔انگریزی اردو میں ایلوکیشن کے مقابلے ہوئے۔لطف آ گیا۔آنکھیں کھل گئیں۔آپ کو یاد ہوگا کہ حیدری صاحب نے شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر سے انٹونی کی تقریر پیش کی تھی۔جب انہوں نے اشارے سے "لُک" کہا تھا تو سارا ہال کھڑا ہو گیا تھا۔ایسے ایسے لاجواب ایلوکیشن کے نمونے سامنے آئے کہ باید و شاید۔

''خود کرنل رفیق نے بھی ابراہام لنکن کی مشہور تقریر کا ایک ٹکڑا سنایا تھا۔

''جی ہاں وہ بھی زبردست تھی''۔

میں ان انقلابی سرگرمیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں جو ۵۳-۱۹۵۲ء کے چند مہینوں میں ہوئیں۔ آپ کو یاد ہے کہ ایک برینس ٹرسٹ کا سیشن بھی ہوا تھا۔ ۱۸۰۵ فضل الرحمٰن ہمارا پینل لیڈر تھا۔ اس میں میں نے بھی حصہ لیا تھا۔

تم نے کس سوال کا جواب دیا تھا۔

کہ ہم پیٹر کی عمر کس طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ سر، ابھی مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ ہر کام پرفیکٹ انداز سے انتہا تک لے جا کر کرنا ان کی عادت تھی۔ ۱۹۵۲ء میں سالانہ تقریب کے موقع پر کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو آنا تھا۔ پریڈ کی زبردست تیاری تھی۔ ایک روز چند لڑکے پریڈ پر کھڑے کھڑے گر گئے انکو اٹھا کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ کچھ دیر کے بعد پریڈ برخاست ہوگئی۔ دوسرے دن پریڈ سے پہلے حکم ملا کہ کرنل صاحب ایڈریس کریں گے۔ ان کا تو جلال بھی مشہور تھا وہ جو گر گئے تھے وہ خاص طور پر پریشان ہوئے اب جھاڑ پڑے گی۔ بے عزتی ہوگی۔ دوسروں کو بھی یہی گمان تھا کہ ضرور ناراض ہونگے۔ لیکن ہوا کیا کہ انہوں نے بتایا کہ دیر تک کھڑے رہنے کی تکنیک کیا ہے۔ انکا پہلا پوائنٹ مجھے اب بھی یاد ہے۔ پھر بار بار پوچھا کہ ''باؤلز کلیر'' رکھنے کا مطلب کیا ہے۔۔۔۔۔ پھر کہا جوتوں میں اپنی انگلیوں کو حرکت دیتے رہو، اس طرح کھڑے ہو، اس طرح نہ کھڑے ہو، وغیرہ وغیرہ۔ جو لڑکے پچھلے دن گر چکے تھے انکی طرف اشارہ تک نہیں ہوا اور انکا گرنا انکے لئے شرمندگی کا سبب نہ بنا۔۔۔۔۔ سر، ایسے آدمی کو آپ ہیرو نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ کوئی انسان بھی کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتا۔ میں انہیں فرشتہ نہیں کہہ رہا ہوں، ہیرو کہہ رہا ہوں اس کی وجہ وہ impact ہے جو ان کی پرسنلٹی کا، ان کے کردار کا ہوا، جہاں جہاں وہ گئے۔

۱۸۷۰ بریگیڈئر سلطان جہانگیر

رفیق صاحب سے بچپن میں بھی متاثر ہوا تھا اور جب میں خود بڑا ہوا اور خدا کے فضل وکرم سے زندگی کے بہت سے مرحلے بھی کامیابی سے طے کئے تو بھی ان سے متاثر رہا بلکہ اس عقیدت میں اضافہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ رفیق صاحب کی سخت گیری ضرورت سے زیادہ مشہور ہوگئی ہے۔ انکے طریق تربیت میں عفوودرگزر کی بھی جگہ تھی اور بڑی اہم جگہ تھی۔ وہ اپنے ایک ایک طالب علم کو سمجھتے تھے اور خوب سمجھتے تھے۔ وہ اضطراری غلطی میں اور بدنیتی سے کی گئی غلطی میں فرق کرتے تھے اور سزا دیتے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اس نکتے کو دو مثالوں سے واضح کرونگا۔ پہلا واقعہ ان کے پہلے دور کا ہے۔ غالباً اوائل ۱۹۵۳ء کی بات ہے، رات کا وقت تھا، کلاس میں پریپ ہو رہے تھے۔ خلاف معمول مجھے شرارت سوجھی۔ سامنے ڈیسک پر نوکدار پنسل پڑی تھی میں نے اسے اٹھایا اور آگے جھک کر اپنی سیٹ سے آگے بیٹھے ۱۸۶۲ رحمدل کی کان کی لو میں آہستہ آہستہ چبھوئی۔ اس نے اچھل کر کان پر ہاتھ مارا۔ ابھی میں اپنے ہاتھ کو پیچھے لا ہی رہا تھا کہ کھڑکی میں رفیق صاحب کا چہرہ نظر آیا ان کو دیکھتے ہی میرا خون خشک ہو گیا۔ پریپ میں اس سے پہلے میں نے کبھی شرارت نہیں کی تھی آج سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ مجھے معلوم تھا کہ پریپ میں اس قسم کی شرارتوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں اپنے کئے کی سزا بھگتنے کیلئے تیار ہوگیا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ مجھ سے کسی قسم کی باز پرس کئے بغیر دوسرے لمحے ہی آگے بڑھ گئے۔ اتفاق سے یا قصداً اس دن لائٹس آؤٹ کے وقت آئے بھی، مجھ سے آمنا سامنا بھی ہوا لیکن اس طرح ہیلو جہانگیر کہہ کے ہاؤس پریفیکٹ سے بات کرنے لگے جیسے مجھ سے متعلق ان کے ذہن میں کوئی بات نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اس وقعہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ دوسرے واقعہ کا تعلق ان کے دوسرے دور سے ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ اوائل ۱۹۵۶ء کی بات ہے، جمعہ کا دن تھا اور جمعے کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ سارے لڑکے مسجد کو جا چکے تھے صرف چند سینئر لڑکے جن میں میں بھی شامل تھا

رابرٹس ہاؤس کے کچن کے پیچھے گپ اور کھیل میں مصروف نظر آئے ان کی جھلک دیکھتے ہی ہوشیار پرندے تو فوراً ہوا ہو گئے۔ ادھر انہیں بھی دیوار کی آڑ ہونے کی وجہ سے ہم لوگوں کی موجودگی کا مبہم سا احساس ہوا تھا۔ چنانچہ ان کی مخصوص گھمبیر آواز گونجی۔ جب وہ ذرا آگے آئے تو سامنے میں کھڑا تھا۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ میں نے راہ فرار اختیار کیوں نہیں کی تھی۔ بہر حال نہ بھاگنا بھی ایک طرح کا لاشعوری عمل تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میں اکیلا ان کے سامنے کھڑا تھا اور دل میں ڈر رہا تھا کہ آج خیر نہیں۔ بہر حال انہوں نے نسبتاً کم سخت لہجے میں پوچھا یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں اس وقت اتنا سہا ہوا تھا کہ میں نے آئی ایم ساری سر بھی نہیں کہا۔ انہوں نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں صرف اتنا کہا۔ ''پانچ منٹ میں مسجد پہنچو۔ میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے بنگلہ کی طرف چلے گئے۔ اس لفظ سے انکی اس مخصوص پر جلال چال کی تصویر نہیں کھنچتی جو اس وقت بھی میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بہر حال جب کپڑے بدلنے اپنی ڈارم میں گیا تو میرے وہ سنگی ساتھی جو مجھے میدان میں اکیلا چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ نکلے تھے اپنی اپنی کمین گاہوں سے برآمد ہوئے۔ ہر ایک یہی پوچھتا تھا۔ پھر کیا ہوا؟ حشر کیا ہوا؟ حشر کیا ہوا؟ میں جلدی میں تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا یار وہ پھر بتاؤں گا۔ اس وقت راستہ چھوڑو پانچ منٹ میں مسجد پہنچنا ہے۔ تم بھی جلدی کرو۔ اس وقت تو میں خوش ہوا تھا کہ چلو جان چھوٹی۔ آج میں ان دو واقعات اور اس طرح کے اور دوسرے بہت سے واقعات کو یاد کرتا ہوں اور ان کا تجزیہ کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ انکی سختی اندھی نہیں تھی کہ جو بھی اس کی زد میں آ جائے مار کھا جائے۔ وہ ہر لڑکے کو خوب سمجھتے تھے۔ انہیں یقیناً اضطراری غلطی اور بد نیتی کی غلطی میں فرق کرنا آتا تھا اور ذمہ دار لڑکوں کی کبھی کبھار کی اضطراری فروگذاشتوں کو وہ فراخدلی سے نظر انداز کر دیتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دو موقعوں پر کوئی عادی اور غلط کار لڑکا ہوتا تو وہ اسے ہر گز معاف نہ کرتے۔ وہ صحیح معنوں میں ماہر تعلیم تھے اور تعلیم وتربیت کے اسرار ورموز پر انکی گہری نظر تھی۔ آخر میں، میں ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں

جس سے ان کے فلسفہ تربیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ۱۹۵۶ء کے اوائل میں انہوں نے آرمی کلاس کے سینئر کیڈٹس کو سٹاف کے ساتھ ٹینس کھیلنے کی اجازت دی۔ مجھے یاد ہے کہ اس گروپ میں میرے علاوہ ۱۸۶۲ رحمدل، ۱۸۸۸ رؤف اور ۱۸۷۱ سجاد حیدر بھی تھے۔ شروع شروع میں تو ہم اسٹاف کے ساتھ کھیلتے ہوئے جھجکتے رہے لیکن کچھ دنوں کے بعد کھل گئے تھے، اقبال صاحب، بلگرامی صاحب، مولوی محمد حسن صاحب جیسے بزرگ استادوں اور خود کمانڈنٹ کرنل رفیق صاحب میں اسپورٹس مین سپرٹ بھی بہت تھی۔ ٹینس کورٹ پر وہ بہت لائٹ موڈ میں ہوتے تھے۔ ہار کر یا سروس کھو کر میں نے انہیں جھنجھلاتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی کھیل کے دوران کولڈ ڈرنکس بھی چلتے تھے۔ ہر بار اسٹاف یا کمانڈنٹ کو زیر بار کرنا ہمیں اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے ہماری کوشش ہوتی کہ کھیل ختم ہوتے ہی ہم کورٹ چھوڑ دیں۔ ایک روز ہم کھیل کے بعد اپنی جرسیاں اٹھا کر چلنے ہی والے تھے کہ وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے۔ تم لوگ اپنے کولڈ ڈرنکس کیلئے آفیسرز میس کو چٹ کیوں نہیں لکھتے ؟ ان کے اس سادے سے ایک جملے نے ہماری دنیا بدل دی۔ دوسروں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری زندگی میں یہ جملہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کولڈ ڈرنک کیلئے پہلی چٹ لکھنے کی خوشی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس سے جو احساس ذمہ داری پیدا ہوا اس نے زندگی کے آئندہ مرحلوں کو پانی دیا۔ آج جب میں اس جملہ کو یاد کرتا ہوں اور اس کا تجزیہ تو بے اختیار ان کی قیادتی عظمتوں کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اکثر ان کی سختی کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن یہ سختی بہت سوچی سمجھی تھی اور اس کے پیچھے ایک مفکر اور فن قیادت کے ماہر کا ذہن تھا۔ ان کی شخصی اور قیادتی صلاحیتیں اس پایہ کی تھیں کہ ان سے قومی سطح یا کم از کم فوجی سطح پر کوئی بہت بڑا کام لینا چاہیے تھا۔ ایسے جینئیس روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ مجھے یقین ہے کہ انکی سیرت و کردار پر یہ کتاب قیادت کے نصاب میں جگہ پائے گی اور اس سے اس میدان کے نو واردوں اور پختہ کاروں کو بڑی روشنی ملے گی۔

۱۸۷۱ کموڈور سید سجاد حیدر

یہ واقعہ نومبر ۱۹۵۵ء کے اوائل کا ہے۔ نیوی میں کمیشن کیلئے میں آئی ایس ایس بی پاس کر چکا تھا اور غالباً میڈیکل وغیرہ کے سلسلے میں کالج ہی میں تھا۔ ان ہی دنوں میرے والد صاحب کی آنکھوں کا آپریشن ٹیکسلا ہسپتال میں ہوا تھا۔ میں اس وجہ سے کچھ پریشان سا تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے چھٹی کے لئے کہا تو فرمایا۔ ''جاؤ ابھی جاؤ، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب جب تک ان کی آنکھیں ٹھیک نہ ہو جائیں تم ان کے پاس ہی ٹھہرو''۔ ان حالات میں چھٹی دینے سے تو شائد کوئی بھی انکار نہ کرتا لیکن انہوں نے جس انداز سے جس خلوص سے اور جس شفقت سے مجھے چھٹی دی اور اصرار کر کے فوراً بھجوایا اس کا نقش میرے دل پر تا زیست رہے گا۔ اسی طرح ۷۸۰ ارقیب کی حادثاتی موت پر ان کا جو جذباتی رویہ تھا اس کا نقش بھی میرے دل پر ثبت ہے۔ ہاکی کھیلتے ہوئے رقیب کے سر میں چوٹ آ گئی تھی یہ چوٹ مہلک ثابت ہوئی۔ یہ واقعہ ان کے پہلے دور ۵۳۔۱۹۵۲ء کا ہے۔ اس دور میں وہ بڑے جلال میں تھے۔ رقیب کی موت کے سانحہ پر ہم نے دیکھا یہ شخص جو سنگ خارا نظر آتا ہے، بے حد جذباتی بھی ہے۔ سی ایم ایچ جہلم میں وہ تمام رات رقیب کے پاس بیٹھے رہے۔ اس کی موت پر آنسوؤں سے روئے۔ وار میموریل (یادگار شہداء) پر اس کی نماز جنازہ بڑے اہتمام سے کرائی اور پورے اعزاز سے اس کے تابوت کو رخصت کیا۔ یہ سب کام کوئی بھی سی او ہوتا کرتا۔ لیکن میں بات اس جذبے (فیلنگ) کی کر رہا ہوں جس کے ساتھ انہوں نے ان رسوم کو انجام دیا۔ وہ سو فیصد پر خلوص تھے سچے اور کھرے تھے۔ بچوں کا دل صاف ہوتا ہے ان کی نظر الفاظ پر نہیں دل پر جاتی ہے۔ ان کے پہلے دور میں، میں بہت جونیئر تھا۔ اس وقت بھی مجھے اور سب کو یقین تھا کہ نیا کمانڈنٹ خواہ سخت ہو لیکن بالکل کھرا اور سچا ہے۔ رفیق صاحب کی Credibility ہمیشہ ہر دور میں بہت اونچی رہی۔ اقبال نے اپنے مثالی انسان میں، قہاری و غفاری اور قدوسی و جبروت، ان چار عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ کرنل رفیق کے اندر یہ دو متضاد صفات غفاری

وقہاری بیک وقت بہت صحیح تناسب کے ساتھ موجود تھیں۔عموماً ہوتا یہ ہے کہ اچھے ہمدرد، شفیق لوگ کمزور ہوتے ہیں۔وقت آنے پر دب جاتے ہیں انکی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ وہ اہم سے اہم اصولی معاملے میں مفاہمت کی راہ ڈھونڈتے رہتے ہیں، ان میں انصاف سے ٹکرانے اور برائی یا ظلم کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور اس کو زیر کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔مختصر یہ کہ لوگ ذاتی طور پر اچھے ہوتے ہیں لیکن قیادت ان کے بس کی چیز نہیں ہوتی۔ وہ احساس تحفظ نہیں دے سکتے۔اس کے برخلاف جو لوگ موثر، فعال اور قائدانہ صفات کے حامل ہوتے ہیں، وہ عموماً بے اصولے ہوتے ہیں، حقیقی ہمدردی اور گہری شفقت سے عاری۔لوگ ان سے ڈر سکتے ہیں ان کی عزت نہیں کر سکتے۔لیکن کرنل رفیق میں شفقت کے ساتھ صلابت اور جرأت تھی۔ وہ جرأت سے مشکل فیصلے کر سکتے تھے اور ان پر اڑنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔روایتی معنوں میں تو شاید نہیں لیکن عملی طور پر کرنل رفیق میں مومن کی بہت سی صفات موجود تھیں۔

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

ان کو دیکھ کر اور ان کے رویے اور کردار سے کم از کم مجھے اندازہ ہوا کہ کردار کسے کہتے ہیں، دیانت کیا ہے، قیادت کے اوصاف کیا ہوتے ہیں۔ان کے حوالے سے مجھے بہت سی انسانی اور مذہبی قدروں کا ادراک ہوا۔ وہ لوگ جو کالج میں جولائی ۵۲ء میں موجود تھے انہیں یاد ہوگا کہ کرنل رفیق نے چارج لیتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ہر لڑکے سے فرداً فرداً انٹرویو لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کمانڈنٹ کے بنگلے میں باری باری پانچ پانچ لڑکے جاتے تھے۔ ڈرائینگ روم میں ایک قرآن شریف رکھا تھا اس پر ہاتھ رکھ کر بات شروع کرتے تھے اور جس کے دل میں جو بات ہوتی تھی، جو پرابلم ہوتی تھی، جو خوف ہوتا تھا، یا کوئی تجویز ہوتی تھی وہ بے دھڑک بیان کرتا تھا۔ یہ ان کا ایک انقلابی اقدام تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان سے پہلے اور غالباً انکے بعد بھی کسی نے ہر لڑکے سے اتنا تفصیلی انٹرویو نہ لیا ہوگا۔ یہ شائد پہلا اور غالباً

آخری موقع تھا جب ہر لڑکے کو برابر کی اہمیت دی گئی اور ہر لڑکے کو خواہ وہ لائق ہو یا نالائق، ذہین یا غبی، تیز طرار ہو یا شرمیلا اسے موقع دیا گیا کہ کمانڈنٹ سے براہ راست گفتگو کرے۔ اس ہمہ گیر انٹرویو سے جہاں انہیں کالج کی اندرونی صورت حال، ڈسپلن کی کیفیت کا علم ہوا ہوگا وہاں جونیئرز کو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دفتر کے سامنے suggestion باکس لگا ہوا تھا۔ انٹرویو کے بعد کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو ہم لکھ کر ڈال دیتے۔ ورنہ کسی بڑے مسئلہ کی صورت میں براہ ست ان سے بات کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن وہ چونکہ ہر موقعہ پر ہر جگہ خود موجود ہوتے تھے، اس لئے کالج میں کم ہی کوئی ایسی بات ہوتی جس کا انہیں علم نہ ہوتا۔ ۱۹۵۲ء کے یوم استقلال ۱۴ اگست کو انہوں نے انوکھے انداز سے منایا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۴ اگست کی صبح کو سارا کالج گیٹ سے باہر سڑک پار کھیلوں کی گراؤنڈ میں جمع ہوا تھا۔ وہاں ہر لڑکے نے اپنے حصے کا پودا لگایا۔ استادوں نے باڑ کے بیج ڈالے۔ پھر ہر لڑکا صبح سویرے پی ٹی کے وقت ایک لوٹا پانی اپنے پودے کو دیتا تھا۔ برسہا برس کے بعد جب میں ادھر سے گزرا تو وہ پودے اونچے پیڑ بن چکے تھے۔ اب بھی جب کبھی ریل پر یا کار پر ادھر سے گزرتا ہوں تو جھانک کر ان بلند و بالا پیڑوں کو دیکھ لیتا ہوں جو ایک شخص کی پاکستان سے محبت اور اس کے فلسفہ تربیت کی علامت ہیں۔ اگر قومی دنوں کو اس طرح تعمیری طریقے سے منانے کی روایت ملک میں رواج پا جائے تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں اور ایسا تعمیری قومی رویہ پیدا ہو جائے جس کی ہمیں بحثیت قوم سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر قومی اور مذہبی تہواروں پر کسی منصوبے کے تحت رضا کارانہ طور پر کچھ کیا جائے، خدمت کی شکل میں، اشیاء کی شکل میں اور نئے فلاحی اداروں کی شکل میں تو قوم کی تقدیر بدل جائے۔ پہلے رجمنٹل سسٹم تھا۔ اس کی بنیاد اتھارٹی کے جبر پر تھی۔ اس جبر کی جگہ عزت نفس کے شعور اور جذبے نے آنر سسٹم کی شکل میں لی۔ آنر سسٹم پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا، دنیا میں کوئی سسٹم بھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوتا لیکن اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ آنر سسٹم کا اثر بہت گہرا ہوا۔ کریکٹر بلڈنگ کا نام تو بہت لیا جاتا ہے۔ لیکن صحیح قسم

کی کریکٹر بلڈنگ مربوط اور منظّم طریقے سے ایک منصوبے اور نصاب کے مطابق کی تو کرنل رفیق نے کی اور اس قسم کی اخلاقی تحریک کو موثر بنانے کیلئے جس قسم کی محرک شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تب وتاب بھی ان کی شخصیت میں تھی۔ وطن کی محبت اور وطن سے تعلق پر بھی انہوں نے زور دیا۔ ۱۴ اگست پر شجر کاری کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ قائداعظم کے فرمودات انہوں نے کالج کے کلاس رومز کی بیرونی دیواروں پر جلی حروف میں لکھوائے۔

اب میں ان چھوٹی چھوٹی انتظامی باتوں کا ذکر کروں گا جن سے ہم طلبہ کی زندگی پر خوشگوار اثر پڑا۔ مثلاً کیڈٹس کا کھانا بہت بہتر ہو گیا۔ چاروں ہاؤسوں کا دوپہر کا کھانا ہر روز وہ خود چیک کرتے تھے۔ کھانے کا رجسٹر تھا ہر روز اس پر نمبر دیئے جاتے تھے۔ جس ہاؤس کے نمبر زیادہ ہوتے اسے انعام سے نوازا جاتا۔ شام کا کھانا اسٹاف کے علاوہ خود دیکھتے تھے۔ باورچی خانوں کی صفائی پر خصوصی توجہ تھی۔ جب اکتوبر ۱۹۵۵ء میں دوسری بار وہ یہاں آئے تو انہوں نے اسکاؤٹنگ کو بہت اہمیت دی۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے ڈنر نائٹ کا اہتمام کیا، پورے تکلفات کے ساتھ۔ ہر ہاؤس کی ٹائی علیحدہ تھی۔ کھانے کے بعد ہاؤس میں ورائٹی پروگرام ہوتا تھا۔ ان کے دوسرے ٹرم میں مجھے زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا۔ میں نیوی کے کمیشن میں پہلی بار میڈیکل میں فیل ہو گیا تھا اس کی اپیل وغیرہ کرنا تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میری یہ پرابلم ہے حالانکہ وہ ان دنوں نئے نئے آئے تھے اور بے انتہا مصروف تھے اس کے باوجود انہوں نے نیول ہیڈ کوارٹر کراچی سے بار بار رابطہ قائم کیا، بہت تگ ودو کے بعد میرا کام کرایا۔ نیوی میں کمیشن کے بعد میں تربیت کیلئے انگلستان چلا گیا۔ پھر عرصے تک باہر رہا۔ اس عرصے میں کبھی کبھار ان سے خط وکتابت ہوتی رہتی تھی۔ وہ نیوی میں میری ترقی کی رفتار سے بہت خوش تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جب میں گھوڑا گلی کالج میں کمانڈر نیوی کی حیثیت سے تعارفی لیکچر دینے گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ گلے لگایا تو وہ خوشی سے پھٹ پڑے۔ میری وی آئی پی کی طرح پذیرائی کی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں میری

ترقی سے قلبی خوشی ہوئی ہے۔ اپنے فخر اور خوشی کا اظہار انہوں نے میرے تعارف میں بھی کیا۔ میرا خیال نہیں یقین ہے کہ ملٹری کالج کے ہر اولڈ بوائے سے ان کا رویہ یہی تھا۔ عام حالات میں شاید باپ بھی بیٹے سے ملکر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا وہ اولڈ بوائز سے ملکر خوش ہوتے تھے۔ ملٹری کالج ان کی کمزوری بن گیا تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی ملٹری کالج ضرور موضوع ہوتا اور اپنے کاموں کو کم کر کے اور اپنے سٹاف کے کاموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ان کی عادت تھی۔

۱۸۷۳ عزیز احمد، کویت

بے شمار اولڈ بوائز کالج کو کرنل رفیق کے حوالے سے یاد کرتے ہیں، میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ میں نے اکثر اس صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں کویت میں اس دور کا جو بھی اولڈ بوائے ملتا ہے اور اس سے گپ شپ ہوتی ہے تو رفیق صاحب کا ذکر ضرور آ تا ہے۔ بات شرارتوں سے شروع ہو کر سزاؤں سے ہوتی ہوئی کرنل رفیق پر ختم ہوتی ہے۔ بیس پچیس سال کے اس عرصے میں جو میں نے کویت میں گزارے ہیں ہر طرح اور ہر سطح کے آدمیوں سے ملا ہوں۔ بینک کی ملازمت ہی ایسی ہوتی ہے جس میں لامحالہ تعلقات بن جاتے ہیں۔ پھر چونکہ مجھے جہاں گردی کا شوق بھی ہے اس لئے جب بھی موقع ملتا ہے انٹرنیشنل پاسپورٹ لے کر نکل جاتا ہوں۔ دنیا کے اس تمام مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ گو کرنل رفیق کی لگن میں کلام نہیں لیکن ان کی کامیابی کا راز اُن کی مکمل Crdibility میں تھا، جو وہ کہتے تھے اس کی تعمیل کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ہم لوگ آرمی سپیشل کر کے کمیشن کی تیاری کر رہے تھے کہ زور خون نے جوش مارا تو بستر پر تکیوں کو اس طرح جما کر کہ جیسے کوئی سو رہا ہے اور چپلوں کو چارپائی کے ساتھ قاعدے سے رکھ کر باہر کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ شیش محل (آ کنلک ہاؤس) کے شہزادے اس کھیل میں طاق تھے شام کو جا کر ریکی کر آتے تھے کہ گاجریں کس طرف ہیں اور مولیاں کس کھیت میں، اور رات کو چھاپہ مارتے تھے۔ مختصر یہ کہ

اپنی تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود ہم پکڑے گئے۔ یوں تو کئی مہم پسند میرے شریک کار تھے، اب صرف ۱۸۴۹ء اللہ داد اور ۱۸۷۷ء اقبال کا نام یاد رہ گیا ہے۔ جو سزا ملی تھی وہ یہ تھی کہ پی ٹی کٹ میں صبح سویرے چار بجے پیٹی گراؤنڈ میں حاضر ہوں۔ رفیق صاحب نئے نئے آئے تھے ہمیں پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ یہ بھی کتنے جن ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اتنے سویرے وہ بھی سردیوں میں کوئی افسر ہمیں چیک کرنے کیا آئے گا، حوالدار میجر ای ڈی کرادے گا۔ چنانچہ ہم ڈاجنگ کے موڈ میں لہراتے ہوئے پی ٹی گراؤنڈ کی طرف روانہ ہوئے اور جب وہاں پہنچے تو سب کا کمانڈانٹ کے خوفناک سیاہ السیشن نے غرا کر استقبال کیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ یہ معاملہ تو خراب ہو گیا۔ اور معاملہ کس حد تک خراب ہوا ہو گا اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو رفیق صاحب کو جانتے ہیں۔ بہر حال جو سبق میں نے اس صبح سیکھا وہ آج بھی یاد ہے اور بینکنگ میں میرے کیریر کا اصول رہا ہے یعنی Credibility کو مستحکم کرنا۔ میرا خیال ہے کہ معاشی روابط ہوں یا کاروباری، انتظامی معاملات ہوں یا سماجی تعلقات ان سب کی بنیاد یہی Credibility ہے۔

قیادت کا سارا کام اس یقین پر چلتا ہے کہ جو کہا ہے اسی طرح ہو گا لیکن یہ مقام حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے پیچھے پورا کردار ہوتا ہے۔

۱۸۷۷ کرنل محمد اقبال

''میاں اقبال، آپ رفیق صاحب پر کتاب کیلئے ان سے متعلق دو ایک واقعات ریکارڈ کرائیں''۔

سر، کالج کے واقعات تو سب ہی نے بتائے ہونگے۔ میں ان کے آخری زمانے کے دو واقعات سناتا ہوں۔

''جی''

وہ لارنس کالج میں پرنسپل تھے تو میں اپنے چھوٹے بچے کو وہاں داخل کرانے کیلئے لے گیا نرسری میں۔

پوچھا اس کی عمر کتنی ہے میں نے کہا کہ چار سال اور چند ماہ۔ انہوں نے دو چار سوال بچے سے پوچھے اور مجھ سے کہا۔ اقبال! بچہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ داخل کر لونگا۔ لیکن تمہاری پرابلم کیا ہے۔ گھر پر کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں یا ماں پڑھی لکھی نہیں۔ میں نے کہا ایسی تو کوئی بات نہیں ماں تعلیم یافتہ بھی ہے گھر میں دیکھ بھال بھی ٹھیک ہو رہی ہے۔ میں بھی کچھ وقت دے دیتا ہوں۔ کہنے لگے، ایک اچھے گھر کا کوئی بدل نہیں ہوتا، اتنی چھوٹی عمر میں بچے کو ماں باپ کی محبت و شفقت سے محروم کر دینا مناسب نہیں۔ بچے میں جذباتی تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ بہر حال اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ یہ باتیں انہوں نے اس لب ولہجہ میں کیں جیسے وہ پرنسپل نہیں گھر کے کوئی بزرگ یا مرشد ہوں۔ پھر وہ دیر تک میرے بڑے بھائی میجر مولا بخش کے بارے میں پوچھتے رہے جن سے ان کے پرانے مراسم تھے۔ بر سبیل تذکرہ میں نے کہا پنڈی سی۔ جی ایچ میں ایک بہت اچھے ڈاکٹر بھائی مولا کے دوست ہیں۔ آپ کو سانس کی بڑی تکلیف ہے ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ چلئے آج ہی سہی۔ کہنے لگے آج نہیں، آج شام تک کا میرا پروگرام متعین ہے۔ انشاء اللہ کل نو بجے میں جی ایچ کیو کے گیٹ پر پہنچ جاؤں گا۔ میں ان سے وقت طے کر کے پنڈی واپس آ گیا۔ دوسرے دن جو تجربہ مجھے ہوا وہ قابل تحریر ہے۔

''وہ کیا؟''

نو بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے میں گیٹ کی طرف آنے لگا تو دیکھا کہ رفیق صاحب کی فوکسی گیٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو نو بجنے میں ایک منٹ تھا۔ میں نے کہا کہ سر، آپ کی سانس چڑھی ہوئی ہے، موسم توقع سے زیادہ سرد ہے، ذرا دیر میں دھوپ نکلنے پر آپ آ جاتے۔ کہنے لگے۔ ''نہیں اقبال میں نے تمہیں نو بجے کا وقت دیا تھا۔ دراصل، میں نو سے ذرا پہلے آ گیا تھا۔ دس منٹ فیض آباد پر انتظار کرتا رہا کہ وقت پر پہنچوں''۔ اللہ اکبر! یہ تھے رفیق صاحب۔ وقت کی پابندی ایک ذہنی رویئے کو ظاہر کرتی ہے، ایک لائف سٹائل کی غماز ہوتی ہے اور یہی اس کی اہمیت

ہے۔رفیق صاحب کا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انہوں نے کیڈٹس کی کئی نسلوں کو اپنے لائف اسٹائل، رویوں اور طریق قیادت سے انسپائر کیا۔ انہیں پاکستان سے عشق تھا اور اس پر فخر بھی۔ اس جذبے اور رویے کو بھی ہم لوگوں نے جذب کیا۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کرنل رفیق کے کردار کا آدمی نہیں دیکھا۔ افسوس کہ ہم اپنے اچھے اور غیر معمولی انسانوں کی کماحقہ قدر نہیں کرتے، ان کی زندگی میں کیا، ان کے مرنے کے بعد بھی نہیں۔ مجھے خوشگوار حیرت ہے کہ رفیق صاحب پر یہ کتاب لکھی جا رہی ہے جو کہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ ایک نئی روایت ہے۔ خدا کرے ہم اپنے محسنوں اور............ کردار سازوں کو یاد رکھنا سیکھیں۔ اس ملک میں بڑے بڑے اچھے استاد گزرے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کا تذکرہ بھی مرتب کیا جائے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں جو غیر معمولی لوگ ہیں انہیں یاد کیا جائے اور قومی تاریخ کا حصہ بنایا جائے۔ اچھے لوگوں کو یاد کرنا اصل میں اچھی باتوں کو یاد رکھنا ہے۔

۱۸۸۸ بریگیڈئر عبدالرؤف

اصلاح کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا صورت حال کا جائزہ لینے کا، دوسرا اصلاحی اقدامات کی منصوبہ بندی کا اور تیسرا ان کی تعمیل کا۔ یہ تیسرا مرحلہ سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس میں اصلاح کار عموماً یہیں مار کھاتا ہے اور اسی مرحلہ میں ناکام ہوتا ہے۔ ملٹری کالج میں اصلاح احوال کیلئے رفیق صاحب نے جو اقدامات کئے ان میں انکی حیرت انگیز کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس تیسرے مرحلہ پر انکی مکمل گرفت تھی۔ کوئی اصلاحی، تعمیری قدم ہو، کوئی حکم ہو وہ اس کی تکمیل پر پوری توجہ دیتے تھے۔ کام چوری، یا حکم عدولی کی وہ گنجائش ہی نہیں چھوڑتے تھے۔ کام کروانے کے معاملہ میں وہ بلا مبالغہ ''جن'' تھے۔ اب اتنی معمولی سی بات کہ کوئی سینئر لڑکا حجام سے صبح سوتے شیو نہ کرائے اسکی چیکنگ بھی ہوتی تھی۔ وہ چانس پر کچھ نہیں چھوڑتے تھے۔ ہم سینئر کیڈٹس کو اپنے استادوں کی حالت دیکھ کر رحم

آ تا تھا۔لمبی لمبی میٹنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر وقت ہر جگہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا تھا۔ ہر طرف ایمر جنسی کا سماں نظر آ تا تھا۔اب وہ شب و روز یاد کرتا ہوں تو رفیق صاحب اور دوسرے اساتذہ کی قدر دل میں دو چند ہو جاتی ہے۔ انہیں کام کرنے کا جنون تھا۔ ان کا خلوص چھلک چھلک جاتا تھا۔ بہت سخت گیر تھے۔لیکن ویلفئیر خصوصاً ملازموں کے ویلفیئر کا اہتمام بھی کرتے تھے، وقت کی پابندی ہو، لباس کی نفاست یا ادب و آداب کی شائستگی جس عمل کی توقع وہ ہم سے کرتے تھے وہ پہلے خود کرتے تھے۔ کہنے کو تو یہ بات بہت آسان نظر آتی ہے لیکن ایسا کرنا مشکل ترین کام ہے۔انہوں نے اس مشکل کو آسان کیا ہوا تھا۔بعض انسانی کمزوریوں سے وہ بری نہیں تھے۔انتہا پسند تھے۔کبھی کبھی بھڑک بھی اٹھتے تھے، لیکن کیڈٹس سے، کالج سے اور ملک سے ان کی جذباتی وفاداری غیر مشروط تھی۔لوگ اس وقت بھی اور بعد کو بھی ان کے طریق کار سے اختلاف رکھتے تھے لیکن انکے بدترین مخالف نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ شخص خود غرض ہے، تنگ دل، تنگ نظر یا بے اصول ہے اور اپنا یا اپنی کور کا مفاد اسکے پیش نظر رہتا ہے۔ یہ کوئی کم کریڈٹ نہیں ہے۔ان کی شخصیت کی متضاد تاثیر تھی ان کے قریب جانے کو دل بھی چاہتا تھا لیکن انکی ہیبت ایسی تھی کہ قریب جانے سے ڈر بھی لگتا تھا۔اگر کبھی کسی کو ان کے قریب ہونے کا موقع ملتا تو وہ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔ایک بار مجھے یہ موقع ملا اور وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہوا یہ کہ ایک روز ہم رابرٹس ہاؤس کے کیڈٹس پکنگ کیلیئے باہر گئے۔حسب دستور ہاؤس اسٹاف کے علاوہ کمانڈنٹ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب واپس آئے تو خاصی دیر ہو چکی تھی اور رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔میں اتنا سینئر پریفیکٹ تو نہ تھا بہر حال میرے جی میں کیا آئی کہ میں آگے بڑھا اور میں نے کہا سر، آج آپ ہمارے ساتھ کھائیں۔ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ یہ بھی ان کی حسن طبیعت تھی کہ وہ جونیئرز کی دلداری کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔اس زمانے میں کالج کے ڈائینگ ہالوں میں میزوں کے ساتھ لکڑی کی بینچیں ہوتی تھیں۔ دو ایک کرسیاں صرف اسٹاف کیلیئے لگائی جاتی تھیں۔

حالانکہ کرسی موجود تھی وہ ہمارے ساتھ کھانا کھانے بینچ پر ہی بیٹھے۔ مجھے انکے دائیں ہاتھ کی طرف بیٹھنے کی عزت حاصل ہوئی۔ ایک آدھ رسمی بات کرنے کے بعد انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا رؤف ! ایک مخلص دوست کا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں کی دوستی کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتی ہے۔ انکی گفتگو تو انگریزی ہی میں ہوتی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ یہ اس کا ادنیٰ سا ترجمہ ہے۔ جب میں نے ان کے الفاظ سنے تو ان کے پیچھے انکی پوری شخصیت تھی۔ انکے الفاظ میرے دل میں چبھ کے رہ گئے۔ کئی روز تک سوچتا رہا کہ یہ تبصرہ میری عمومی رہنمائی کیلئے تھا۔ اس وقت میں جس دور سے گزر رہا تھا وہ دوست بنانے کی عمر ہوتی ہے۔ وہ بروقت میری رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے میرے کیریئر کو میری پیشانی پر پڑھ لیا تھا۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ ان کی یہ خواہش ہر شاگرد کیلئے ہوتی تھی کہ وہ کچھ بنے اور کچھ کر کے دکھائے۔ آج تقریباً پچیس سال کے بعد جب میں یہ واقعہ لکھ رہا ہوں تو ان کے تبصرہ کی سچائی پر میرا پورا ایمان ہے اور تجربات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اچھے یا برے دوستوں سے بھی زندگی میں فرق پڑ جاتا ہے۔ مزید برآں میرا یہ تجربہ بھی ہے کہ ہزار بار کی سنی بات جب ایک صاحب نظر کی زبان سے نکلتی ہے دل میں از خود اتر جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بات میں تاثیر کردار سے آتی ہے۔ ان کی وفات سے چند ماہ قبل ۱۵ ستمبر ۱۹۸۱ء کو کالج کے یوم تاسیس کے موقع پر لاہور زون کے عالمگیرینز نے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس زمانے میں انہیں سانس کی شدید تکلیف تھی۔ عام صحت بھی اتنی گر چکی تھی کہ بغیر سہارے کے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن ہم اولڈ بوائز کے اصرار پر انہوں نے مہمان خصوصی کے طور پر اس تقریب میں شرکت کرنا قبول کر لیا۔ جب وہ کار سے اترے اور انہیں سہارا دے کر ہال میں لایا گیا تو میرے دل نے کہا۔ اس حالت میں انہیں تکلیف دے کر ہم نے زیادتی کی۔ لیکن آنے اور بیٹھنے کے بعد انہوں نے کاروائی میں پوری دلچسپی لی اور میرا خیال ہے کہ محض قوت ارادی سے انہوں نے دمے کے حملے کو دور رکھا۔ صرف ایک دو بار دوا سونگھی۔ تقریر کرنے کی ان

کی حالت نہیں تھی مگر جب ظہور شوکت نے مائیک ان کی کرسی کے سامنے رکھ دیا تو انہوں نے بیماری یا کمزوری کا کوئی عذر نہیں کیا۔ بلکہ بڑے شوق سے ایک مختصر تقریر بھی کی۔ ان کا ایک فقرہ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا تھا۔ انہوں نے کہا! ''تین پیشے ایسے ہیں اگر ان کو دیانت داری سے نبھایا جائے تو وہ عبادت کے زمرے میں آجاتے ہیں۔ ایک سپاہی، دوسرا استاد، اور تیسرا ڈاکٹر''۔ .... کون کہہ سکتا ہے کہ وہ خود ایک دیانت دار اور فرض شناس سپاہی اور استاد نہ تھے۔ ظاہراً اور باطناً۔

۱۸۹۴ لیفٹیننٹ کرنل احمد جان

احمد جان، آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ ۵۳۔۱۹۵۲ء ملٹری کالج میں کرنل رفیق کے زیر تربیت رہے۔ ۱۹۵۴ء میں جے ایس پی سی ٹی ایس کوئٹہ میں وہ آپ کے چیف انسٹرکٹر تھے۔ یعنی آپ نے ان کو دو حیثیتوں سے دیکھا۔ واقعات کے حوالے سے بتایئے کہ آپ نے انہیں کیسا پایا؟

سر، عرض کرتا ہوں۔ کالج کا ایک واقعہ چونکہ مجھ سے ہی متعلق ہے اس لئے اسے سب سے پہلے سناتا ہوں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انگلش کا پیریڈ تھا۔ انسٹرکٹر صاحب نے مجھے پیراگراف پڑھنے کو کہا۔ اس میں ایک لفظ ایو EVE آیا۔ اس کو میں نے ای وی پڑھا۔ استاد صاحب نے نہیں ٹوکا۔ لیکن کرنل رفیق نے جو حسب عادت کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ کہا ''نو۔ احمد جان یہ ای وی نہیں۔ ایو ہے''۔ یہ واقعہ میرے ذہن میں اس وقت سے نقش ہے۔ یہ عالم تھا ان کی توجہ اور ارتکاز کا۔

دوسرا واقعہ کرنل رفیق کے انگریزی خطابتی مجلس میں حصہ لینے کا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ابراہام لنکن کی مشہور گیٹسبرگ اسپیچ کا اقتباس پیش کیا تھا ان کی گھمبیر پاٹ دار آواز سے سماں بندھ گیا تھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا تھا کہ تقریر کا کتنا اثر ہوسکتا ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ غیر معمولی تاب وتوانائی کے مالک تھے۔ برڈوڈ ہاؤس میں کیپٹن اسماعیل کا بنوایا ہوا لکڑی کا ایک بہت بھاری ڈھول نما مگدر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسے پرکاہ کی طرح اٹھا لیتے تھے۔ انہیں لڑکوں کو آؤٹ ڈور لے جانے کا

بے حد شوق تھا۔ اس مقصد کے لئے سرکاری ٹرانسپورٹ منگواتے تھے۔ اس پر بہت سے آڈٹ آبجیکشن ہوئے تھے جو کالج میں میری ایجوٹنٹی کے زمانے میں طے ہوئے۔

جے ایس پی سی ٹی ایس کی کوئی خاص بات؟

جب میں ۱۹۵۴ء میں وہاں گیا تو اس وقت میجر کے رینک میں وہاں کے چیف انسٹرکٹر تھے۔ اس کورس میں دس پندرہ عالمگیرین تھے جو ایم سی میں ان کے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ لیکن انہوں نے ہماری کوئی رعایت نہیں کی بلکہ اپنا رویہ اوروں کے مقابلے میں سخت ہی رکھا۔ اپنے الوداعی ڈنر کے موقع پر انہوں نے ظاہر کیا کہ میں تم سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بالواسطہ طور پر میں نے تم پر سخت نظر رکھی۔ یہی تمہاری رعایت ہے۔ آخر میں کہا "کمیشن لینا تمہارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یا چیلنج کمیشن سے اور اپنے کیریر سے انصاف کرنے کا ہوگا"۔ ایک اور بات جو اس وقت ہم سب لوگوں کو پسند آئی یہ تھی کہ ان کا رویہ اپنے بڑوں سے شیرِ نر کا سا تھا۔ پُر جرأت اور باوقار، شو آف کرنے کا شوق انہیں بالکل نہیں تھا۔ جرنیل بھی آ جاتے (اور جرنیل آتے ہی رہتے تھے) لیکن ان کے رویئے میں ہمیں کبھی کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ہم نے انکے کردار کے اس جرأت مندانہ پہلو سے بہت کچھ سیکھا۔

۱۹۱۲ لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب ملک

یہ قصہ شیش محل (آکنلک ہاؤس) کا ہے۔ ہم سینئر لڑکے صبح سویرے (سوتے میں) حجام سے شیو بنوایا کرتے تھے۔ جب کرنل رفیق کے علم میں یہ بات آئی تو حکم ہوا کہ لڑکے خود شیو کیا کریں۔ ان کے حکم دینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کی تعمیل کی چیکنگ بھی ضرور کریں گے۔ میں آکنلک ہاؤس کا پریفیکٹ بھی تھا۔ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے خواہ مخواہ رسک لینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے جانتے بوجھتے چانس لیا اور منظور باربر کو (جو پانچ روپے کے عوض یہ خدمت انجام دیا کرتا تھا) ساڑھے چار بجے صبح

کا وقت دے دیا۔ جو معمول کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے تھا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ مجھے خیال آیا اس وقت کون بستر سے نکلتا ہے۔ بہرحال دوسرے روز ساڑھے چار بجے جب منظور نے شیو کرنا شروع کی تو کرنل رفیق دروازے پر نمودار ہوئے، ایک نظر دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ منظور کے تو ہوش اڑ گئے۔ اس نے مجھے جنجھوڑ کے اٹھایا (ملک صاحب اٹھو۔ ملک صاحب اٹھو) میں انگڑائی لے کے اٹھا۔ کیا ملک صاحب ملک صاحب کا شور مچا رکھا ہے کیا بات ہے۔ کرنل رفیق صاحب ابھی ابھی چیک کر کے گئے ہیں۔ اس نے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔ میں نے پوچھا کچھ کہا تو نہیں۔ وہ بولا نہیں۔ تو میں نے بڑی شان بے نیازی سے کہا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ہاؤس پریفیکٹ ہوں تمہارے الاؤنس میں ایک روپے کا اضافہ کل سے تم ساڑھے تین بجے آنا۔ چنانچہ دوسرے روز منظور نے ساڑھے تین بجے رات کے اپنی کاروائی شروع کی۔ ابھی وہ شیو کیلئے صابن ہی لگا رہا تھا کہ اوپر سے رفیق صاحب نازل ہو گئے۔ چھڑی ان کے ہاتھ میں تھی۔ پھر وہ جو شروع ہوئے تو پھر کوئی حدوحساب ہی نہیں۔ یہاں تک کہ چھڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ خود مجھے حیرت ہے کہ میں نے اس پٹائی کو برداشت کیسے کیا جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو مار سے بچا ہو۔ اس داستان کا اگلا حصہ یہ ہے کہ جب کمیشن ملنے کا وقت آیا تو محض کرنل رفیق کی وجہ سے پنجاب رجمنٹ لی تا کہ شاید کبھی ان کے نیچے سروکرنے کا موقع مل جائے۔

۱۹۳۱ لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) عطا محمد

میں اگست ۱۹۵۰ء میں کالج میں دس گیارہ برس کی عمر میں پانچویں درجے میں داخل ہوا تھا اور ۱۹۶۰ء میں ایف اے کر کے کالج کو خیر باد کہا۔ میں نے کرنل رفیق کے دونوں دور دیکھے اور دوسروں کے دور بھی۔ اب جو تاثرات وواقعات میں بیان کرنے جا رہا ہوں ان کی اہمیت ان کا پس منظر بیان کئے بغیر واضح نہیں ہو گی۔ اس لئے میں پہلے ان حالات سے شروع کرتا ہوں جن سے میں کالج میں اپنے داخلے کے وقت دوچار ہوا تھا۔ رجمنٹل سسٹم تو آبادیاتی دور کی ضرورت تھا۔ اس کی کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہونگی۔ لیکن

اس کی جس صورت سے اپنے کالج میں داخلے کے وقت دوچار رہوا وہ خاصی بھیانک تھی۔ دس گیارہ سال کے معصوم بچے سینئرز کے رحم وکرم پر تھے۔ جاڑوں میں بھی بہت صبح سویرے چار ساڑھے چار بجے بستر سے کھینچ کے اٹھایا جاتا۔ پھر جھاڑو سے سیکشن کا فرش صاف کرایا جاتا۔ تیل سے فرنیچر چمکایا جاتا۔ سینئر سیکشن کمانڈر کی چپلیں صاف کرنا اور ان پر پالش کرنا بھی فرائض میں شامل تھا۔ دراصل جونیئرز کی حیثیت سینئرز کے اردلیوں کی سی تھی۔ پلاٹون کمانڈرز، کمپنی کمانڈرز جو کیڈٹ آفیسر کہلاتے تھے اور ہاتھ میں بید رکھتے تھے، ان کو ''فیگ بوائے'' یا اردلی رکھنے کی باقاعدہ اجازت تھی۔ لڑکوں کو کوارٹر ماسٹر اسٹورز سے کھرپے بھی ''کٹ ایشو'' میں مہیا کئے جاتے تھے۔ چھٹیوں کے بعد کالج کی گھاس کی کٹائی کا شرف بھی کیڈٹس ہی کو ملتا تھا۔ سینئرز اچھی خاصی مارکٹائی کرتے تھے اور اگر ہاتھ سے یا بید سے نہ مارتے تو ایسی ذلت آمیز سزائیں دیتے جیسے جاؤ ڈے لیٹرین کا فرش صاف کرو(یہ ڈے لیٹرین برڈووڈ ہاؤس اور اسکین کے درمیان تھے اس جگہ جہاں اب بس کا گیراج ہے)۔ بجائے عزت نفس کے ذلت نفس کا ہر سامان تھا۔ چھوٹے لڑکے اکثر روتے رہتے اور ماں باپ کو کوستے رہتے کہ ہم نے کیا قصور کیا ہے ہمیں اس گہرے اور اندھے کنوئیں میں پھینک دیا ہے۔ خود میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ آیا واقعی میں اپنے والدین کا حقیقی بیٹا ہوں یا مجھے انہوں نے کسی سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ کیا انہیں خبر نہیں کہ میں یہاں کس جہنم سے دوچار ہوں؟ اس ماحول میں شفقت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سکون نہیں تھا جو زندگی کی پہلی ضرورت ہے۔ ہر وقت ایک دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کس وقت کوئی سینئر کٹ لگا دے۔ اس سسٹم میں پل کر اور یہ سارے دکھ اٹھا کر جو اب خود سینئر ہو گئے تھے ان کی ایک عجیب ذہنیت بن گئی تھی۔ وہ ڈسپلن کے بہانے اور سخت کوش بنانے کی آڑ میں ہر قسم کے ظلم کو روا رکھتے اور ہم جونیئرز کی بے بسی پر ہنستے تھے۔ ہمارے آنسوؤں کا مذاق اڑاتے تھے اور کہا کرتے۔ ''بچو یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہم نے بہت کچھ بھگتا ہے'' گویا وہ پچھلا حساب بھی ہم سے چکاتے تھے، وہ بھی سود در سود۔ کالج

میں زیادہ زور پی ٹی پریڈ، لاکر بنانے، ڈریس اور کٹ انسپکشن کرانے پر تھا۔ کچھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی تھیں۔ لیکن ان کا دائرہ فیض بھی تھوڑے سے خاص قسم کے لڑکوں تک محدود تھا۔ اس زمانے کی ایک اور ڈرل کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں آج کل یادگار شہداء ہے۔ یہاں پہلے فلیگ اسٹاف پہلی جنگ عظیم کا وار میموریل تھا جس کی گول سیڑھیوں کے وسط میں کوئی سوفٹ کے قریب اونچا فلیگ اسٹاف تھا۔ اس میموریل کو صاف رکھنے اور جھنڈا چڑھانے اتارنے کیلئے ہر ہفتہ ایک کمپنی (ایک ہاؤس) ڈیوٹی پر ہوتی تھی۔ پھر اس کمپنی کی بھی ایک پلاٹون تین دن ڈیوٹی پر ہوتی۔ باقی تین دن دوسری پلاٹون۔ پھر ہر پلاٹون کے تینوں سیکشن ایک ایک دن ڈیوٹی کرتے۔ اس طرح مہینے میں ایک بار ہر سیکشن کو یہ ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی۔ سنگ مرمر کے ہر ٹکڑے کو رگڑ کر چمکانا پڑتا تھا۔ سنگ مرمر کے چبوترہ پر ان رجمنٹوں کے نام لکھے ہوئے تھے جنہوں نے جنگ عظیم اوّل میں حصہ لیا تھا اور اس کالج کیلئے چندہ دیا تھا۔ اس پر لکھا تھا Lest We Forget یعنی ایسا نہ ہو کہ ہم بھول جائیں۔ جنگ عظیم کے ان مقتولوں کی یادگار کی دیکھ بھال ہمارے ذمے تھی۔ لیکن یہ اگست ۴۷ء سے پہلے کی بات ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کسی کو ان حالات کی اس تصویر میں زیادہ سیاہی نظر آئے لیکن میں نے پوری سچائی سے کم از کم اپنے احساسات کو بیان کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے جونیئرز کے بھی کم وبیش یہی احساسات ہونگے۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر شمسی، مسٹر ضمیر صدیقی، مسٹر اقبال، مسٹر ایوب، مسٹر مظہر، مسٹر حیدری، مسٹر راشد، ماجد صدیقی صاحب، مسٹر بلگرامی جیسے لائق اور فائق اساتذہ کالج میں آ چکے تھے اور تعلیم کا معیار بلند ہو رہا تھا لیکن جب لڑکا کلاس سے باہر رجمنٹل سسٹم کی وجہ سے اتنی ذہنی اور نفسیاتی بے چینیوں کا شکار ہو تو پڑھنا اس نے خاک ہے۔

مختصر یہ کہ ان حالات میں اور اس پس منظر میں کرنل رفیق نے جولائی ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ کالج کی پرنسپلی سنبھالی۔ اصل میں رجمنٹل سسٹم کی ایک تعلیمی ادارہ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ادارہ بھی وہ جس کا مقصد

ایک آزاد اسلامی مملکت کیلئے باحوصلہ اور باتدبیر افسر پیدا کرنا ہو۔اب مجھے معلوم نہیں کہ کرنل رفیق کی سفارش پر یا ازخود اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے اسی سال کالج کے سالانہ تقسیم انعامات کے موقع پر کالج کو نئے سرے سے پبلک سکول سسٹم پر منظّم کرنے کا حکم دیا۔لیکن ان کے حکم دینے سے پہلے ہی کرنل رفیق نے پرانے سسٹم کو سیدھا کرنا شروع کر دیا تھا۔سینئرز سے باز پرس شروع کر دی تھی۔ ان کے اختیارات کو لگام ڈالنی شروع کر دی تھی۔ فضول قسم کے ہر وقت کے انسپکشن ختم کر دئے تھے۔ان کے آنے سے کالج ایک نئے دور میں داخل ہوا۔اگرچہ وہ سسٹم فوری طور پر بدلا نہیں لیکن انکی اپنی کوششوں سے اس کا ڈنک نکل گیا اور ہم جونیئرز نے سکھ کا سانس لیا۔اگرچہ جسمانی مشقت کا ٹیمپو کم نہیں ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ اگست ۱۹۵۲ء میں کرنل رفیق نے گیٹ سے باہر باڑ اور پودے لگوائے تھے۔ان کو صبح سویرے لوٹا لے کر پانی ڈالنے جانا پڑتا تھا۔

اس زمانے کی ایک اور بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سینئرز کا ظلم ہم پر تو کم ہو گیا تھا لیکن خود ان کی پبلک کیٹنگ کا نظارہ اکثر دیکھنے میں آتا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان ڈسپلن کی بہت سخت سزا دیتے تھے اور سینئرز جونیئرز کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس دور میں سلامتی کا احساس پیدا ہوا۔ اور ترازو کے پلڑے برابر ہونے لگے اور جن محرومیوں اور زیادتیوں کا زیادہ تر جونیئرز شکار تھے ان کا بھی بڑی حد تک ازالہ ہو گیا۔

کرنل رفیق کا یہ دور زیادہ تر شاک ٹریٹ منٹ کا دور تھا جو بہت جلد اربابِ اقتدار کی مصلحتوں کی نذر ہو گیا۔اپریل ۱۹۵۳ء میں یکا یک ان کا تبادلہ ہو گیا اور وہ کام ادھورا رہ گیا جو انھوں نے نو مہینے پہلے شروع کیا تھا ان کے جانے کے بعد پھر دو سال کالج پر بڑے سخت گزرے۔۱۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو کالج ہال میں نئے کمانڈنٹ کرنل سلطان سکندر نے اعلان کیا کہ آج سے پرانا نظام ختم۔اس وقت سے کالج ایک پبلک سکول ہے۔ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام کھڑا کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔رجمنٹل سسٹم اچھا برا جیسا

بھی سہی ایک فریم ورک تو تھا۔ ڈسپلن کو قائم رکھنے کا ایک طریق کار تو تھا۔ اس کے ہٹنے پر ایک خلا پیدا ہو گیا۔ پھر لارنس کالج سے کرنل ایڈورڈز آئے تو ان کو پبلک سکول کا تجربہ تھا۔ خیال تھا کہ وہ کالج کو پبلک سکول کے طور پر منظّم کر سکیں گے۔ ان پر تبصرہ کرنا میرا منصب نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات بنی نہیں اور ڈسپلن اس حد تک خراب ہو گیا کہ عزت کیا جان تک محفوظ نہ رہی۔ لڑکے چاقو چھریوں سے لڑنے لگے۔ رات کو وہ اودھم مچتا کہ حد نہیں۔ آس پاس بھی ہنگامے ہونے لگے۔ ملٹری کالج ایک ادارے کی حیثیت سے تباہی کے گڑھے میں گرنے لگا تھا کہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو کرنل رفیق دوبارہ کمانڈنٹ مقرر ہو کر آئے۔

ایک شکستہ اور بوسیدہ عمارت کو نئی بنیادوں پر اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ منجملہ اور رکاوٹوں کے فنانس کی رکاوٹیں بھی تھیں۔ کرنل رفیق نے انتہا درجے کی کوشش کر کے ظاہر و باطن کی ہر چیز بدل دی۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵٦ء کا سالانہ فنکشن برڈوڈ ہاؤس کے پیچھے کے میدان میں ہوا تھا۔ میجر جنرل شاہد حامد مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر پہلی بار سب لڑکوں نے کالج ٹائی کے ساتھ ورسٹڈ کی پتلون پر کالج بلیزر پہنا۔ یہ بلیزر صرف ظاہر کی نہیں باطن کی تبدیلی کا مظہر بھی تھا۔

آنرسسٹم جاری ہو چکا تھا۔ عزت نفس پر زور تھا۔ کردار سازی کی مہم جاری تھی۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ شخصیت کی نشو و نما کی اولیّت دی جا رہی تھی۔ پی اے اسپیشل کا امتحان ختم کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کیلئے تیاری شروع ہو چکی تھی۔ کرنل رفیق بار بار کہا کرتے تھے کہ ''مجھے کتابی کیڑے نہیں چاہیں، مجھے متوازن شخصیت چاہیے''۔ یہاں تک تو میں نے انکے دور پر اپنے ذاتی تاثرات پیش کئے۔ اب میں واقعات کی طرف آتا ہوں۔ اس لئے اور بھی کہ راشد صاحب نے مجھ سے بااصرار کہا ہے کہ میں واقعات بیان کروں تاکہ عام لوگوں کیلئے بھی جو انہیں پہلے سے نہیں جانتے انکی صحیح امیج بن سکے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں کوئی خاص قوت تھی، ان کی نظر دل میں اتر جاتی تھی ۔کوئی ان کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔اور اگر سچا ہوتا تو اسے بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی' انکی نگاہیں خود ہی سچائی کو دیکھ لیتی تھیں ۔ یہ میں اپنے کئی بار کے تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں ۔ یہ غالباً ۱۹۵۷ء کی بات ہے میں رابرٹس سے تبدیل ہو کر آ کینلک ہاؤس میں گیا تھا اور وہاں کا ہاؤس پریفکیٹ تھا۔ میرے وہاں جانے کے کچھ دنوں بعد رابرٹس ہاؤس میں ایک کیس ہوا۔ اس میں کئی لڑکے ملوّث ہوے۔ دوسرے دن میں کلاس میں تھا کہ اردلی تاج آیا کہ کرنل صاحب بلاتے ہیں۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ کسی نے اس کیس میں مجھے ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں بے حد اطمینان سے حسب معمول اجازت لے کر ان کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے کرسی سے اٹھے' اور ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ جتنا وہ مار سکتے تھے انہوں نے مجھے مارا۔ یہ انکے ہاتھوں میری پہلی پٹائی تھی ۔میں حیران تھا اور مار سے مجھے زیادہ اس کا غم تھا کہ میں ضرور ان کی نگاہوں میں گر گیا ہوں ۔ جب وہ تھک کر بیٹھ گئے تو یہ کہا عطا یو ہیو لیٹ می ڈاؤن''۔ میری آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔ میں نے پوچھا کہ سر ہوا کیا ہے۔ مجھ سے کیا قصور ہوا ہے۔ جب انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے پاس شکایت آئی ہے تو میں نے سر اٹھا کر پوری قوت سے کہا۔ سر یہ بالکل غلط ہے جس نے آپ کو رپورٹ دی بالکل غلط دی ہے۔ آپ ہر طرح تحقیق کر لیجئے ۔ پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کئی لمحے دیکھتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی شعاع میرے دل میں اتر رہی ہے۔ پھر انہوں نے صرف یہ کہا۔ اب تم جا سکتے ہو''عطا اب مزہ آ گیا''۔ میں سمجھ گیا کہ کس نے آگ لگائی ہے۔ بہر حال مجھے اطمینان تھا کہ وہ انصاف کریں گے جو انہوں نے کیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی انہوں نے مجھے کالج پریفیکٹ مقرر کر دیا۔ دوسرا واقعہ میرے کالج پریفیکٹ ہونے کے بعد کا ہے۔ کالج یونین کی نائب صدارت کیلئے انتخاب ہوا۔ سعید ۲۰۸۱ اور امتیاز میں مقابلہ تھا۔ ان کے خیال کے مطابق سعید کو

جیتنا تھا۔لیکن جب نتیجہ نکلا تو امتیاز کے ووٹ زیادہ تھے۔کسی نے ان سے چغلی کھائی عطا کالج پریفکیٹ نے امتیاز کو اپنے اثر سے جتوایا ہے۔انھوں نے مجھے بلوایا۔عطا تمھیں غیر جانبدار رہنا تھا۔تم الیکشن آفیسر تھے۔میں نے کہا۔سر آپ محترمہ کارنیلس (میٹرن) اور کیپٹن شیر افضل ایجوٹنیٹ سے پوچھ لیجئے۔ یہ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔انھوں نے کہا۔مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔یہ کہہ کر انھوں نے اپنے مخصوص انداز سے میری طرف دیکھا اور کہا۔''ٹھیک ہے جاؤ''

ایک اور غیر معمولی خصوصیت جوان کے اندر تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے زیر کمان ہر فرد کو اچھی طرح جانتے تھے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی لڑکے کو اس کے نام سے نہ بلایا ہو۔اور اس کے پورے کوائف کا انھیں علم نہ ہو۔ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ دلچسپی حافظے کی مدد کرتی ہے۔یہ بھی غلط نہیں لیکن وہ اور طریقے بھی استعمال کرتے تھے۔جب میں کالج پریفکیٹ ہوا تو انھوں نے مجھے کہا!''تم اپنے کمرہ کیلئے پورے کالج کے لڑکوں کا چارٹ بناؤ''۔پھر انھوں نے اپنا چارٹ دکھایا۔کہنے لگے ہر روز دفتر میں اس چارٹ کو ضرور دیکھتا ہوں اور ہر ہاؤس کے لڑکوں کو پہچاننے کا میں باری باری اپنا ٹیسٹ لیتا ہوں۔مثلاً بغیر نام نمبر دیکھے ہوئے میں چیک کرتا ہوں یہ کون ہے،کس کلاس میں ہے،کہاں سے آیا ہے وغیرہ۔پھر انھوں نے اپنی ڈائری دکھائی اس میں ہر ایک لڑکے کے لئے صفحہ تھا اور مشاہدات کے اشارے تھے۔کہنے لگے،مجھے چند مہینے اس کام میں مہارت حاصل کرنے میں لگے۔انٹرویو کرنے سے بھی بہت مدد ملی۔

ان کی جسمانی توانائی اور قوت برداشت کا ایک واقعہ سناتا ہوں ایک روز انھوں نے ہماری سیکنڈ ائیر کلاس کو سوئمنگ پول میں چیلنج کر دیا کہ دیکھیں کون زیادہ لمبائیاں کرتا ہے۔آٹھ۔دس۔پندرہ پھر پہلے طے کیا جو تھکتا جائے وہ باہر نکلتا جائے۔ہم نوجوان لڑکوں نے بڑا زور مارا۔لیکن آخر میں وہی پول میں رہے۔مقصد اس مقابلے کا یہ تھا کہ ہم اپنی قوت برداشت کو بڑھائیں۔اسی طرح چھوٹے بچوں کے

ساتھ پول میں کھیلتے تھے۔ آٹھ آٹھ دس دس انہیں قابو میں کر لیتے پھر وہ سب کو پانی میں غوطہ دیتے۔ اس طرح کھیل کھیل میں بچوں کا پانی کا ڈر نکل جاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ کرنل رفیق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے جونیئرز کیلئے کالج کو اندھے کنوئیں کی بجائے گھر کا آنگن بنا دیا جس میں ماں جاڑوں کی دھوپ میں اپنے بچے کو اپنی گود میں بٹھائے چُوری کھلا رہی ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر لڑکے کو وہ چیز دی جس کی اس کو ضرورت تھی۔ سینئرز کو انسان بنایا، ذمہ داری، اعتماد دیا، قیادت کی صلاحیتوں کو ابھارا اور جونیئرز کو شفقت سے نوازا۔

جرأت کردار کی وہ خصوصیت تھی جو وہ ہر لڑکے میں ابھارنا چاہتے تھے۔ باکسنگ بھی انہوں نے اسی مقصد سے سب لڑکوں کیلئے لازمی کی تھی۔ لیکن باکسنگ کی باقاعدہ مشق بھی کراتے تھے۔ باکسنگ کیلئے جوڑے بڑی احتیاط سے بناتے تھے۔ صرف وزن ہی نہیں، لڑکے کا تجربہ، قد کاٹھ اور مزاج بھی دیکھتے تھے۔ پھر باکسنگ کی ریفرئینگ خود کرتے تھے۔ مقصد ایک کو دوسرے سے پٹوانا نہیں بلکہ اس وسیلہ سے اس کے اندر حوصلہ اور قوت مزاحمت کو بڑھانا اور اعتماد کو تقویت دینا تھا۔ اسکول باکسنگ کے مقاصد پیشہ ورانہ باکسنگ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ میں اس بات کو اس تفصیل سے اس لئے لکھ رہا ہوں تا کہ جو لوگ ان کو پہلے سے نہیں جانتے ان کو بھی اندازہ ہو جائے کہ وہ کس پایہ کے ماہر تعلیم اور ماہر تربیت تھے اور ان کی نظر کن پہلوؤں اور کن جزئیات پر ہوتی تھی۔

اب میں ایک نہایت اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی رائے دوسروں کے بارے میں اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہوتی۔ وہ آدمی بدل جاتا ہے لیکن لوگوں کی کسی پرانے مشاہدہ یا معلومات پر مبنی رائے نہیں بدلتی۔ مثلاً کرنل رفیق کالج میں دو بار آئے، جو وہ ۵۲ء میں تھے وہ ۱۹۵۵ء میں نہیں تھے اور پھر ۱۹۵۵ء کے رفیق میں بھی فرق تھا۔ اور یہ فرق جلال سے جمال کی طرف، سختی سے شفقت، سزا سے درگزر کی طرف سفر کا تھا۔ ۱۹۵۵ء کے دور میں وہ تبدریج زیادہ شفیق ہوتے گئے تھے۔

اب میں ۱۹۵۸ء کے اواخر کا وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے ان کی نئی اپروچ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہوا یہ کہ اسکین ہاؤس کے پیچھے جو کچا بلاک تھا اس میں ہم سینئر کلاسز کے لڑکے رات کو پریپ کر رہے تھے اور چونکہ امتحان قریب تھا اسلئے بلیک بورڈ پر کچھ لکھائی بھی ہو رہی تھی۔ یہ کیا بات تھی کہ بلیک بورڈ کو صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ۲۰۵۳ شربت خان سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ڈسٹر ڈھونڈا تو ڈسٹر نہ ملا۔ اب شربت کو ایک نئی شرارت سوجھی اس نے زعفران کو کندھوں کی طرف سے پکڑا اور ۲۰۸۱ سعید نے پیروں کی طرف سے اور اس کو ڈسٹر بنا کے بورڈ صاف کرنے لگے۔ عجب مضحکہ خیز منظر تھا۔ ساری کلاس کا ہنس ہنس کے برا حال تھا کہ ایک دم کرنل صاحب کی پالتو کتیا لوسی دروازے پر نمودار ہوئی جو اس بات کا سگنل تھا کہ کرنل رفیق آ رہے ہیں چنانچہ دوسرے لمحے وہ سامنے تھے ان کو دیکھتے ہی شربت اور سعید نے زعفران کو ایک دم چھوڑ دیا وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ بیچارے کے کافی چوٹ آئی۔ رنگ میں بھنگ پڑ چکا تھا، پوری کلاس سناٹے میں تھی۔ شرارتیں تو پہلے بھی ہوتی تھیں لیکن اب کے معاملہ ہی اور تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے مجھے اشارہ سے بلایا اور کہا ''سینئر کلاسز کو باہر جمع کرو'' جب سب جمع ہو گئے تو انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں بڑے دکھ سے کہا ''اگر میری چار برس کی کوششوں کا یہی انجام ہے تو میں کل کالج چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ صرف یہ ایک جملہ کہا اور اپنے دفتر کی طرف چلے گئے۔

ہم لوگوں کو فکر ہوئی کہ بات تو بگڑ گئی۔ اب کیا کیا جائے۔ ہمارا ان سے رشتہ باپ بیٹے کا تھا۔ مختصر یہ کہ ہم وفد بنا کر ان کے پاس گئے اور معافی مانگی۔ پھر انہوں نے ایک لمبا لیکچر دیا۔ اسی دوران انہوں نے کہا جب میں یہاں آیا تھا تو میرے بال سیاہ تھے اب سفید ہو رہے ہیں۔ یہ سب تمہارے لئے ہے تمہارے مستقبل کیلئے، پاکستان کیلئے۔ میرا خیال ہے ان کے اس روز کے لیکچر کا جتنا ہم پر اثر ہوا اتنا کسی اور لیکچر کا کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ اپنے دوسرے دور کے آخری دنوں میں انہوں نے جسمانی سزا تقریباً ختم کر دی تھی یا اس

کی ضرورت ختم ہوگئی تھی۔

مختصر یہ کہ کرنل رفیق ہمیں اندھیرے سے اجالے میں لائے۔اس ادارہ کوانہوں نے ایک ضمیراور ایک ذہن دیا۔زندگی کی مثبت قدروں سے آشنا کیااور تعلیم کا جواصل مقصد ہے شخصیت وکردار کی تعمیر وترقی کو ملحوظ رکھا۔

وہ فرشتہ نہیں تھے۔میں ان کی کمزوریوں سے بھی واقف ہوں۔سالانہ تقریبِ انعامات کے ڈنر پر ایک بارانہیں قدرے مخمور دیکھ کرمیں خود رو پڑا تھا۔لیکن ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ بحیثیت مجموعی انہوں نے اپنی زندگی سے دنیا کو کیا دیا۔

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگراس میں پڑتی ہے محنت زیادہ